آج

۶۴

ولاس سارنگ

اسماعیل کادارے

وجے تینڈولکر

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 64

اگست 2009

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 500 روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 5213916 5650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

ولاس سارنگ

7

اِنکی کے دیس میں

(ناول)

❋

اسماعیل کا دارے

229

کور فرمان

(ناولا)

❋

وجے تینڈولکر

259

سکھارام بائنڈر

(کھیل)

Scanned with CamScanner

اس شمارے میں صرف تین تحریریں شامل ہیں۔ مراٹھی ادیب ولاس سارنگ کا ناول، البانیہ سے تعلق رکھنے والے اسماعیل کادارے کا ناولا اور مراٹھی کے ڈراما نگار وجے تینڈولکر کا تین باب کا کھیل۔ اپنی اپنی صنفِ ادب میں کامیاب تخلیقات کا درجہ رکھنے والی یہ تینوں تحریریں، بلاشبہ، الگ الگ ہیئت اور جداجدا ساختیاتی منطق رکھتی ہیں اور ان سے پوری طرح حظ اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں سے ہر تحریر کو اس کی اپنی تخلیقی شرطوں پر پڑھا جائے۔ تاہم، ایک جلد میں اکٹھا کی جانے والی ان تحریروں میں ایک مشترک تصور کو بھی پہچانا جا سکتا ہے جس سے ان کے مطالعے میں ایک نیا رخ شامل ہو سکتا ہے۔

انسان کی آزادی، جو جدید اقدار کی رو سے ایک ناگزیر اور بے بہا چیز ہے، طاقتور کی کمزور پر بالادستی کے ہاتھوں بیشتر حالات میں محدود، مجروح اور ہلاک ہوتی چلی آئی ہے۔ اس شمارے میں شامل تینوں تحریریں اس عمل کی مختلف تصویریں پیش کرتی ہیں۔ جہاں ولاس سارنگ کا ناول مطلق العنان اقتدار کی حامل ریاست کے ہاتھوں ایک انسانی معاشرے میں پیدا ہونے والی گھٹن کو سامنے لاتا ہے، وہاں اسماعیل کادارے کا ناولا ایک ایسی صورت حال کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں یہ مطلق العنان اقتدار ہوشمندی سے قطعی عاری ہو کر ریاست کے باشندوں کے جسموں اور روحوں کو مسخ کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ وجے تینڈولکر کے مشہور اور متنازعہ کھیل میں طاقتور اور کمزور کی یہی مڈبھیڑ مرد کی عورت پر بالادستی کی شکل میں سامنے آتی ہے جس میں آزادی کی امنگ رکھنے والوں کو اپنے انتخاب کی قیمت زندگی سے محروم ہو کر چکانی پڑتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ طاقتور کی کمزور پر، خواص کی عوام پر اور مرد کی عورت پر بالادستی اور مطلق العنان اقتدار کو روایت، مذہب اور معاشرے میں مروج قدیم اور ازکاررفتہ اقدار کی حمایت حاصل رہی ہے اور آج بھی حاصل ہے۔ اس کے برخلاف، ادب، جس کے خمیر میں، بقول میلان کنڈیرا، ہر نظامِ خیال کی بابت تشکیک موجود ہے، ان مریضانہ اور مضر اقدار پر سوال اٹھانے اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی نتائج کو پیش کرنے کے لیے مختلف ہیئتوں اور حکمت عملیوں کو کام میں لاتا ہے۔ یہ تینوں تحریریں ادب کے اس منصب کی نہایت کامیاب اور بامعنی مثالیں ہیں۔

— اجمل کمال

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود
Rs.200

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

شہزادہ احتجاب
(ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

درخت نشین
(ناول)
اتالو کلوینو
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی
Rs.175

خودکشی کے موسم میں
(شاعری)
زاہد امروز
Rs.120

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
زبدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

Scanned with CamScanner

وِلاس سارنگ

اِنکی کے دیس میں

(ناول)

مراٹھی سے ترجمہ:
گوری پٹوردھن
اجمل کمال

ولاس سارنگ (Vilas Sarang) نئے ہندوستانی فکشن کی چند منفرد ترین آوازوں میں سے ایک ہیں۔ وہ مراٹھی اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں آج میں اس سے پہلے بھی شائع ہوئی ہیں۔ شمارہ 6 (سرما 1991) میں ان کی چار کہانیاں اور شمارہ 9 (سرما 1992) میں ایک کہانی شامل تھی۔ اس باران کے ایک مراٹھی ناول کا مکمل ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ ناول مراٹھی زبان میں انکی چیا راجیات کے عنوان سے 1983 میں شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ ولاس سارنگ نے خود کیا جو In the Land of Enki کے عنوان سے 1993 میں شائع ہوا۔ زیرِنظر ترجمہ براہ راست مراٹھی متن سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں انگریزی ترجمے سے بھی مدد لی گئی ہے۔ ترجمے کا یہ عمل ایک غیر معمولی لسانی تجربہ بھی ثابت ہوا۔

ولاس سارنگ 1942 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1969 میں بمبئی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کی۔ ان کی تحقیق کا موضوع ڈبلیو ایچ آڈن کے اسلوب کا مطالعہ تھا۔ ڈاکٹریٹ کی ایک اور ڈگری انھوں نے امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی سے حاصل کی۔ 1970 کی دہائی میں عراق کی بصرہ یونیورسٹی سے متعلق رہے اور 1988 سے بمبئی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے، اور شعبۂ انگریزی کے سربراہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ عراق کے قیام کے دوران اپنے مشاہدات کی بنیاد پر انھوں نے بعد میں کئی کہانیاں لکھیں۔ زیرِنظر ناول بھی اسی تجربے اور تخلیقی عمل کا تسلسل ہے۔

عراق کی قدیم سُمیری اور بابلی تہذیب سے اردو کے جدید پڑھنے والوں کا تعارف سبطِ حسن کی قابل قدر تصنیف ماضی کے مزار (1969) کے ذریعے سے ہوا تھا۔ اس کتاب میں اِنکی کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے: ''اِنکی کے لفظی معنی آقائے ارض کے ہیں۔ اس دیوتا کی شخصیت بہت پیچیدہ ہے۔ وہ بیک وقت خشکی کا دیوتا ہے اور میٹھے پانی کا بھی۔ ... کسی ایک دیوتا میں خشکی اور تری کا امتزاج بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تصور دراصل اس تجربے کا پرتو ہے جو دجلہ اور فرات کے ڈیلٹا میں رہنے والوں کو ہر روز ہوتا ہے۔ وہاں دلدل اور ندی نالے اس کثرت سے ہیں کہ خشکی اور تری میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا لازمی جزو ہیں۔ ... [ایک دعا کی رو سے اِنکی] دیوتاؤں کا بڑا بھائی ہے جو خوش حالی لاتا ہے، جو کائنات کا حساب داں ہے اور ساری دنیا کا دماغ اور کان۔''

ولاس سارنگ نے اپنے اس ناول میں قدیم دیومالا، تاریخ اور جغرافیہ کے پس منظر کو تخلیقی دانائی اور مہارت سے استعمال کرتے ہوئے عراق کے جدید معاشرے کی زندگی کو برصغیر کے ایک جدید باشندے کے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے، اور انسانی آزادی کی امنگ اور مطلق العنان اقتدار سے اس کے تضاد سے متعلق کئی اہم سوالات اٹھائے ہیں۔

Scanned with CamScanner

1

راک فورڈ سے لوٹ کر پرمود بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا۔ اس نے گراؤنڈ فلور پر اپنے میل باکس پر نظر ڈالی۔ نیوز ویک کا شمارہ تھا اور گھر سے آیا ہوا والد کا خط۔ خط کو جوں کا توں جیب میں ٹھونس کر وہ لفٹ میں داخل ہو گیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے سوٹ کیس پلنگ پر پھینکا اور کچھ دیر کے لیے پیر پھیلا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کل کا پورا دن انٹرویو میں صرف ہوا تھا، جس نے اسے دباؤ میں رکھا؛ پھر صبح جہاز پر سوار ہونے کے لیے اسے بہت جلدی اٹھنا پڑا تھا۔ اب سفر پورا ہونے پر تھکن ایک دم اس پر چھا گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے اٹھ کر نہانے کا ارادہ کیا۔ اسے اپنا بدن چپچپا محسوس ہو رہا تھا۔ غسل کیے بغیر دن شروع کرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ صبح نہا کر خود کو پاک کرنے کی عادت اس میں راسخ تھی۔ یہاں امریکہ میں بیشتر لوگوں کی رات کو سونے سے پہلے غسل کرنے کی عادت اسے عجیب لگتی تھی؛ مگر جواین کا ہر رات سونے سے پہلے نہانا اسے پسند تھا۔ بستر میں اس کا بدن تر و تازہ محسوس ہوتا۔

صوفے پر سے اٹھ کر اس نے انگڑائی لی اور سوچا کہ جواین کو فون کرے۔ پھر فیصلہ کیا کہ غسل کر کے آرام سے فون کرے گا۔ کپڑے اتار کر باتھ روم میں شاور کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''میرا خیال تھا تم لوٹ کر مجھے فون کرو گے،'' جواین بولی۔

''ابھی ابھی پہنچا ہوں،'' پرمود نے کہا۔ ''جہاز لیٹ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا نہا کر فون کروں گا۔''

''کیسا رہا انٹرویو؟''

''اچھا ہوا،'' فون کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے کل پورا دن انھوں نے مجھے بزی رکھا۔ صبح ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین سے، اور پھر سارے پروفیسروں سے

تعارف کرایا۔اس کے بعد ایک بوڑھے پروفیسر کے سپرد کر دیا۔وہ ریٹائر ہونے والا ہے۔اُسی کی جگہ خالی ہو رہی ہے۔بوڑھے نے دھیرے دھیرے مجھے پورا کیمپس دکھایا۔لائبریری وغیرہ بھی۔بڑے میاں اچھے آدمی تھے، لیکن مجھے کچھ بوریت ہوئی۔شام کو اس نے دوسرے دو پروفیسروں کے ساتھ ایک اچھے ریستوران میں کھانا کھلایا۔بعد میں آٹھ بجے چیئرمین کے گھر پر پورے ڈپارٹمنٹ سے ملاقات تھی۔وہ میرے تھیسس کے بارے میں، بیک گراونڈ کے بارے میں کافی کچھ پوچھتے رہے۔''

''کالج پسند آیا تمھیں؟اور قصبہ وغیرہ؟''

''خوشحال قصبہ لگتا ہے۔کالج کے پاس کافی پیسہ ہوگا۔تم جانتی ہی ہو، آج کل یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پاس پیسے کی کمی رہتی ہے۔ان میں سے بہت سے تو اپنے خرچ پر انٹرویو کے لیے آنے کو کہتے ہیں۔اور اس چھوٹے سے کالج نے جہاز کا کرایہ دے کر، اچھا بندوبست کر کے مجھے بلایا۔سنا ہے کسی اور دن دو تین اور لوگوں کو بھی بلایا تھا۔قصبے کے دو چار بڑے تاجروں سے کالج کو بڑی رقمیں ملتی ہیں، مجھے اس ریٹائر ہونے والے پروفیسر نے بتایا تھا۔''

''تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی لگتا ہے۔جاب مل رہا ہے؟''

''ویسے تو ملنا مشکل تھا۔اس وقت میری کوالی فکیشن کے بہت لوگ ہیں۔لیکن ڈاکٹر فیلڈمین نے وہاں کے چیئرمین سے میرے لیے سفارش کی ہے، اس لیے!''

''آج کل کی جاب مارکیٹ میں اس کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔صرف کوالی فکیشن پر جاب ملنا دشوار ہے،'' جواین بولی۔''چلو، تمھاری بڑی پریشانی دور ہو جائے گی!سب کچھ ٹھیک راستے پر آ جائے گا...''

پرمود کچھ نہ بولا۔

''کیا بات ہے؟اچھا سا جاب مل ہی گیا سمجھو۔اور تم کچھ خاص پرجوش نہیں لگ رہے۔''

پرمود نے بے یقینی سے ہونکارا بھرا۔

''اچھا، دوپہر کو آ رہے ہو میرے اپارٹمنٹ پر؟'' جواین نے پوچھا۔

''دوپہر کو؟'' پرمود سوچتے ہوئے بولا۔''نہیں، آج دوپہر تو اجیت سے اپائنٹمنٹ ہے۔وہی اجیت جس سے تمھیں پچھلے ہفتے ملوایا تھا۔وہ ابھی گھر سے لوٹا ہے اور اسے ہندوستانی مسالے لینے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ اچھے مسالے وانگ اور ینٹل شاپ میں ملتے ہیں۔ وہ بہت دور ہے اس لیے میں نے اس سے کہا کہ میں گاڑی میں لے جاؤں گا۔ چار بجے اس کے ساتھ جانا ہے۔'' وہ پل بھر رکا، پھر بولا، ''شام کو ذرا دیر سے آؤں گا۔ آٹھ بجے کے قریب۔'' وہ کچھ بولتی، اس سے پہلے کہنے لگا، ''آتے ہوئے توبل رومنز سے پیزا لیتا آؤں گا۔ تمھیں سابجز والا چاہیے نا؟''

پرمود شاور کے نیچے پہنچ گیا اور ضرورت سے زیادہ گرم پانی کھول لیا۔ بدن پر گرم پانی کی سینک اسے اچھی لگی۔ آنکھیں بند کر کے گرم بوچھار چہرے پر لی۔ بدنی آسودگی اور سکھ کا سا احساس ہونے کے باوجود اس کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ ابھی اسے بہت سے الٹے سیدھے خیالوں سے نمٹنا ہے، کئی مشکل فیصلے کرنے ہیں۔

نہانے کے بعد اسے زور کی بھوک لگی۔ فروزن چکن کے دو ٹکڑوں پر پسی ہوئی مرچ چھڑک کر انھیں اوون میں گرم کیا۔ کھانے کے بعد نیوز ویک کی ورق گردانی کی اور آج کے اخبار پر بھی نظر ڈالی۔ خود کو یاد دلایا کہ ٹی وی پر نائن آورز ٹو راما نامی فلم دکھائی جائے گی۔ گاندھی کے قتل پر بنی اس فلم پر ہندوستان میں پابندی تھی اور وہ اسے بہت دن سے دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر آرام کیا۔ پھر اجیت سے ملنے کا وقت ہو گیا۔

ڈار میسٹری کے دروازے کے پاس پرمود نے اجیت کو پک اپ کیا۔

''اچھی گاڑی ہے تمھاری وینگور لیکر،'' اجیت بولا۔ ''کتنے میں لی؟''

اجیت چودھری کو اب تک دوسروں کو خاندانی نام سے بلانے کی ہندوستانی عادت تھی۔ ''مجھے پرمود کہا کرو،'' پرمود نے اس سے کہا۔

''مجھے تو ابھی سال دو سال گاڑی خریدنے کا چانس ملنے کا نہیں،'' اجیت بولا۔ ''اسکالرشپ یا اسسٹنٹ شپ پر آنے والوں کی بات اور ہے۔ وہ تو پیسے جمع کر کے جلد ہی گاڑی خرید سکتے ہیں۔ میرا معاملہ اور ہے۔''

لال بتی پر گاڑی روک کر پرمود نے کار کا ریڈیو چلا دیا۔

''آج کل یہاں جاب مارکیٹ بہت خراب ہے، ہے نا؟'' اجیت نے پوچھا۔

''ہاں، بالکل،'' پرمود نے کہا، ''ٹیچنگ جاب ملنا تو بہت ہی دشوار ہو گیا ہے۔ تمھارا سبجیکٹ کیا ہے، فزکس نا؟ فزکس میں تو حالات اور زیادہ خراب ہیں۔ کتنے ہی پی ایچ ڈی بے روزگار پھر رہے ہیں۔ کوئی بھی جاب کرنے کو تیار۔''

''جب میں امریکہ آیا ہوں تب ہی یہ حالات ہونے تھے۔ سالی اپنی قسمت ہی خراب ہے!'' اجیت بولا۔ ''چار پانچ سال پہلے تو ایسا نہیں تھا نا؟''

''نہیں تھا۔ بغیر کوشش کے نوکریاں مل جاتی تھیں۔ کچھ سبجیکٹس میں تو ٹیچرز کی قلت تھی۔ جاب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کے بجائے یونیورسٹیاں اور کالج خود ان کے پیچھے بھاگتے تھے۔ چھوٹے موٹے کالجوں کو تو نئے پی ایچ ڈیز کو لالچ دے کر اپنی طرف راغب کرنا پڑتا تھا۔''

''واقعی؟ کمال ہے! اور پانچ سال میں اتنا فرق پڑ گیا؟''

گاڑی کے ریڈیو کا اسٹیشن بدلتے ہوئے پرمود نے کہا، ''آج کل جاب کے لیے سینکڑوں جگہ درخواستیں دینی پڑتی ہیں، الاسکا یا نیو میکسیکو تک میں نوکری ملنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''اور امیگرینٹ ویزا بھی آج کل آسانی سے نہیں ملتا، ہے نا؟''

''ہاں۔ جاب مارکیٹ بگڑنے کے بعد حکومت نے اسٹوڈنٹ ویزا پر آنے والوں کو امیگرینٹ درجہ دینا تقریباً بند کر دیا ہے۔ نوکریاں نہیں اس لیے امیگرینٹ ویزا نہیں؛ اور امیگرینٹ ویزا نہیں تو نوکری نہیں مل سکتی — ایسا کچھ حل نہ ہونے والا مسئلہ ہے۔ اپلی کیشن پر انڈین نیشنیلٹی دیکھتے ہی اکثر اسے ایک طرف ڈال دیا جاتا ہے۔ امریکی شہریوں ہی کو نوکریاں نہیں مل رہیں، تو پھر غیر ملکی اسٹوڈنٹس کو وہ کیوں نوکری دینے لگے۔ ان کی بات بھی ٹھیک ہے۔''

''کیا آئندہ دو چار سال میں حالات کچھ بہتر ہوتے دکھائی دیتے ہیں؟'' اجیت نے اس سے پوچھا۔

''مجھے تو ایسے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ اور خراب ہو سکتے ہیں۔''

''یعنی میرے پی ایچ ڈی کرنے تک امکانات بہتر ہونے کی کوئی امید نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے،'' اجیت جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تمھیں بتاؤں پرمود، میں نے یہاں آنے میں بڑا رسک لیا ہے۔ چار سال الٰہ آباد میں نوکری کر کے جو کچھ بچایا تھا وہ سب، اور پھر ایک شناسا سے لیا ہوا

قرض، اس رقم کے بل پر یہاں آیا ہوں۔ یونیورسٹی نے ابھی صرف فیس معاف کی ہے، باقی خرچ میرا ہے۔ اور انڈین روپے میں تو بہت بڑھ جاتا ہے۔ اتنی انویسٹ منٹ کر کے آیا ہوں تو امریکہ میں سیٹل ہونے کے ارادے سے ہی۔ انڈیا واپس جانا پڑا تو وہاں کی تنخواہ سے اتنا قرض کیسے چکاؤں گا۔ کچھ بھی کرنا پڑے، میرے لیے یہاں بسنے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر اجیت نے پوچھا، "تمھارا کام تو لگتا ہے ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ کل پرسوں کہیں انٹرویو کے لیے گئے تھے نا؟"

"ہاں۔ آج صبح ہی لوٹا ہوں۔ ویسے میرے سبجیکٹ میں بھی حالات خراب ہی ہیں، لیکن یہ راک فورڈ کا معاملہ شاید بن جائے۔ میرے تھیسس ایڈوائزر نے ذاتی طور پر میرے لیے کوشش کی ہے، اس لیے۔ اگر آفر ملی تو شاید یہیں سے ملے گی، اور کہیں تو چانس نظر نہیں آتا۔"

"لکی ہو،" اجیت بولا، "جاب مل رہا ہے۔ اور تمھاری گرل فرینڈ بھی ہے، ہے نا؟ کیا نام ہے اس کا... جون..."

"جواین۔"

"ہاں، جواین! مطلب، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ شادی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔"

پرمود ہنسا۔

"ویسے یہاں کی زندگی فرسٹ کلاس ہے،" اجیت بولا۔ "خوشحالی ہے، کچھ دن نوکری کر لو تو گاڑی خرید سکتے ہو۔ فلیٹ مل گیا، یعنی اپارٹمنٹ، تو اس میں وال ٹو وال کارپٹ بھی ہو گا۔ کھانے پینے کی چیزوں کی افراط ہے۔ ارے، ڈارمیٹری کے ڈائننگ ہال میں دودھ کے بیچ بیچ کے نل، پانی کے نلوں جیسے... میں تو دیکھ کے حیران رہ گیا تھا۔ اور صرف سادہ دودھ نہیں، چاکلیٹ ملک بھی! شروع شروع میں تو میں آس پاس بیٹھے لوگوں کو دیکھتا تھا کہ جب چاکلیٹ ملک موجود ہے تو یہ سادہ دودھ کیوں پی رہے ہیں! ہندوستان میں تو دودھ عیاشی ہے۔ ایسے ہندوستان میں کیا رہنا!"

پرمود کچھ نہ بولا۔

"لیکن ایک بات بتاؤ پرمود، کہتے ہیں امریکی لڑکی سے شادی کرنے پر امیگرینٹ ویزا فوراً

Scanned with CamScanner

مل جاتا ہے؟''

''صحیح ہے،'' پرمود نے کہا۔

''اپنے جیسے پردیسیوں سے شادی کرنے پر آسانی سے تیار ہو جاتی ہیں امریکی لڑکیاں؟ تم تجربہ کار ہو، اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں!''

''اگر شادی کرنی ہو تو انتظام ہو ہی جاتا ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ لڑکیاں جب گریجویٹ اسکول میں آتی ہیں تو ان کی عمر خاصی ہو چکی ہوتی ہے۔ خوبصورت اور سیکسی لڑکیاں انڈر گریجویٹ عمر میں شادی کر لیتی ہیں۔ گریجویٹ اسکول میں بہت سی لڑکیاں کسی نہ کسی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ یا تو پرکشش نہیں ہوتیں، یا انھیں کوئی اپنی پسند کا ملا نہیں ہوتا، یا ان کے انڈر گریجویٹ افیئر چل نہیں پاتے، اس لیے۔ گریجویٹ اسکول تک پہنچتے پہنچتے انھیں احساس ہوتا ہے کہ وقت نکلا جا رہا ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تو امکانات اور بھی کم رہ جائیں گے۔ اس لیے وہ بھی شادی کے لیے خاصی بے تاب ہوتی ہیں۔''

''اچھا،'' اجیت بولا۔ پرمود کے اس مختصر تجزیے نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ ''کسی اچھی لڑکی کی تلاش ابھی سے شروع کر دینی چاہیے۔''

اجیت کا دور اندیش، کاروباری انداز دیکھ کر پرمود تحسین سے ہنسنے لگا۔

مسالے خریدنے کے بعد اجیت نے کہا، ''آج اتوار ہے، ڈارمیٹری میں شام کا کھانا نہیں ملے گا۔ میرا خیال تھا آج کینٹکی فرائیڈ چکن میں کھانا کھایا جائے۔ میں آج تک وہاں نہیں گیا ہوں۔ تم مجھے یہاں لائے ہو، اس کے بدلے میں تمھیں وہاں لے چلتا ہوں۔ چلو گے؟''

''دیکھو، اجیت،'' پرمود نے کہا، ''تم یہاں نئے آئے ہو، تمھیں ابھی سیٹل ہونا ہے۔ سینیارٹی کے رشتے سے میں تمھیں دعوت دیتا ہوں۔'' پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا، ''کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ ابھی چلتے ہیں۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

اجیت چودھری کو ڈارمیٹری پر چھوڑ کر پرمود گھر لوٹا تو سوا سات بج رہے تھے۔ ابھی جواین کے گھر جانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ چابی میز پر ڈال کر وہ صوفے میں دھنس گیا۔ اسے اہم باتوں پر

Scanned with CamScanner

سوچ بچار کرتا تھا۔ فیصلوں کو ٹالتے رہنے کی اسے عادت تھی۔ جب فیصلے کو ملتوی کرنا ناممکن ہو جاتا تب ہی اس کا دماغ کام کرنا شروع کرتا تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ راک فورڈ کے انٹرویو کا نتیجہ اب ہفتے بھر میں معلوم ہو جائے گا۔ آفر ملنا تو تقریباً یقینی تھا؛ پھر دو تین دن میں بتانا ہوگا کہ اسے منظور ہے یا نہیں۔ اس لیے اس بارے میں فیصلہ کرنا اب ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ مڈل ایسٹ سے آئی ہوئی آفر کے بارے میں بھی ہفتے بھر میں فیصلہ کرنا تھا۔

لنڈن ٹائمز کے ہائر ایجوکیشن سپلیمنٹ میں اشتہار دیکھ کر پرمود نے چار پانچ ملکوں میں درخواستیں بھیج دی تھیں۔ یہ درست ہے کہ امریکہ میں جاب ملنا مشکل ہو گیا تھا، لیکن آیا وہ یہاں نوکری کرنا اور سیٹل ہونا چاہتا تھا، اس کا اسے یقین نہ تھا۔

جب پرمود امریکہ آیا تھا تو ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکا تھا۔ آج سہ پہر اجیت چودھری سے بات چیت کرتے ہوئے اسے اپنی اُن دنوں کی کیفیت یاد آئی تھی۔ پھر بھی اسے محسوس ہوا کہ اس کے خیالات اجیت کے منصوبوں سے مختلف ہیں۔ اجیت کو خوشحالی درکار تھی، خواہ کسی بھی طریقے سے حاصل ہو۔ بے شک پرمود بھی روپے پیسے سے بے نیاز نہیں تھا، لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اس کے ذہن میں اور بھی کچھ تصورات ہیں۔ یہ تصورات واضح نہیں تھے۔ ان میں خیالات کتنے تھے اور جذبات کا تناسب کیا تھا، یہ بات اسے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہ تھی۔ لیکن ان خیالات کی تہہ میں ایک شدید اکتاہٹ تھی جو اپنے خاندان اور ماں باپ کی متواتر لیس دار توجہ کے باعث گویا کسی غلیظ مادّے کی طرح وہاں جمع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے اردگرد کی ہر چیز سے ناگواری محسوس ہوتی تھی — مذہبیت، اندھ وشواس، ذات پات، فرسودہ رسم و رواج اور ان سب میں لتھڑی ہوئی زندگی۔ جب اسے انٹر کے امتحان میں فرسٹ کلاس ملی تو خود اس کے والد دادر کے سدھی ونایک مندر میں گنیش کی مورتی کے گلے میں ہار ڈالنے کے لیے لے کر گئے تھے۔ کتنی لمبی قطار تھی جس میں احمق لوگ کاغذ میں لپٹے ہار تھامے گھنٹوں کھڑے رہا کرتے! بی اے پاس کرنے پر جب انھوں نے ایک بار پھر مندر جانے کی بات نکالی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ان باتوں پر ناگواری تو اپنی جگہ تھی ہی، لیکن اس سے بھی زیادہ ناقابل برداشت اس کا یہ احساس تھا کہ ہندوستان کی زندگی میں وہ کسی سے کوئی حقیقی تعلق قائم نہیں کر پائے گا۔ اگر ایک دیس میں یہ تعلق قائم کرنا دشوار تھا تو دوسرے کسی دیس میں کیسے ممکن

Scanned with CamScanner

ہوگا، اس بات پر اس نے کچھ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ بہت سے لوگ اسی یقین میں زندگی گزارتے ہیں کہ وہ ایک جگہ جو کچھ حاصل نہیں کر پائے وہ کہیں اور جا کر، کسی دوسری صورت حال میں حاصل کر سکیں گے، اور پرمود کو بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ بیشتر لوگوں کو اپنے اس یقین کی آزمائش کا موقع ہی نہیں مل پاتا؛ جو شاید ایک لحاظ سے اچھی بات ہی ہے۔

بلومنگٹن آنے کے سال ڈیڑھ سال کے اندر اندر پرمود کی ذہنی کیفیت بدلنے لگی۔ دادر میں واقع اپنے فلیٹ کی کھڑکی کی سلاخوں میں سے بھیڑ بھری سڑک پر نگی نا امید نظر سے اس نے جس مختلف زندگی کے خواب دیکھے تھے، وہ ٹھوس شکل اختیار کرتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ امریکیوں کے کھلے ڈلے برتاؤ نے پہلے پہل اس کی حوصلہ افزائی کی، لیکن دھیرے دھیرے اسے معلوم ہو گیا کہ لوگوں سے اس کا تعلق پہلے ہی کی طرح غیر اطمینان بخش ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس زندگی میں اسی کہتا سے شامل ہو جائے گا جیسے نمک پانی میں اتر جاتی ہے، لیکن اس کی توقع پوری نہ ہوئی۔ اس کی وجہ اس کی اپنی اندرونی طبیعت میں تھی یا دوسروں سے وابستہ غیر حقیقی توقعات میں، یہ خیال اس کے ذہن کو چھو کر گزرا۔ لیکن اس خیال کا سامنا کرنے کے بجائے وہ امریکیوں کی بعض چبھنے والی عادتوں کو قصوروار ٹھہرانے لگا۔

اسے محسوس ہوا کہ یوں امریکی کھلے سبھاؤ والے دکھائی دیتے ہیں، لیکن درحقیقت ہر شخص اپنے معاملات میں گم رہتا ہے، کامیاب کریئر، زیادہ سے زیادہ آسائشوں کا حصول، وغیرہ۔ عام سادہ سی باتیں اس کی آنکھوں میں کھٹکنے لگیں۔ ایک بار پکنک پر جاتے ہوئے جواین نے آرٹی چوک کا ایک ڈبا خریدا کیونکہ وہ اسے بہت پسند تھے۔ ڈبا کھول کر آرٹی چوک کھاتے ہوئے اس نے پرمود کو ایک بار بھی ان میں شریک ہونے کی دعوت نہ دی۔ کوئی بڑی بات نہ تھی؛ ایک آدھ ڈالر بچانے کا سوال تھا، پھر بھی اسے جواین کا برتاؤ برا لگا۔ اسی طرح وہ قصہ جو آشوتوش گوہا نے اسے سنایا تھا۔ جن دنوں آشوتوش نیا نیا آیا تھا، ایک دن وہ اپنے ڈارمیٹری کے ایک ساتھی کے کمرے میں گیا۔ اس نے کہا، ''میں نے ایک چھوٹا پیزا منگوایا ہے۔ کیا تمھیں آدھا پیزا چاہیے؟'' جب آشوتوش اپنے حصے کا پیزا کھا چکا تو اس کے ساتھی نے کہا، ''اچھا، اب تمھاری طرف میرے ایک ڈالر پچھتر سینٹ نکلتے ہیں۔'' یہ قصہ سنا کر آشوتوش نے کہا، ''میں حیران رہ گیا۔ پیسوں کی بات نہیں، لیکن ہندوستان میں کوئی ایسا نہیں کرتا۔''

مزے کی بات یہ تھی کہ اس قسم کی باتوں پر ناپسندیدگی محسوس کرتے ہوئے بھی پرمود یہ بات

نہیں بھول سکتا تھا کہ بمبئی میں اسے اس کے قطعی اُلٹ برتاؤ پرنا گواری محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسے کتنے ہی ایسے موقعے یاد تھے جب کالج کے دنوں میں اسے ہوٹلوں میں محض تکلف کے باعث دوسرے لڑکوں کے بل ادا کرنے پڑے تھے اور اسے جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں اسے اصرار کر کر کے کھلانے کے رواج سے بھی کوفت ہوتی تھی جس کے باعث اسے لوگوں کے گھروں سے واپس آ کر تیزابیت دور کرنے کی گولیاں کھانی پڑتی تھیں۔ پھر لوگوں کا کسی کے گھر کبھی بھی جا دھمکنا اور گھنٹوں باتیں کرنا۔ یہاں امریکہ میں فون پر اپائنٹمنٹ لینا تو ضروری ہے ہی، اس کے علاوہ لوگ گھر سے نکلتے ہوئے دوبارہ فون کر کے اطلاع دیتے ہیں کہ پندرہ منٹ میں پہنچیں گے۔ یہ بات پرمود کو مشینی بلکہ ایک اعتبار سے جوش ٹھنڈا کر دینے والی لگتی تھی۔ یہ باتیں بظاہر معمولی تھیں لیکن دھیرے دھیرے اس کے ذہن پر بادلوں کی طرح چھا گئی تھیں۔ ہندوستان میں جس قسم کی زندگی سے وہ اکتا گیا تھا، امریکہ میں اس کی برعکس قسم کی زندگی بھی اسے مطمئن نہ کر پائی تھی۔ اب کیا ہو؟ ہندوستان لوٹ جائے یا کسی نہ کسی یہاں کی زندگی سے نبھانے کی کوشش کرے؟

بمبئی لوٹنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ لیکن یہاں گھر بسانے پر بھی وہ امریکی معاشرے کا حصہ نہیں بن سکے گا، یہ بھی اسے معلوم تھا۔ وہ کئی افریقیوں اور دوسرے ملکوں کے لوگوں کو جانتا تھا جو یہاں مستقل رہ گئے تھے۔ ''ہے مین!'' اور ''ہائے بڈی!'' جیسے الفاظ، اپنے اجنبی تلفظ میں، افراط سے استعمال کر کے وہ اپنے امریکی ساتھیوں کے درمیان گھل مل کر ایک ہو جانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ پرمود کو وہ اُتھلے اور قابل رحم معلوم ہوتے تھے۔ وہ ان کی طرح 'یہاں کا' بننے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

اور اب یہ راک فورڈ والی نوکری۔ وہ مڈویسٹ کے علاقے کا چھوٹا سا صاف ستھرا قصبہ تھا جہاں متوسط طبقے کے امریکی باشندے اپنی پُر آسائش، ست رو اور لگی بندھی زندگی جیتے تھے۔ ان کا زندگی سے کوئی جھگڑا نہیں تھا، بیس بال اور فٹ بال کی باتیں کرنے اور اتوار کے اتوار چرچ جانے والے لوگ تھے۔ وہاں اس کی زندگی جس شکل میں ڈھلتی جانے والی تھی اس کی تصویر پرمود کے ذہن میں ابھی سے بننے لگی۔ اسے خیال آیا کہ کیا اس نے وہ بھوسے جیسی زندگی گزارنے کے لیے یہ ساری تگ و دو کی تھی۔

Scanned with CamScanner

یہی وجہ تھی کہ جب اسے مڈل ایسٹ سے نوکری کی آفر ملی تو اس نے سنجیدگی سے اس پر غور کیا۔ اس میں اسے ایک تیسرا راستہ نظر آیا تھا جسے آزمایا جا سکتا تھا۔ یہ تیسرا راستہ نیا اور اجنبی تھا؛ یہ اسے کہاں لے جائے گا، اس کا وہ فوری طور پر تصور نہ کر سکا۔ لیکن ٹھیک اسی وجہ سے اسے اس کے بارے میں زیادہ تجسس محسوس ہوتا تھا۔

پہلے اس نے تنخواہ کی رقم دیکھی۔ تیل والا ملک تھا اس لیے تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ پھر اس نے اٹلس کھولا۔ دنیا کے بیشتر ملکوں اور شہروں کے محل وقوع کے بارے میں ہمیں محض سرسری اندازہ ہوتا ہے۔ پرمود نے نقشے کا باریکی سے جائزہ لیا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ شہر سمندر کے نزدیک واقع ہے۔ یہ جان کر اسے خوشی ہوئی۔ بلومنگٹن میں رہتے ہوئے اسے چار برس ہو گئے تھے۔ سمندر سے ایک ہزار میل دور۔ اس سے پہلے پوری زندگی بمبئی میں گزار کر آئے پرمود کو سمندر کے پاس رہنے کا امکان دلکش محسوس ہوا۔

نقشے کو دیکھتے ہوئے پرمود کو احساس ہوا کہ یہ وہ علاقہ ہے جسے 'انسانی تہذیب کا گہوارہ' کہا جاتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین معاشرتیں یہیں پھلی پھولی تھیں۔ اسکول کی تاریخ کی درسی کتابوں میں دیکھی ہوئی تصویریں اور ان معاشرتوں کی تفصیلیں اسے دھندلی سی یاد آنے لگیں۔ دریاؤں کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے پُرشکوہ نام: دجلہ، فرات، بابل... اسے اپنا دل اس طرف کھنچتا محسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں غیر واضح، خواب ناک سا تصور جڑ پکڑنے لگا: ایک ان جانے دور دراز مقام پر اس کی زندگی کو ایک ایسا موڑ ملے گا کہ اس کی موجودہ زندگی کی الجھن خود بخود سلجھ جائے گی۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی رہی ہوگی کہ کسی مسئلے سے دور بھاگ جانا بھی اسے حل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

اب جبکہ اسے راک فورڈ کے بارے میں اسے سنجیدگی سے اور فوری طور پر غور کرنا تھا تو اس کے ذہن میں یہ غبار اور بھی زور سے اٹھنے لگا۔ ایک طرف راک فورڈ کی زندگی کی واضح خیالی تصویر تھی، اور دوسری طرف یہ دھندلی، غیر واضح تصویر۔ پرمود بہت دیر تک بیٹھا ان دونوں کو اپنے ذہن میں الٹتا پلٹتا رہا۔ اسی دوران گھڑی پر نظر پڑی تو اسے خیال آیا کہ جواین کے گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ صوفے پر پسرے ہوئے اپنے جسم کو سمیٹ کر وہ اٹھا اور باتھ روم چلا گیا۔ منھ پونچھ کر باہر نکلنے کو تھا کہ اسے کرسی کی پشت پر اپنا کوٹ دکھائی دیا جو راک فورڈ سے واپس آنے کے بعد سے اسی طرح پڑا تھا۔

Scanned with CamScanner

اسے الماری میں ٹانگنے کے خیال سے اٹھایا تو اسے یاد آیا کہ گھر سے آیا ہوا والد کا خط جو اس نے زینہ چڑھتے ہوئے اس نے جیب میں ڈال لیا تھا، اب تک وہیں ہے۔ راک فورڈ کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ اس خط کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے خط نکال کر کھولا۔

پرمود کے والد ہمیشہ ایرو گرام بھیجتے تھے۔ کاغذ کو پورا استعمال کرتے ہوئے وہ اس کا ایک کونا بھی سادہ نہیں چھوڑتے تھے۔ خط کے آخر میں جوں توں دستخط کر کے وہ چند سطریں خط کی پیشانی کے اوپر بھی لکھ دیتے تھے۔ اس بار تو کاغذ گنجان لکھائی سے اتنا بھرا ہوا تھا کہ خط کھولتے ہوئے تھوڑا سا مضمون بھی پھٹ گیا۔ ضائع ہونے والی سطروں کے بارے میں زیادہ فکر کیے بغیر اس نے خط پڑھا:

بہت دن سے تمھارا خط نہیں ملا؛ غالباً تم تھیسس مکمل کرنے میں مصروف ہو گے؛ کام پورا کرتے ہی فوراً اطلاع دینا؛ تمھاری کامیابی پر ہمیں فخر ہے؛ ڈگری پاتے ہی فوراً لوٹ آنا؛ وہاں نوکری کرنے کے جال میں مت پھنس جانا؛ یہاں کے پانچ وہاں کے پانچ سو؛ تمھاری ماں کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی؛ یہاں گوا میں نئی یونیورسٹی بن رہی ہے؛ ٹائمز آف انڈیا میں اس کا اشتہار چھپا تھا، جس کا تراشہ ڈیکر تمھیں بھیج دے گا؛ سنا ہے وہاں غیر برہمن کونکنی باشندوں کو زیادہ موقعے ملیں گے؛ لوٹتی ڈاک سے خط کا جواب دینا...

پرمود نے خط کو تہہ کر کے میز پر ڈال دیا اور چابیاں اٹھالیں۔ دروازے سے باہر نکلتے نکلتے ٹھٹک کر واپس فون کے پاس پہنچا۔ ''پندرہ بیس منٹ میں پہنچتا ہوں،'' اس نے جواین کو بتایا۔

پیلے اور قرمزی پھولوں کے ڈیزائن والا ڈریس پہنے جواین کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرے اسکرٹ یا پینٹ سوٹ پہنتی تھی۔ پرمود نے اسے کبھی بلیو جینز پہنے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جنوبی ریاست لوئیزیانا کی رہنے والی تھی اور جنوب کے پرانے رسم و رواج پر اب بھی قائم تھی؛ سلیقے سے رہنے، اچھا دکھائی دینے کو اہمیت دیتی تھی۔ رنگ اُڑی جینز پہننے والی نسل کی سوچی سمجھی بے نیازی کی نمائش اسے نہیں بھاتی تھی۔ پرمود نے بلومنگٹن پہنچتے ہی بلیو جینز کا کلچر اختیار کر لیا تھا؛ لیکن جواین کی خوش لباسی اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ خود جینز اور ٹی شرٹ پہنے پھرتا تھا لیکن یہی لباس پہننے والی امریکی لڑکیاں اسے غیر شعوری طور پر ناپسند تھیں۔

Scanned with CamScanner

راک فورڈ کے انٹرویو کا حال اس نے ایک بار پھر تفصیل سے بتایا۔

''لیکن اس کے بارے میں تم اتنے بجھے ہوئے انداز میں کیوں بات کر رہے ہو؟''

پرمود چند لمحے کچھ نہ بولا۔ جواین کی استری سے اٹھتے بھپارے کو دیکھتا رہا۔

''مڈل ایسٹ سے آئی ہوئی آفر کے بارے میں سوچ رہا ہوں،'' پرمود نے کہا۔ ''میں نے آٹھ دس دن پہلے تم سے اس کا ذکر کیا تھا نا؟''

''کون سی؟ ایران والی آفر؟''

''ایران نہیں، عراق،'' پرمود نے کہا، ''بصرہ۔''

''اچھا، بصرہ... یعنی سندباد کا شہر؟ میں سمجھتی تھی بصرہ، بغداد جیسی جگہیں صرف قصے کہانیوں میں ہوتی ہیں۔ یا پرانی تاریخ کی کتابوں میں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ جگہیں اب تک موجود ہوں گی۔'' جواین نے استری کی ہوئی پینٹ کو تہہ کیا۔ ''اور وہاں کی یونیورسٹی تک ہے، یہ تو کمال ہو گیا!''

پرمود ہنسنے لگا۔ جب اس نے جواب میں کچھ نہ کہا تو جواین بولی:

''مگر مڈل ایسٹ میں تو جنگیں وغیرہ ہوتی رہتی ہیں نا؟''

''میں نے نقشے میں دیکھ لیا ہے، عراق کی سرحد اسرائیل سے نہیں ملتی، اور بصرہ تو کہیں دور واقع ہے۔''

کچھ دیر دونوں کچھ نہ بولے۔ پھر جواین یکدم استری رکھ کر، کرسی کھینچ پرمود کے سامنے آ بیٹھی۔ ''مجھے بتاؤ پرمود، تم سچ مچ وہاں جانا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ وہ سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر کے پیچھے ایک طرف لیمپ روشن تھا، اس لیے پرمود کو اس کا چہرہ دیکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''دیکھو جواین، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کی وضاحت کیسے کروں،'' پرمود نے کہا، پھر ذرا رک گیا۔ ''مجھے کچھ مختلف چیز درکار ہے؛ زندگی کے بارے میں کوئی نیا پرسپیکٹو...''

اس نے لفظوں کے بجائے اشارے سے اپنی بات سمجھانے کے انداز میں بازوؤں کو حرکت دی اور چپ ہو گیا۔ جواین اب بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس لیے اسے کچھ اور کہنے کی ضرورت

Scanned with CamScanner

محسوس ہوئی۔ ''تم جانتی ہو اس علاقے کو 'انسانی تہذیب کا گہوارہ' کہا جاتا ہے؟ ایسی جگہ جا کر زندگی کے بارے میں کچھ الگ پایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک انوکھا سفر ہوگا، واپس گہوارے کی طرف!''

''ہوں۔ یہ تو ایک طرح کا ریگریشن ہوا۔''

''لیکن یاد رکھو، ریگریشن کو آدمی کی شخصیت کو نئے سرے سے جوان کرنے کا ایک طریقہ بھی سمجھا جاتا ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''اور یہ ذاتی طور پر کوئی ریگریشن نہیں ہوگا۔ ایک قسم کا 'ہسٹاریکل، اینتھروپولوجیکل' ریگریشن کہنا پڑے گا اسے۔ ذرا تصور کرو، انسان کی ابتدا کی تہہ تک جا کر دیکھنا!''

جواین زور سے ہنسی۔ ''تم رومینٹک ہو،'' اس نے کہا۔ ''تم جیسے لوگوں کو ہمیشہ ان جانی، اجنبی جگہیں اپنی طرف کھینچا کرتی ہیں۔ تمھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہاں تم کوئی نئی شے دریافت کرو گے۔''

اس نے اٹھ کر پھر استری ہاتھ میں اٹھالی۔ پھر رک کر اس کی طرف مڑی اور بولی، ''مجھے لگتا ہے کہ تم اپنی فطرت میں سیلانی ہو۔ کہیں جڑیں جمانے والے نہیں ہو۔''

ساڑھے نو بجنے کو ہوئے تو پرمود نے کہا، ''مجھے وہ فلم دیکھنی ہے، نائن آورز ٹو راما۔ این بی سی پر آ رہی ہے۔''

''تم بیٹھ کر دیکھو،'' جواین بولی۔ ''میں بعد میں آتی ہوں۔ مجھے شاور لینا ہے۔ تین دن سے نہائی نہیں ہوں۔''

پرمود نے ایک لیمپ بجھا کر کمرے کو نیم تاریک کر لیا اور تکیے سے پیٹھ ٹکا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب اشتہاروں کا وقفہ ہوا تو وہ اٹھ کر باتھ روم کی طرف گیا۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ شاور کا پردہ پورا کھینچنے سے جواین کا دم گھٹنے لگتا تھا، اس لیے اس نے اسے ادھ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے شاور سے آتی پھوار میں بال پھیلا رکھے تھے۔ بھیگے ہوئے سنہری بال چمک رہے تھے۔ اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگی، ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں باتھ روم میں کوئی اور تو نہیں ہے،'' پرمود نے کہا۔

پرمود کے تصور میں صرف کالے بال سچ مچ کے ہوتے تھے۔ سنہری یا تانبے کے رنگ کے بال اسے نقلی معلوم ہوتے تھے: ایسے بال صرف گڑیوں یا پریوں کے ہوتے تھے۔ جواین کے سرخی مائل سنہری بال اسے ایک عجیب و غریب انوکھی دنیا میں لے جاتے معلوم ہوتے۔

Scanned with CamScanner

ریفریجریٹر کے پاس جا کر پرمود نے سیون اپ کا ایک کین نکالا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اسے جواین میں صرف جسمانی کشش محسوس ہوتی ہے؛ یہ سوچنا بے معنی ہے کہ اسے جواین سے محبت وغیرہ ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ وہ اسے رومینٹک سمجھتی ہے!

ہفتے بھر بعد پرمود ڈاکٹر فیلڈمین سے ملنے ان کے دفتر میں گیا۔ دو سال پہلے جب انھیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا، تب سے ڈاکٹر فیلڈمین کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ علاج اور آرام کرنے کی غرض سے جرمنی کے ایک اسپا میں جاتے تھے۔ اس بار وہ چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے ہی روانہ ہونے والے تھے؛ اس لیے ان سے جلدی مل کر تھیسس کے آخری مراحل کو نمٹانا ضروری تھا۔

پرمود نے ڈاکٹر فیلڈمین کو بتایا کہ راک فورڈ سے آفر ملی ہے لیکن اس نے اس سے معذرت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈاکٹر فیلڈمین نے بھنویں سکیڑ کر کچھ حیرت کا اظہار کیا۔ ''اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے نا؟'' انھوں نے پوچھا۔ ''آج کل کے حالات میں ایسے موقعے گنوانا ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں جتنا سوچ سکتا تھا سوچ لیا ہے،'' پرمود بولا۔ ''ظاہر ہے، مستقبل کو صاف صاف تو دیکھا نہیں جا سکتا۔''

''اور اب ایران جانے کا سوچ رہے ہو، یہی بتایا نا تم نے؟''

''ایران نہیں، عراق۔''

''اچھا...'' ڈاکٹر فیلڈمین نے اپنی نظر پرمود کی کرسی کے پیچھے کتابوں کی قطاروں سے ڈھکی دیوار پر جما دی۔ ''میرا خیال تھا کہ تم میں تحقیق کی عمدہ صلاحیت ہے، تم اس ملک میں رہ کر اچھی ریسرچ کر سکتے ہو۔ یہاں کانفرنسوں میں شرکت کرنے سے دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اب تم جہاں جا رہے ہو وہاں تمھیں اپنی ضرورت کی کتابیں دستیاب ہوں گی؟''

''ریسرچ وغیرہ تو مجھے کرنی ہی ہے،'' پرمود بولا، ''لیکن زندگی میں اور چیزیں بھی ذہن کو ستاتی رہتی ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''آئی انڈرسٹینڈ،'' ڈاکٹر فیلڈمین آہستہ سے سرہلا کر بولے۔ پھر پرمود کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔ ''آئی وِش یو گڈ لک، پرمود۔''

اس کے بعد ایک دن لائبریری کے گراؤنڈ فلور پر پرمود کی ملاقات اجیت چودھری سے ہوئی۔ ''تمھیں راک فورڈ والا جاب مل گیا یا نہیں؟'' اجیت نے پوچھا۔ پرمود نے اسے بتایا کہ آفر ملی تھی لیکن اس نے قبول نہیں کی اور اب عراق جارہا ہے۔

''کیا؟ آفر ٹھکرا دی؟'' اجیت نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ''اور اب کہاں، ایران جارہے ہو؟''

''عراق،'' پرمود نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

پرمود کے بائیں ہاتھ پر ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کی سات آٹھ برس کی لڑکی بیٹھی تھی۔ پرمود کو کھڑکی کے پاس کی سیٹ ملی تھی اور وہ لڑکی کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہتی تھی۔ درحقیقت کھڑکی میں سے کچھ خاص دیکھنے کو نہیں تھا، صرف بادل تھے۔ لیکن لڑکی کی کسمساہٹ جاری رہی، اس لیے پرمود نے اٹھ کر اپنی جگہ اسے دے دی۔ بات کرتے کرتے اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت نیوزی لینڈ کی رہنے والی ہے۔ نسلاً انگریز لیکن مستقل نیوزی لینڈ میں رہتی تھی۔ پندرہ سال بعد انگلینڈ آئی تھی اور اب واپس جارہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بہت سارا سامان خرید کر ساتھ لے جارہی ہے۔

''ایکسس بیگیج کا کافی چارج دینا پڑا ہوگا،'' پرمود نے کہا۔

''اور کیا،'' وہ بولی، ''لیکن مجھے کوئی پروا نہیں۔ پندرہ سال بعد آئی تھی۔ کیا پتا اب پھر پندرہ سال بعد بھی انگلینڈ آنا ہوگا یا نہیں۔''

پرمود کو احساس ہوا کہ اس عورت کے نقطۂ نظر سے یہ ایک جذباتی سفر تھا۔ اتنے عرصے بعد بھی اپنے آبائی وطن آنا ہو یا نہ ہو، اس خیال سے وہ اتنے انگلش کپڑے وغیرہ ساتھ لے جارہی تھی جو عمر بھر کے لیے کافی ہوں۔

پرمود پڑھانے کے لیے عراق جارہا ہے، یہ جاننے پر وہ بولی، ''نیوزی لینڈ کیوں نہیں آتے؟'' اسے ایک صحرائی ملک سے دوسرے، سرسبز ملک جانے کا خیال بڑا پرتجسس محسوس ہوا۔ ظاہر

ہے اس خیال پر سنجیدگی سے غور کرنا بے معنی تھا۔

تھوڑی دیر بعد پرمود کو معلوم ہوا کہ عورت کے بائیں ہاتھ پر بیٹھا شخص بھی بغداد جا رہا ہے اور عراق ہی کا رہنے والا ہے۔ لڑکی بھی اپنی ماں کے برابر میں بیٹھنا چاہتی تھی، اس لیے اس نے ایک بار پھر جگہ بدل لی اور اس عراقی شخص سے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام معروف تھا۔ اس کا انجینئرنگ سے متعلق کوئی کاروبار تھا اور اسی کے سلسلے میں وہ لندن گیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں ہوئیں۔ جب اس نے ملک کے حالات کے بارے میں پوچھا تو پرمود کو احساس ہوا کہ وہ صاف بات کرنے سے کترا رہا ہے۔

معروف نے وِسکی کی کوارٹر بوتل ختم کی اور ایر ہوسٹس سے ایک اور بوتل منگوائی۔ اس نے پرمود کو بھی مدعو کیا۔ پرمود نے انکار کر دیا۔ سوچا، نئے ملک میں جا رہا ہوں، پہنچتے وقت ہوش ٹھکانے رہیں تو اچھا ہے!

''سوشلسٹ حکومت ہے نا آپ کے ہاں؟'' پرمود نے پوچھا۔

''ہاں، کہنے کو سوشلسٹ کہہ سکتے ہیں،'' معروف نے کہا۔ وِسکی کی دوسری بوتل آنے کے بعد وہ کچھ کھل کر بات کرنے لگا تھا۔ پرمود کو احساس ہوا کہ معروف اپنی حکومت کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا۔ بزنس مین ہے، اسے سوشلسٹ حکومت کا ہے کو پسند ہوگی، پرمود نے سوچا۔ ہندوستان کے بہت سے انٹلکچوئل لوگوں کی طرح پرمود بھی تھوڑا بہت بائیں بازو کی طرف مائل تھا۔

''ایک بات یاد رکھیے،'' معروف بولا۔ ''انگلینڈ امریکہ جیسے ملکوں سے باہر نکلتے ہی جمہوریت وغیرہ کو بھول جانا چاہیے۔''

''یہ بات اتنی درست نہیں ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''ہمارے ہندوستان میں تو جمہوریت اب تک چل رہی ہے۔'' عام طور پر پرمود کا انداز اپنے ملک کے لیے تنقید کا ہوتا تھا؛ اب خود کو ہندوستان کی تعریف کرتا ہوا پا کر وہ بہت محظوظ ہوا۔

معروف نے سگریٹ کا نیا ڈبا کھولا اور پرمود کو ایک سگریٹ پیش کیا۔ اب تک وہ پانچ چھ بار ایسا کر چکا تھا اور پرمود ہر بار انکار کرتا رہا تھا۔ ''آپ کو ایک بات بتاتا ہوں،'' معروف نے کہا۔ ''سیاست کے چکر سے دور رہیے گا۔ بغداد یونیورسٹی میں دو نوجوان برٹش لیکچرر تھے؛ انھوں نے

طالب علموں سے سیاست کی باتیں کرنا شروع کردیا۔ بہت جلد انھیں ملک چھوڑ کر جانا پڑا۔"

"مجھے سیاست سے بالکل دلچسپی نہیں ہے،" پرمود نے کہا۔"میں آپ کے ملک کے قدیم تاریخی ورثے کی کھوج میں وہاں جا رہا ہوں۔"

معروف بہت دیر تک بولتا رہا، اپنی کاروباری مشکلوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ پرمود کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سنتا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ وسکی چڑھ جانے کے باعث معروف ضرورت سے زیادہ اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ پرمود کو یہ بات کسی قدر شرمندہ کن لگ رہی تھی۔ بے تعلق سا بیٹھا اپنے سامنے تکتا رہا۔

صبح کوئی ساڑھے تین بجے جہاز بغداد پہنچا۔ آگے اسے کلکتہ، کوالالمپور وغیرہ جانا تھا۔ بہت کم مسافر بغداد اترے۔ پرمود کے پاس کچھ زیادہ سامان نہیں تھا، اس لیے وہ کسٹم سے جلدی فارغ ہو جانے کی توقع کر رہا تھا۔

کسٹم افسر نے پرمود کا پاسپورٹ لیا اور الٹی طرف سے کھولا۔ پھر اسے غیر عربی پاسپورٹ پا کر سیدھی طرف سے کھولا۔ پھر اس کے بیگوں کا جائزہ لیا۔ راستے میں پڑھنے کے لیے پرمود ریڈرز ڈائجسٹ کا جو شمارہ ساتھ لایا تھا وہ اس نے نکال لیا۔"یہ میگزین ہمارے ملک میں لانے کی اجازت نہیں،" کسٹم افسر بولا۔

"آپ رکھ لیجیے،" پرمود نے کہا۔"ویسے بھی میں پڑھ چکا ہوں۔"

پرمود ایک ریڈیو ریکارڈر لایا تھا، کسٹم افسر نے اسے غور سے دیکھا۔ ریڈیو میں اے ایم اور ایف ایم دونوں بینڈ تھے۔ کسٹم افسر بولا،"یہاں ایف ایم استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔"

"کیا؟ ایف ایم استعمال کرنا منع ہے؟ وہ کیوں؟"

"یہاں ایف ایم استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔"

"ٹھیک ہے، مگر کیوں؟"

"اجازت نہیں ہے... دفاعی اسباب سے۔"

"اچھا، مگر مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا،" پرمود نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔"تو کیا آپ ریڈیو ضبط کریں گے؟"

Scanned with CamScanner

''ریڈیو سے ایف ایم بینڈ ناکارہ کر کے ریڈیو آپ کو لوٹا دیا جائے گا۔''

''لیکن اس میں تو وقت لگے گا نا۔ مجھے بغداد میں نہیں ٹھہرنا ہے۔ سیدھا بصرہ جا رہا ہوں۔''

''ہم ریڈیو بصرہ بھیج دیں گے۔ چار دن بعد آپ کو وہاں کے ایرپورٹ سے مل جائے گا۔''

''ذرا احتیاط کیجیے گا۔ کہیں خراب نہ ہو جائے،'' ریڈیو کسٹم افسر کے حوالے کرتے ہوئے پرمود نے مسکین لہجے میں کہا۔

پرمود لاؤنج میں داخل ہوا۔ ایک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے معروف باہر آتا دکھائی دیا۔ شاید خود کو ایک اجنبی ملک میں تنہا پانے کے احساس کے زیر اثر اسے معروف سے خواہ مخواہ دوستی کا سا جذبہ محسوس ہونے لگا۔ وہ معروف کو الوداع کہنے جلدی سے اٹھ کر گیا۔ وہ اسے اپنا نام پتا لکھ کر دینا چاہتا تھا تاکہ اگر اس کا بصرہ آنا ہو تو یونیورسٹی آ کر اس سے مل سکے۔ لیکن معروف اس وقت تک سخت نشے میں آ چکا تھا۔ وہ بہت پینے کے بعد کی اُس کیفیت میں دکھائی دیا جب آدمی اپنے اردگرد کی چیزوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ شاید اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس نے غائب دماغی سے پرمود کو گڈ بائی کہا اور چلا گیا۔

پرمود بیٹھا رہا۔ بصرہ کی فلائٹ صبح سات بجے تھی۔ رات کو ٹھیک نیند نہ ملنے سے اس کی آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ تھکن سی محسوس ہو رہی تھی اور ایک طرح کا خالی پن۔ پھر دھیرے دھیرے ایرپورٹ کے باہر اُجالا پھیلنے لگا۔ ایرپورٹ کے سامنے سڑک کے دوسری طرف پستہ قد درخت صبح کی نرم روشنی میں ہلکے ہلکے چمک رہے تھے۔ سورج کا گولہ کھجور کے پیچھے ٹھیک اس جگہ نمودار ہوا جہاں تنے سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ کھجور کے پھیلے ہوئے پتوں کے پیچھے سے سورج کی کرنیں کالی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک ادھ جاگا خاکروب جھاڑو دیتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو پرمود اٹھ کھڑا ہوا اور سنسان لاؤنج میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔

2

پلنگ سے ذرا اونچائی پر، تکیے کے پاس ایرکنڈیشنر تھا؛ ایک طرف سے اس کا تختہ ذرا ڈھیلا ہو گیا ہوگا، کیونکہ اس میں سے دھیمی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ دوپہر کی خاموشی میں پلنگ پر

Scanned with CamScanner

لیٹے ہوئے پرمود کو نشیلی غنودگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ بصرہ پہنچ کر پرمود بہت خوفناک گرمی کی توقع کر رہا تھا، لیکن در حقیقت گرمی اس کی توقع سے کم تھی۔ گرمیوں کے آخری دن تھے اور سورج کی تپش خاصی گھٹ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے معلوم ہوا کہ اس سال گرمی یوں بھی کم پڑی۔ دوپہر میں سڑکوں پر دھوپ بہت تیز لگتی تھی، اور کمرے میں ایرکنڈیشنر چلائے رکھنا ضروری معلوم ہوتا تھا، لیکن رات کو بغیر ایرکنڈیشنر کے بھی گزارا ہو جاتا تھا۔

یونیورسٹی کوارٹروں میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے پرمود کو مکان ڈھونڈنا پڑا۔ عارضی طور پر اس نے ہوٹل میں کمرہ لیا۔ ہر ایک اس سے یہی کہتا تھا کہ فلیٹ ملنا بہت مشکل ہے۔ شہر اور اس کے مضافات میں صنعتیں بڑھ رہی تھیں؛ غیر ملکی کمپنیوں کے بہت سے لوگ شہر میں تھے اور مزید آ رہے تھے۔ اس تناسب سے تعمیرات نہ ہونے کے باعث مکانوں کی قلت تھی۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ وہ اکیلا ہے، کیوں نہ ہوٹل ہی میں مستقل رہ جائے، فلیٹ کے لیے بلاوجہ دوڑ دھوپ کرنے کی کیا ضرورت، ہوٹل ماہانہ حساب سے سستا پڑے گا۔ لیکن ہوٹل میں مستقل رہنے کا خیال پرمود کو جچا نہیں۔ وہ جلد سے جلد ہوٹل چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اسی خیال اس نے ڈبل روم لے لیا تھا؛ ہوٹل میں سنگل روم نہیں تھے، صرف ڈبل اور ٹرپل روم تھے۔ ہوٹل والے نے کہا کہ اگر وہ چاہے تو دوسرے بستر پر کسی اور کو رکھ لیا جائے، اس طرح اسے آدھا کرایہ دینا پڑے گا۔ پرمود نے تھوڑا سوچنے کے بعد پورا کرایہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا ارادہ ہوٹل میں زیادہ دن رہنے کا نہیں تھا، اس لیے پورے پیسے دینا اسے منظور تھا۔ کسی اجنبی شخص کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا مشکل تھا، اور اگر ہر دو چار دن کے بعد کوئی نیا شخص آتا تو اور بھی خرابی تھی۔ اب، بستر پر لیٹے ہوئے، اسے خیال آیا کہ ہوٹل کا یہ مسئلہ ہر جگہ ایک سا ہوتا ہے۔ ہوٹلوں میں سنگل روم کم رکھے جاتے ہیں کیونکہ ڈبل روم سے زیادہ کرایہ ملتا ہے۔ اس لیے اکیلے شخص کو ہمیشہ دقت پیش آتی ہے۔

داہنے پیر کے انگوٹھے سے بائیں ٹانگ کھجاتے ہوئے پرمود نے بائیں طرف کروٹ لی۔ پلنگ کے داہنی طرف، ایرکنڈیشنر کے نیچے ایک چھوٹی میز رکھی تھی اور اس کے دوسری طرف دوسرا پلنگ تھا۔ پرمود کے پلنگ کے داہنی جانب سبز رنگ کے پردوں سے ڈھکی بند کھڑکی تھی اور اسی رنگ کے پردوں والی ایک اور بند کھڑکی دوسرے پلنگ کے پیچھے تھی۔ پرمود کے پیروں کے پاس بستر کی چادر

Scanned with CamScanner

بغیر تہہ کی ہوئی پڑی تھی جبکہ دوسرے پلنگ کی چادر بے شکن تھی۔ دوسرے پلنگ کو دیکھتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ آئینے میں اپنے سوا اردگرد کی تمام چیزوں کو دیکھ رہا ہو۔ ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر اور سر کو موڑے ہوئے بازو پر رکھ کر وہ دوسرے پلنگ کو یوں غور سے دیکھنے لگا جیسے آئینے میں اپنا عکس تلاش کر رہا ہو۔ اپنے پلنگ کی بے ترتیب چادر اور دوسرے پلنگ کی تہہ کی ہوئی چادر؛ اس وجہ سے توازن خراب ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں پل بھر کو خیال آیا کہ اٹھ کر بلاوجہ دوسرے پلنگ کی چادر بھی بے ترتیب کر دے۔ پھر اس نے سوچا کہ کمرے کی صفائی کرنے والا لڑکا اپنا کام بڑھا ہوا دیکھ کر جھنجھلائے گا۔

نئے ملک کے نئے شہر میں آنے پر اس کے نئے پن اور نئی چیزوں کے اپنی طرف بلانے کے احساس سے خوشی ہونی چاہیے، لیکن بصرہ آئے ہوئے پرمود کو پانچ دن ہو گئے تھے اور اسے متواتر ایک طرح کی پژمردگی اور جھنجھلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ دن بھر کوئی خاص کام نہ ہونے سے اس احساس میں شاید اور اضافہ ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کی ٹرم شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی؛ چنانچہ وہ صبح ڈپارٹمنٹ جا کر کچھ دیر پڑھ کر، بات چیت کر کے وقت گزارتا اور بارہ ایک بجے وہاں سے نکل کر راستے میں کہیں کھانا کھا کر ہوٹل واپس آ جاتا اور لیٹ کر پڑھنے لگتا، ہر روز اس کا یہی معمول تھا۔ اس کے باوجود اب تک کی چار شامیں خالی نہیں گئی تھیں۔ کسی کے گھر جانے یا کسی کے ساتھ شہر کے معروف مقامات کی سیر کرنے میں شام کا وقت کٹ جاتا۔ درحقیقت اس صبح کیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں وہ عقیل نامی شخص سے متعارف ہوا تھا اور اس نے پرمود شام کو کھانے پر باہر چلنے کی دعوت بھی دی تھی، لیکن پرمود نے آج شام کے لیے معذرت کر لی تھی۔ اسے شام کو کوئی کام نہ تھا، بس وہ آج شام اکیلے گزارنا چاہتا تھا؛ شہر میں اکیلے گھومنا چاہتا تھا۔ نئے، اجنبی شہر میں کسی شناسا کے ساتھ گھومنا اور بات ہے اور اکیلے سیر کرنا اور۔ کسی کے ساتھ ہونے سے شہر کا اجنبی پن ذہن پر اتنا اثر نہیں کرتا؛ اس کے برعکس اکیلے گھومنے سے اس کا پوری طرح تجربہ ہوتا ہے۔

لیکن بستر پر لیٹے ہوئے پرمود کو محسوس ہوا کہ تھوڑی دیر اور گزری تو اٹھ کر باہر نکلنا اس کے لیے مشکل ہو گا۔ یہ محض دوپہر کی سستی نہیں تھی؛ یہاں آنے کے دن سے اس پر ایسی بے دلی کیوں طاری ہے، وہ سوچنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ امریکہ میں پہلے چند ہفتوں کے دوران اسے اسی قسم کی کیفیت محسوس

ہوتی رہی تھی اور چھوٹی چھوٹی باتیں اسے 'ہوم سِک' کرتی رہی تھیں۔

وہ 'گھر' سے اکتا کر امریکہ آیا تھا اور امریکہ آتے ہی 'ہوم سک' محسوس کرنے کی کیفیت نے اسے کسی قدر حیرت میں ڈال دیا تھا۔ پہلے پہل اسے خیال ہوا کہ وہ خود سے پوری طرح واقف نہیں ہے اور شاید اس کے ذہن میں کچھ ایسی گرہیں ہیں جو آگے چل کر اس کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوں، لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوتی گئی اور اس نے اس بارے میں فکر کرنا چھوڑ دیا۔ امریکہ سے بصرہ آتے ہوئے پرمود کو خیال آیا تھا کہ اب کے 'ہوم سک' ہونے کا سوال نہیں ہوگا، کیونکہ وہ 'گھر' چھوڑ کر نہیں آ رہا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ اسے بالکل ویسی کیفیت محسوس ہو رہی تھی جیسی پہلے پہل امریکہ پہنچ کر محسوس ہوئی تھی۔ کیا وہ پھر 'ہوم سک' ہو رہا ہے؟ لیکن 'ہوم سک' بھلا کیوں؟ وہ 'گھر' سے تو یہاں نہیں پہنچا تھا۔ ایک پردیس سے دوسرے پردیس آنے پر بھی کیا آدمی 'ہوم سک' ہو جاتا ہے؟ ہونا تو نہیں چاہیے؛ آخر سارے پردیس پردیس ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پورا سچ نہ تھا: ایک پردیس میں کئی سال رہنے کے بعد اس کی عادت پڑ جاتی ہے؛ وہاں سے دوسرے پردیس جا کر پہلے پردیس کے لیے 'ہوم سک' ہونا کوئی ایسی عجیب بات تو نہیں۔ تو میں نے 'ہوم سک نیس' کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا ہے، جیسے کسی ڈوبتے ہوئے شخص کا پیر تالاب کی تہہ میں پڑے گڈھے میں پھسل جائے۔ پردیس جانا ایک بات ہے؛ لیکن ایک پردیس سے دوسرے پردیس جانا بالکل دوسری بات۔ دوری کا سوال حل ہونے کے بجائے اور الجھ گیا تھا۔ لیکن اس وقت اس سوال پر اور غور کرنے کی اسے بالکل خواہش نہ تھی۔ وہ ابھی ابھی تو یہاں پہنچا تھا۔

پھر پرمود کو خیال آیا کہ اس کیفیت میں 'ہوم سک نیس' کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ صرف اجنبی ماحول میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا سامنا کرنے کی ضرورت سے ذہن میں ایک طرح کا چڑچڑاپن پیدا ہو گیا ہوگا۔ نئی جگہ پہنچ کر اپنی زندگی کو نئے سرے سے انھی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر استوار کرنا پڑتا ہے۔ اپنے خیالات، رائیں، طبیعت وغیرہ سب کچھ پہلے جیسا ہی لگ رہا ہو، پھر بھی نئے برانڈ کی ماچس سے سگریٹ سلگانی پڑتی ہے۔ کیرکے گارد کی کتاب کا اپنا نسخہ لے کر ہم دنیا میں کہیں بھی جا سکتے ہیں، لیکن ہمارا ٹوتھ پیسٹ بدل جاتا ہے۔ آج دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہی وہ یہ عراقی ٹوتھ پیسٹ لے کر آیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا: عنبر۔ اس کا ذائقہ کیسا ہوگا، کون جانے۔ کل صبح استعمال کے بعد ہی پتا چلے

Scanned with CamScanner

گا۔ پیلے رنگ کی ٹیوب ہے۔ بمبئی میں تو وہ بنا کا استعمال کرتا تھا، اس کی ٹیوب نیلے رنگ کی تھی۔ پھر امریکہ میں کریسٹ استعمال کرنا شروع کیا جو سرخ اور سفید ٹیوب میں ملتا تھا۔ چیزیں اسی طرح بدل جاتی ہیں۔ معمولی باتیں ہیں، آدمی ان پر غور تک نہیں کرتا، اس کے باوجود نظروں سے اوجھل رہ کر وہ اسے اندر سے بدل سکتی ہیں۔ نئے ملک آنے پر ان سب بدلی ہوئی چیزوں کو نئے سرے سے سیکھنا پڑتا ہے۔ آسمان کی روشنی میں جگمگاتے بادلوں سے زمین پر اترنے کے بعد تو مولود بچہ خود کو خاکی وجود میں پاکر رونے لگتا ہے۔ نئے ملک میں آنا بھی اسی طرح کا تجربہ ہے۔ جانی پہچانی مانوس زندگی اچانک ختم ہو جاتی ہے اور آدمی کو نومولود بچے کی طرح ہاتھ پیر ہلانا سیکھنا پڑتا ہے۔

اس تشبیہ پر غور کرتے کرتے اچانک پرمود کو احساس ہوا کہ وہ پلنگ پر گھٹنے پیٹ کی طرف موڑے یوں لیٹا ہوا ہے جیسے بچہ پیدائش سے پہلے پیٹ میں پڑا ہو۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ پچھلے کئی روز سے وہ اسی طرح لیٹنے کا عادی ہو گیا تھا۔ درحقیقت اس سے پہلے اسے اس حالت میں لیٹنے کی عادت نہیں رہی تھی۔

کچھ دیر بعد پرمود پلنگ سے اٹھا۔ باتھ روم میں جا کر کپڑے بدلے۔ گھنٹی بجا کر لڑکے کو چائے لانے کے لیے کہا۔ شفاف کانچ کی چھوٹی سی پیالی جو بیچ میں کمر کی طرح تنگ تھی، اسی طرح کی شفاف کانچ کی چھوٹی طشتری پر رکھی ہوئی تھی اور دونوں پر سنہری نقاشی تھی۔ بغیر دودھ کی خوب اُبلی ہوئی چائے جس کی تہہ میں بہت سی شکر جمی ہوئی تھی۔ زیادہ مٹھاس سے بچنے کے لیے اس نے پیالی میں شکر ہلائے بغیر چائے پی لی۔ اس کڑک چائے کی اسے اب تک عادت نہیں پڑی تھی۔ ایک بار فلیٹ مل جائے تو اپنی پسند کی چائے بنا سکے گا، اس نے خود سے کہا۔ لیکن تب تک شاید اسے یہی چائے پسند آنے لگے!

پرمود نے ریسپشن ڈیسک پر چابی رکھ دی۔ ڈیسک پر بیٹھا نوجوان پرمود سے لیا ہوا ایک کیسٹ اپنے ٹیپ ریکارڈر پر بجا رہا تھا۔ پرمود کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا، "بہت اچھا ہے۔" جدید امریکی راک میوزک سن کر وہ مست ہو گیا تھا۔ پرمود آتے ہوئے کچھ کیسٹ ساتھ لے آیا تھا؛ اس کا اپنا ریڈیو ریکارڈر جو بغداد ایرپورٹ پر رکھ لیا گیا تھا، اسے اب تک واپس نہیں ملا تھا۔ اسے یاد آیا کہ کل اسے ریکارڈر وصول کرنے بصرہ ایرپورٹ جانا ہے۔ فرانسوا نے اسے اپنی گاڑی میں وہاں لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

پرمود باہر نکلا۔ کچھ دیر سیدھا چلنے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ وہ دو تین دن شہر کے مرکزی علاقے میں گھومتا رہا تھا جو شہر کا پر رونق جدید حصہ تھا۔ آج اکیلے شہر کے کسی اور حصے کی سیر کرنی چاہیے، اس نے سوچا۔ شاپنگ ایریا میں دوبارہ چکر لگانا بے معنی تھا۔ پھر جدید علاقے سارے شہروں کے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ شہر کا پرانا علاقہ جنوب کی طرف واقع تھا، پرمود نے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ شمال سے ایک نہر دریا سے نکل کر پورے شہر سے گزرتی ہوئی جنوب کی سمت جاتی تھی اور اس نہر کے متوازی سیدھی سڑک چلی گئی تھی۔ فرانسوا نے بتایا تھا کہ بصرے کا پرانا شہر خاصے فاصلے پر ہے۔ لیکن پرمود نے ٹیکسی کرنے کے بجائے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ نہر کے ساتھ ساتھ چلنا ٹھیک رہے گا۔ اس کے علاوہ پرمود یہ بھی چاہتا تھا کہ بہت دور تک پیدل چل کر بری طرح تھک کر ہوٹل کے کمرے میں واپس پہنچے، شاید اسی طرح اس بے کیفی کا مداوا ہو سکے۔

گرمیوں کی شامیں کچھ عجیب ہوتی ہیں؛ دن کی گرمی کم ہونے پر ماحول کچھ نرم ہو جاتا ہے۔ ہلکی ہوا چلتی ہے اور اس کی گرد آلود خشکی سے نتھنوں میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ پرمود نہر کے پانی پر نظر ڈالتا چلتا رہا۔ دریا سے نکلنے والی دو تین نہریں شہر میں بہتی تھیں۔ پرمود نے سنا تھا کہ شہر کے نزدیک کھجور کے بڑے بڑے باغ ہیں اور ان میں بہت سی نہریں ہیں۔ کھجور کے پیڑوں کی بات تو ٹھیک ہے، لیکن شہر میں ان نہروں کی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ نہروں کا پانی بھی کالا اور کڑوا معلوم ہوتا تھا۔ چلتے چلتے پرمود کو احساس ہوا کہ یہ نہر دراصل گندے پانی کا بہت بڑا نالہ ہے۔ دونوں طرف واقع بستیوں سے گندے پانی کی نالیاں اس سے آملتی تھیں اور لگتا تھا کہ یہ گندا پانی آہستہ آہستہ دریا میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ اسے یاد آیا کہ ٹورسٹ بیورو کے مہیا کردہ بروشروں میں ان نہروں کی بنا پر بصرہ کو 'مشرق کا وینس' قرار دیا گیا تھا۔ نہر کی ایک دلکش تصویر بھی اس کتابچے میں شامل تھا۔

کھلے میدانوں سے گزرنے کے بعد پرمود کو یقین ہوا کہ وہ پرانے شہر میں پہنچ گیا ہے۔ یہاں کا ماحول کہنہ اور سست رفتار تھا۔ حویلیوں کی طرز کی پرانی وسیع عمارتیں تھیں۔ پرمود بڑی سڑک چھوڑ کر ایک کوچے میں داخل ہوا۔ ایسے بہت سے کوچے عمارتوں کے درمیان سے آڑے ترچھے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں ہاتھ پر بنی عمارتوں کے اونچے لکڑی کے دروازے؛ دروازوں پر قدیم وضع کی

نقاشی۔ مشکل ہی سے کوئی آتا جاتا نظر آ رہا تھا۔ لمحے بھر کو پرمود کو خیال آیا کہ وہ کسی پاگل کی طرح ان کوچوں میں بھٹک رہا ہے۔ عمارتیں دومنزلہ تھیں اور اوپر کی منزل کا سامنے کا حصہ آگے کو نکلا ہوا تھا: یہ حصہ لکڑی کی جالیوں سے ڈھکا ہوا تھا جو بے رنگ اور شکستہ ہو چکی تھیں۔ جالیاں اتنی تنگ تھیں کہ باہر سے ان کے پیچھے کچھ بھی دکھائی نہ دے سکتا تھا، لیکن اندر سے باہر دیکھا جانا ممکن تھا۔ پرمود گردن اونچی کیے ان جالیوں کو دیکھتا ہوا چلتا رہا۔ ان جالیوں کے پیچھے وسیع وعریض، اونچی چھتوں والے تاریک کمرے تھے، جن میں عورتیں زندگی گزارتی ہوں گی۔ پرمود کو محسوس ہونے لگا کہ جالیوں کے پیچھے کی تاریکی میں سے کوئی ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ گلیوں میں بلاوجہ گھومتے پھرنے والے اجنبی شخص پر جمی ہوئی آنکھیں۔

پھر وسیع عمارتوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اینٹوں کے بنے چھوٹے مکان شروع ہو گئے۔ صندوقوں جیسے سپاٹ مکان جن کی دیواروں پر گارے کا پلستر تھا اور ان کی ناہموار سطح کسی بوڑھے جانور کی جھریوں پڑی کھال کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ شام کا وقت تھا، عورتیں بچوں کو گود میں لیے ان مکانوں کے دروازوں میں بیٹھی تھیں۔ کالی چادریں اوڑھے یہ عورتیں شور مچاتے بچوں کو سنبھال رہی تھیں۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں مکانوں کی گہرے رنگ کی دیواریں مٹیالی دکھائی دے رہی تھیں۔ خشک گارے کے ٹھوس پن نے ایک دھندلا غیر حقیقی تاثر اختیار کر لیا تھا۔ اندھیرے پڑتے مٹیالے مکانوں کے قدموں میں بیٹھی کالی چادروں والی عورتیں — اور وہ ان کے درمیان گھوم رہا ہے، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس وقت۔ وہ اس شہر میں کتنا عرصہ رہے گا؟ ایک سال؟ دو سال؟ زندگی بھر کیوں نہیں؟ ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ آدمی دنیا کے کسی بھی دور دراز کونے میں جا کر برسوں رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی جواز کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس، اگر اس قسم کی زندگی سے باہر نکلنے کا کوئی جواز ہاتھ نہ آ سکے، تب؟ یہ بے چین کر دینے والا خیال تھا۔ پرمود ایک دم مڑا اور تیز قدموں سے چلنے لگا۔ لیکن آڑے ترچھے گلی کوچوں میں بھٹکتے رہنے کے بعد اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ اندازے سے تیز تیز چلتا رہا۔ چھاتے ہوئے اندھیرے کو عورتوں اور بچوں کی آوازیں کھرچ رہی تھیں۔ تیزی سے چلتے ہوئے پرمود سے ایک چار پانچ سال کا دوڑتا ہوا لڑکا ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ دروازے میں بیٹھی اس لڑکے کی ماں باریک آواز میں چلائی: "تعال، تعال!" پرمود نے پل بھر کو رک

کر اس کی طرف دیکھا۔ بدن پر لپٹی چادر میں سے صرف اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا؛ گورا رنگ، تیکھے نقوش اور حسین۔ پرمود کچھ دیر کو اسے تکتا رہ گیا۔ وہ بھی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ وہ پردیسی ہے۔ شاید اسی لیے وہ اتنی بے باکی اور تجسس سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا بچہ تھا۔ پرمود کی طرف دیکھتے ہوئے وہ، گویا اسی کو مخاطب کرتے ہوئے، ایک بار پھر چلائی: ''تعال!'' لڑکا اس کی طرف دوڑ پڑا۔ پرمود 'تعال' کا مطلب نہیں جانتا تھا، لیکن اس نے خیال کیا کہ یہ 'آؤ' کا ہم معنی لفظ ہوگا۔ وہ آگے چل دیا۔ اس کے قدم پھر تیز ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اچانک بڑی سڑک پر آ نکلا۔ کاروں کی چمکتی ہوئی روشنیاں دیکھ کر اسے سکون ہوا۔

دوبارہ نہر کے ساتھ ساتھ چلتا دریا تک جا پہنچا۔ اب تک پورا اندھیرا ہو چکا تھا۔ پرمود دریا کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں دریا پر جہازوں کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے عکس پانی میں ہچکولے کھا رہے تھے۔

پرمود کو یاد آیا کہ وہ سمندر پر جانا چاہتا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ شہر سمندر کے پاس واقع ہے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے؛ نقشے نے اسے دھوکا دیا تھا! سمندر شہر کے داہنی طرف کہیں دور واقع تھا۔ دریا کے داہنی سمت بہتے پانی کو دیکھتے ہوئے پرمود سوچنے لگا کہ سمندر وہاں سے کتنی دور ہوگا۔ اسے خیال آیا کہ اسے ایک آدھ دن میں وقت نکال کر سمندر کے پاس جانا چاہیے۔ جمعے کو چھٹی کے دن جائے تو وہاں کافی وقت گزار سکے گا۔ ریت پر جی بھر کر گھوم سکے گا۔ وہ اپنے ذہن میں ساحل کی تصویر بنانے لگا۔ پھر اسے خود پر ہنسی آنے لگی۔ اسے سمندر کے پاس جانے کی ایسی طلب کیوں ہو رہی تھی؟ شام کی سیر کی تھکن نے اس کی بے دلی دور کر دی تھی۔ تو اب کیا وہ سینٹی مینٹل ہونے لگا تھا؟

دریا کے کنارے پر واقع ایک ریستوران میں کھانا کھانے کے بعد پرمود کو اور زیادہ تھکن محسوس ہونے لگی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ہوٹل واپس پہنچا۔ کپڑے بدل کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند کے آتے آتے اس کے آنکھوں کے سامنے لکڑی کی جالیوں والا بالاخانہ آ گیا۔ ان جالیوں کے پیچھے تاریکی میں سے کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی جگہ کالی چادر میں لپٹے، تیکھے نقوش والے حسین چہرے نے لے لی، اور اسے پکارنے کی آواز سنائی دی: ''تعال!''

Scanned with CamScanner

فرانسوا کی رینوایل فور چھوٹی گاڑی تھی لیکن خاصی کارآمد۔ ''ان سڑکوں کے لیے ایسی گاڑی ہی ٹھیک ہے،'' فرانسوا نے کہا۔ اسے منھ میں سگریٹ اٹکائے رکھنے کی عادت تھی، اس وقت بھی جب وہ بول رہا ہوتا۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کا اسے خیال ہی نہ آتا تھا۔ سگریٹ اس کے وجود کا ایک حصہ بن چکا تھا اور اسے اب اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ جب وہ بولتا تو منھ میں اٹکا ہوا سگریٹ اوپر نیچے ہوتا رہتا اور پرمود کو لگتا اس کی راکھ کسی بھی لمحے اس کے کپڑوں پر گر پڑے گی۔ لیکن وہ یہ سوچ کر چپ رہا کہ پتا نہیں اس سے راکھ جھاڑنے کے لیے کہنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ آخر باتیں کرتے کرتے راکھ کی بڑی سی بتی نیچے گر ہی پڑی۔ پھر فرانسوا نے سگریٹ منھ سے نکال کر ایش ٹرے میں جھٹکا اور اسے منھ میں اٹکا کر دوبارہ باتیں کرنے لگا۔ اسے اپنی پینٹ پر بکھری ہوئی راکھ کا دھیان نہیں آیا۔ اس کی اس غائب دماغی اور بے احتیاطی سے پرمود محظوظ ہوا۔ راکھ کے خود بخود گر جانے کے بعد سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھٹکنا پاگل پن ہی ہے۔ اس کے سگریٹ پر راکھ ایک بار پھر بڑھنے لگی، اور اسی واقعے کے دوبارہ پیش آنے کا تصور کر کے پرمود کھڑکی سے باہر تکنے لگا۔

پرمود کے ڈپارٹمنٹ میں باقی سب لوگ عراقی تھے۔ جرمن سکھانے کے لیے ہائنرش ہوفر نامی شخص مشرقی جرمنی سے آیا تھا۔ وہ منھ پھیلا کر مسکراتا، گڈ مارننگ کہتا، لیکن زیادہ بات نہ کرتا تھا۔ اپنی میز پر بیٹھا ہر وقت کچھ لکھنے میں منہمک رہتا۔ وہ شاید زبان سکھانے کی کسی کتاب پر کام کر رہا تھا۔ فرانسیسی کے استاد فرانسوا دیدیے کے ساتھ پرمود کی اچھی جان پہچان ہوگئی۔ وہ پستہ قد، فربہ لیکن صحت مند، گٹھیلی کھچڑی مونچھوں والا باتونی شخص تھا۔ میز پر زیادہ دیر بیٹھنا اسے مشکل لگتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کاغذوں کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد وہ ''ویل، ویل'' پکارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا اور سگریٹ ہونٹوں کے درمیان اٹکا کر ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے اِدھر سے اُدھر چکر کاٹنے لگتا اور کبھی کسی کی، کبھی کسی اور کی میز پر پڑی ایش ٹرے میں سگریٹ جھٹکتا رہتا۔ وہ اچھی خاصی عربی جانتا تھا لیکن اس نے عربی لبنان میں سیکھی تھی۔ فرانسیسی باشندے کی زبان سے لبنانی عربی عراقیوں کو بڑی دلچسپ معلوم ہوتی۔ وہ اس کے بولنے کے انداز کا خوب مذاق اڑاتے۔ پرمود کے ڈپارٹمنٹ میں آنے پر فرانسوا کو شاید خوشی ہوئی تھی۔ ''یہ اچھا ہوا۔ تم سے باتیں کر کے میری انگریزی بہتر ہو جائے گی،'' اس نے کہا۔

Scanned with CamScanner

فرانسوا اب گاڑی کو ایرپورٹ جانے والی سڑک پر لے آیا۔ یہ سڑک چوڑی اور کئی لینوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد سڑک کی بائیں طرف فاصلے پر ایک اونچی عمارت دکھائی دی جو کونے میں کھڑی ماچس کی ڈبیا جیسی لگ رہی تھی۔ اس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ اڑتے دکھائی دیے۔ پرمود گردن گھما کر اسے دیکھتا رہا۔ ''یہ سائیلو ہے،'' فرانسوا بولا۔ پھر سڑک دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ دریا نظر نہیں آتا تھا لیکن اس میں کھڑے جہازوں کے اوپری حصے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی مختلف زاویوں پر اٹھی ہوئی کرینیں دریا کنارے کی عمارتوں کے اوپر آسمان پر انگلیوں کی طرح اٹھی ہوئی لگتی تھیں۔ یہ بندرگاہ کا علاقہ تھا۔

''تم یہاں کب سے ہو؟'' پرمود نے پوچھا۔

''پچھلے سال آیا تھا۔ میرا دوسرا سال ہے،'' فرانسوا بولا۔

''اور اس سے پہلے؟''

''بیروت میں تھا۔ وہاں میں نے گیارہ سال نوکری کی۔ میں فرانسیسی حکومت کا ملازم ہوں۔ ڈھائی سال پہلے بیروت میں جنگ شروع ہو گئی اور میں جس انسٹیٹیوٹ میں پڑھا رہا تھا وہ بند ہو گیا۔ تب فرانسیسی حکومت نے مجھے یہاں بھیج دیا۔''

''تمھاری فیملی یہاں ہے یا فرانس میں؟'' فرانسوا کوئی پینتالیس برس کا دکھائی دیتا تھا، اس لیے پرمود نے فرض کر لیا تھا کہ اس کے بیوی بچے تو ہوں گے ہی۔

''بیروت میں۔ جنگ شروع ہونے سے ذرا پہلے ہی میں نے شادی کی تھی۔''

''بیروت میں؟'' پرمود بولا۔ ایک فرانسیسی شخص کی بیوی ایسے حالات میں بیروت میں رہ رہی ہے، یہ حیرت کی بات تھی۔ پرمود کے سوال کا رخ بھانپ کر فرانسوا نے کہا، ''میری بیوی لبنانی ہے۔''

''گویا تم لبنان میں بس گئے تھے؟ تمھیں وہ ملک اتنا اچھا لگا؟'' پرمود نے پوچھا۔

''ویل، میری ماں لبنان کی تھی۔ میری پیدائش بھی وہیں ہوئی۔''

''تو تمھارا بچپن بھی وہیں گزرا ہوگا؟''

''اسکول کے سال وہاں گزرے۔ پھر کالج کے لیے میں فرانس چلا گیا۔''

''پھر تو ایک طرح سے تم لبنانی ہی ہوے۔''

Scanned with CamScanner

فرانسوا گاڑی کے اسٹیرنگ وہیل سے دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''آئم فرنچ!''

کچھ دیر پرمود کچھ نہ بولا۔ پھر پوچھا، ''بیروت میں تو جنگ اب بھی جاری ہے، ہے نا؟ کیا بیوی کو یہاں لانا ٹھیک نہیں رہے گا؟''

''وہ آنے کو راضی نہیں ہے،'' فرانسوا نے کہا، ایک منٹ چپ رہا، پھر بولا، ''سچ کہوں، چاہے بیروت کی سڑکوں پر جنگ ہو رہی ہو، تب بھی میں وہیں رہنا پسند کروں گا۔''

پرمود اس کی بات پر کچھ دیر غور کرتا رہا۔ ''جنگ شروع ہونے سے پہلے بیروت بہت خوبصورت شہر رہا ہوگا، ہے نا؟''

یہ کوئی سوال ہوا! فرانسوا نے منھ بنا کر اپنا داہنا ہاتھ اسٹیرنگ وہیل سے اٹھا کر لہرایا۔ ''جنگ سے پہلے — اور ہمیشہ!''

''لیکن اب تو لگتا ہے بیروت کا خاتمہ ہو گیا،'' پرمود بولا۔ ''ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ پھر سے ٹھیک ہو پائے گا۔''

فرانسوا کے چہرے پر ابھرنے والے تاثر سے اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ میں کسی اجنبی کی سی علیحدگی یا عدم جذباتیت سے اس مسئلے کو دیکھ رہا ہوں، لیکن اس شخص کے جذبات اس سے وابستہ ہیں۔

''ارے نہیں!'' فرانسوا نے کہا۔ ''اصل میں اب وہاں کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ بس ان شامی فوجیوں نے آج کل کچھ مشکل پیدا کر رکھی ہے، ورنہ بیروت اب تقریباً پہلے جیسا ہی ہو گیا ہے۔''

یہ صرف اس کی خوش گمانی ہے، پرمود کے ذہن میں یہ خیال آیا، لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ سوچتے سوچتے اسے محسوس ہوا کہ فرانسوا کو یہاں مجبوراً آنا پڑا ہے۔ اسے تو بن باس جیسا لگ رہا ہوگا۔ بیروت میں اس کی زندگی خوشگوار رہی ہوگی۔ بیروت جیسا رنگین، مسرت بھرا شہر! آدھا لبنانی ہے، اسے تو وہ گھر جیسا ہی محسوس ہوتا ہوگا؛ پھر فرانسیسی ہونے سے 'کولونیل' احساس بھی حاصل ہوتا ہوگا۔ اور اس کی یہ مسرور زندگی جنگ کے ہاتھوں برباد ہو گئی۔ اب یہاں وہ اسی امید میں رہ رہا تھا کہ بیروت میں پھر امن ہوگا اور اس کی زندگی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑ سکے گا۔ اسے اس کی گمشدہ زندگی کب واپس ملے گی؟ ابھی پرمود اسی سوچ میں تھا کہ فرانسوا نے ایرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی

Scanned with CamScanner

کردی۔ ''میرا ریڈیو ریکارڈر آ گیا ہو تو اچھا ہے،'' پرمود نے کہا، ''ورنہ ہمارا یہ چکر بیکار جائے گا اور تمھیں ایک بار پھر تکلیف دینی پڑے گی۔''

ریڈیو ریکارڈر مل گیا۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد پرمود نے ریڈیو چلا کر دیکھا۔ لگتا تھا ایف ایم بینڈ بلاک کرنے کی کوشش میں کسٹم والوں نے ریڈیو خراب کر دیا ہے۔ آواز ٹھیک نہیں آ رہی تھی، کھڑکھڑاہٹ بہت تھی۔

شہر میں اسٹیٹ ٹریڈنگ کمپنی کا ایک بڑا اسٹور تھا۔ ریفریجریٹر، ایر کنڈیشنر، ٹی وی وغیرہ جیسی بجلی کی چیزوں کا۔ وہاں ایک بار اس کی مڈبھیڑ ایسٹ جرمن ہوفر سے ہوگئی۔ پرمود نے اس سے ٹی وی کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کیں۔ پھر کہا، ''یہاں قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔'' ہوفر نے ''ہاں'' کہہ کر گردن ہلا دی۔

''دراصل حکومت کی ان چیزوں کو درآمد کر کے بیچنے پر اجارہ داری ہے، لیکن اس پر بہت منافع لیتی ہے۔ یہ کیسا سوشلزم ہوا!''

عوامی مقام پر ہونے والی گفتگو کو سیاسی رخ لیتا دیکھ کر ہوفر زور زور سے ہنسا اور فوراً ہجوم میں غائب ہو گیا۔

پرمود نے سنا تھا کہ شہر میں ایک 'انڈین کلب' ہے۔ انھی سڑکوں پر روز گھوم گھوم کر اسے اکتاہٹ ہونے لگی تھی سو اس نے ایک دن وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ دو چار لوگوں سے جان پہچان ہو جائے گی تو شاید فلیٹ ملنے میں کچھ آسانی ہو۔ کلب کی عمارت دریا کے کنارے والی سڑک پر تھی۔ پرانی، بڑی سی دو منزلہ عمارت۔ بغیر روشنی کا اندھیرا زینہ چڑھ کر پرمود اوپر پہنچا۔ بائیں طرف ایک دروازہ دکھائی دیا تو اس کے اندر چلا گیا۔ لمبے ہال میں ایک بڑی سی میز کے دونوں طرف کئی لوگ اخبار پڑھنے میں منہمک تھے۔ پرمود کے اندر آتے ہی سب نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ نیا آدمی ہے، یہ دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں تجسس ابھر آیا۔ ہندوستان میں کہاں سے؟ کس کام سے؟ کس ڈپارٹمنٹ میں؟ یوپی والا، مدراسی یا کیرالہ کا؟ ایسے سوال پرمود ان

کے چہروں پر پڑھ سکتا تھا۔ لیکن سینئر ہونے کے لحاظ سے وہ گفتگو خود شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ نئے آنے والے کو خود اپنا تعارف کرانا تھا۔ ان کے چہرے دوبارہ اخباروں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ پرمود نے ٹائمز آف انڈیا کے دس پندرہ دن پرانے ایک دو شماروں کو بغیر دلچسپی کے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں کلب کے سیکرٹری نے پرمود کو آ پکڑا۔ ممبر شپ وغیرہ کے بارے میں بتایا۔

''بہت پرانا کلب معلوم ہوتا ہے،'' پرمود نے کہا۔

''بالکل!'' رام کرشن بولا۔ ''پچھلے پچاس ساٹھ سال سے قائم ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں سبھاش چندر بوس جرمنی جاتے ہوئے یہاں آئے تھے۔'' اس وقت سو کے لگ بھگ ممبر ہیں، اس نے بتایا۔ ''ہندوستان کے تقریباً ہر علاقے کے لوگ ہیں یہاں،'' وہ بولا۔ ''گجراتی زیادہ نہیں ہیں۔ یہاں لیکچرروں اور ٹیکنیکل نالج والوں، انجینئروں وغیرہ کی مانگ زیادہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں گجراتی اس میدان میں زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ پھر اس سوشلسٹ ملک میں بیوپار کا کچھ خاص اسکوپ بھی نہیں ہے۔''

''مراٹھی لوگ کافی ہیں؟'' پرمود نے پوچھا۔

''دو چار ہی ہیں،'' رام کرشن بولا۔

یہ مراٹھی مزاج کی وجہ سے ہوگا، پرمود نے سوچا۔

''آپ کا ریڈنگ روم کافی پاپولر معلوم ہوتا ہے،'' اس نے کہا۔

''کلب کی بڑی کشش اسی کی وجہ سے تو ہے،'' رام کرشن نے وضاحت کی۔ ''یہاں سنسر شپ کی وجہ سے ذاتی طور پر منگوائے جانے والے اخبار رسالے کٹی پھٹی حالت میں پہنچتے ہیں، کبھی ملتے ہی نہیں، کبھی بہت دیر سے ملتے ہیں۔ لیکن یہاں انڈین کونسلیٹ کے ڈپلومیٹک بیگ میں ایر میل سے اخبار آتے ہیں، اور کونسلیٹ کلب کو دے دیتا ہے۔ لوگ اس لیے آتے ہیں کہ یہاں سالم حالت میں اور نسبتاً تازہ اخبار پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔''

اس کے بعد کچھ دن پرمود کم و بیش ہر روز شام کے وقت انڈین کلب جاتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسے معلوم ہوا کہ یہاں جمع ہونے والے لوگوں کے درمیان گفتگو کا اصل موضوع یہ ہے کہ ہندوستان پیسے

Scanned with CamScanner

کس شکل میں بھیجے جائیں: پاؤنڈ یا ڈالر۔ آج پاؤنڈ کا ریٹ کیا ہے، ڈالر کا کیا ہے، پاؤنڈ اوپر جا رہا ہے یا نیچے، ڈالر اوپر جا رہا ہے یا نیچے، اسی پر ان کے درمیان بحث چلتی رہتی۔ پرمود کو اس سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ کلب میں بیئر ملتی تھی؛ لیکن زیادہ تر لوگ بال بچوں والے تھے (ساری عورتیں ایک بڑی میز پر اکٹھی بیٹھتیں، بچے راہداریوں میں چیختے چلاتے رہتے)۔ بیئر زیادہ لوگ نہیں پیتے تھے۔ پرمود کو احساس ہوا کہ روز بیئر کا گلاس لے کر بیٹھنے سے وہ لوگوں کی نگاہوں میں آ گیا ہے۔ بعض لوگ اس سے جلتے بھی ہوں گے: یہ چھڑا بیٹھا بیئر اڑا رہا ہے اور بیوی ساتھ ہونے کی وجہ سے ہم محروم ہیں!

کلب میں نئے سیکرٹری وغیرہ کا چناؤ ہونا تھا۔ اس کے لیے امیدوار کھڑے کیے جا رہے تھے۔ شرما نامی شخص نے پرمود نے فلیٹ کے بارے میں کہہ رکھا تھا۔ ایک دن شرما ایک اور آدمی کو ساتھ لے کر اس کی میز پر آیا اور بولا، ''یہ ہیں ہمارے ڈاکٹر ورما۔ سیکرٹری کے عہدے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ ووٹ انھی کو دینا ہے۔ بہت ایماندار آدمی ہیں۔''

''اچھا؟ بہت خوب!'' پرمود نے کہا۔ اس نے شرما کو فلیٹ کے بارے میں ایک بار پھر یاددہانی کرائی۔

''ارے ہاں، فلیٹ نا!'' شرما نے کہا۔ ''میں بھولا نہیں ہوں۔ ہفتے بھر میں شاید کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مگر ڈاکٹر ورما کو دھیان میں رکھنا۔''

پھر پرمود کو معلوم ہوا کہ چناؤ میں شمالی ہند اور جنوبی ہند کی دھڑے بندی ہے۔ بالکل ہندوستان بنا لیا ہے یہاں، پرمود نے خود سے کہا۔ ان سب جھگڑوں سے دور ہی رہنا بھلا۔

کلب میں پرمود کی ملاقات چٹنس نامی شخص سے ہوئی۔ ''ارے واہ! آپ بھی بمبئی کے ہیں،'' وغیرہ کے تبادلے کے بعد چٹنس نے پوچھا، ''تھانے میں جو وینگورلیکر وکیل ہیں، وہ آپ کے کون لگتے ہیں؟''

مراٹھی لوگ جس قسم کے سوال پوچھے بغیر رہ نہیں سکتے، ویسا ہی سوال چٹنس سے سنا تو پرمود کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا، ''نام بے شک ایک ہی ہے، تو کچھ نہ کچھ رشتہ تو ضرور ہوگا۔ کچھ ریسرچ کر کے پتا چلانا ہوگا۔'' پھر بولا، ''پرسوں ریڈیو پر خبر سنی کہ قطب شمالی پر چٹنس نام کے کوئی صاحب مردہ پائے گئے۔ وہ آپ کے کچھ لگتے ہیں کیا؟''

Scanned with CamScanner

پرموداس کا مذاق اڑا رہا ہے، اس کا احساس ہوتے ہی چنٹس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ دو چار اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ کسی اور طرف کھسک گیا۔ اس کے بعد کلب میں کبھی آمنا سامنا ہوتا تو روکھے پن سے "کیا حال ہے؟" کہتا اور بس۔ پرمود کو لگا کہ اگر اس نے ایسی بات نہ کی ہوتی تو یہ شخص کبھی نہ کبھی کھانے پر گھر بلاتا؛ گھر کا پکا مراٹھی کھانا کھانے کو مل جاتا۔

حمید قریشی نام کے علی گڑھ کے رہنے والے سے پرمود کی ملاقات ہوئی۔ وہ بھی بصرہ میں تازہ وارد تھا۔ کم عمر اور دبنگ آواز والے حمید کی بے ترتیب بڑھی ہوئی گھنی داڑھی کو معلوم ہوتا تھا استرے نے کبھی نہ چھوا تھا۔ شدید طور سے یکسو لوگوں کی طرح اس کی کاٹھی دبلی تھی اور آنکھیں آبدار۔ اس کا سبھاؤ مغرورانہ نہیں تھا لیکن اس کے بولنے کے انداز سے ایسا تاثر ملتا تھا۔ پرمود نے دیکھا کہ کلب میں اس کی کسی سے زیادہ بنتی نہیں۔ معلوم ہوتا تھا اسے اپنے مسلمان ہونے کا بہت گہرا احساس ہے جس کے باعث وہ کسی سے زیادہ کھل کر نہیں ملتا۔ شاید وہ کلب میں آنا ٹال جاتا، لیکن ہندوستان سے حال ہی میں آنے کی وجہ سے اسے وہاں کے اخبار پڑھنے کی خواہش ہوتی تھی؛ یہ بھی کشش تھی کہ یہاں پکوڑے، سموسے وغیرہ کھانے کو ملتے تھے۔

پرمود ڈالر پاؤنڈ وغیرہ کے نرخ کے بارے میں بات چیت میں دلچسپی نہ ہونے کے باعث اور بیئر پینے کی غرض سے ایک کونے میں جا بیٹھتا۔ حمید بھی کسی سے قریبی دوستی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس آکر بیٹھنے لگا۔ پرمود کو معلوم ہوا کہ اس کی شادی کو ابھی تین چار مہینے ہی ہوئے ہیں۔ "سیٹل ہو جاؤں تو بیوی کو جلد ہی بلا لوں گا،" حمید نے کہا۔ اس کے والد علی گڑھ میں مولوی وغیرہ تھے۔ اس کی پرورش سخت گیر مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ بیئر یا سگریٹ کا کوئی سوال نہ تھا۔

ایک بار پرمود نے اس سے پوچھا، "شہر میں ایک اچھی فلم لگی ہے، دی بگ بیٹل۔ چل کر دیکھیں؟"

حمید بولا، "میں نے آج تک سنیما نہیں دیکھا۔"

پرمود کو یہ سن کر تعجب ہوا۔ وہ حمید کو چہرے کو تکتا رہ گیا، یہ کیسی مخلوق ہے جس نے زندگی میں کبھی سنیما ہی نہیں دیکھا۔

پھر ایک شام کلب سے دونوں ساتھ باہر نکلے تو پرمود نے کہا، "چلو، سامنے والے ریستوران

میں چل کر چکن کھاتے ہیں۔'' شہر میں ایسے بہت سے ریستوران تھے جہاں مسلّم مرغ ملتے تھے۔ شیشے کی دیوار کے پیچھے ریستوران کا جو حصہ دکھائی دے رہا تھا اس میں سیخوں میں پروئے ہوئے گلابی مسلّم مرغ آہستہ آہستہ گھوم رہے تھے اور آگ کی آنچ سے سرخ ہوتے جا رہے تھے۔

حمید بولا، ''یہ فروزن مرغ فرانس وغیرہ سے امپورٹ کیے جاتے ہیں۔ حلال نہیں ہیں۔ میں نہیں کھا سکتا۔''

پرمود نے کہا، ''ارے، لیکن یہ عراقی بھی تو مسلمان ہیں نا۔ وہ کیسے کھاتے ہیں؟''

حمید نے ناک چڑھائی۔ ایسے آدمی سے دوستی بڑھانا مشکل ہے، پرمود نے سوچا۔ ان دونوں کے پس منظر، ان کی عادتیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں، اور کلب میں انھی دونوں کی دوستی ہوئی تھی، پرمود کو یہ سوچ کر لطف آیا۔

اس کے بعد چار پانچ دن تک حمید کلب میں دکھائی نہیں دیا۔ ایک دن ٹائمز آف انڈیا کی ورق گردانی کرتے ہوئے پرمود نے خبر پڑھی: ''علی گڑھ میں ہندو مسلم فساد۔'' حمید کی غیر موجودگی کا سبب پرمود کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ پہلے ہی اس معاملے میں حساس ہے، اوپر سے اس خبر نے اسے اور دباؤ کا شکار بنا دیا ہوگا۔ اس درمیان پرمود السٹریٹڈ ویکلی دیکھ رہا تھا کہ کسی نے آ کر کہا، ''کیوں وینگور لیکر، آج بیئر کی بوتل نہیں ہے آپ کے سامنے؟'' پرمود نے سوچا کہ اب اسے بھی کلب میں آنا جانا کم کر دینا چاہیے۔

اس کے اگلے دن شرما نے اسے بتایا، ''ہماری بلڈنگ میں ایک فلیٹ خالی ہو رہا ہے۔ اگر چاہیں تو آپ کو مالک مکان سے ملوا دیتا ہوں۔''

فلیٹ شہر کے وسط میں ایک پرہجوم چوک کے قریب کونے کی عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ سڑک کا شور اوپر تک سنائی دیتا تھا۔ لیکن چناؤ کی کچھ زیادہ گنجائش نہ تھی۔ پرمود اگلے ہی دن ہوٹل چھوڑ کر یہاں اٹھ آیا اور ضروری فرنیچر بھی خرید لایا۔ لکھنے پڑھنے کی میز اس نے کھڑکی کے پاس رکھی۔ کھڑکی میں سے چوک کے بیچوں بیچ اسے دونوں ہاتھوں میں ہتھوڑا اٹھائے ہوئے ایک مزدور کا مجسمہ نصب دکھائی دیا۔ مجسمے کے بائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر ایک مسجد کا مینار دکھائی پڑتا تھا۔ مجسمہ نزدیک ہونے کی وجہ سے بہت بڑا دکھائی دیتا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مزدور کے ہاتھوں میں اٹھا ہوا

Scanned with CamScanner

ہتھوڑا مینار کے اوپر لٹکا ہوا ہو۔ مجسمے کے داہنی طرف بہت دور آئل ریفائنری کی بہت اونچی چمنی سر اٹھائے کھڑی تھی۔

پرمود میز پر بیٹھ کر جواین کو خط لکھنے لگا۔

3

پرمود ریڈیو کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، اس کے بٹن گھما کر دیکھے، پھر سوچا اسے کھول کر دیکھا جائے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اسے ایسی چیزوں کی تکنیک کا کوئی علم نہیں ہے، اس لیے وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس نے ریڈیو کو اسی حالت میں چلا دیا۔ کسٹم والوں کے ایف ایم بینڈ نکالنے کے بعد سارے اسٹیشنوں سے کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ فی الحال اسے یوں ہی استعمال کرے، بعد میں نیا ریڈیو خرید ے یا کچھ اور بندوبست کرے۔ ویسے کسی نئی جگہ اکیلے رہنے والے کے لیے ریڈیو کافی اہم چیز ہوتی ہے۔ پرمود کو رمضان علی نام کا ایک ایرانی طالب علم یاد آیا۔ بلومنگٹن کے ہاسٹل میں رمضان علی پرمود ہی کی منزل پر رہتا تھا۔ اس نے وہاں آنے پر جو اپنا ریڈیو چلایا تو تین چار مہینے تک بند ہی نہیں کیا۔ رات کو دیر گئے ریڈیو اسٹیشن کی نشریات ختم ہو جاتیں اور صبح خود بخود دوبارہ شروع ہو جاتیں؛ رمضان علی کا ریڈیو دن رات چلتا رہتا۔ ریڈیو کی آواز وہ ظاہر ہے دھیمی رکھتا؛ لیکن پس منظر میں مسلسل سنائی دیتی اس کی آواز اسے کسی کے ساتھ ہونے کا احساس دلایا کرتی۔ پردیس میں آ پڑنے پر 'ہوم سک نیس' کا سامنا کرنے کے لیے آدمی ایسا کچھ نہ کچھ کرتا ہی ہے۔

پرمود بٹن گھما گھما کر مختلف اسٹیشنوں کو آزماتا رہا۔ بہت سے اسٹیشنوں سے، ظاہر ہے، عربی زبان کی نشریات آ رہی تھیں۔ اسے دریافت کرنا تھا کہ انگریزی کے اسٹیشن کون کون سے سنائی دیتے ہیں۔ وائس آف امریکہ کہاں لگتا ہے اور بی بی سی کہاں، یہ سب پتا چلانا تھا۔ پھر اسے چند مخصوص پروگراموں کا عادی ہونا تھا اور ان کی راہ دیکھنی تھی۔ رفتہ رفتہ اس ریڈیو کی دنیا سے اس کی شناسائی ہو جائے گی۔

پرمود ریڈیو کا بٹن گھما رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے ریڈیو ہاتھ سے رکھ کر

Scanned with CamScanner

دروازہ کھولا۔ ''کیوں وینگور لیکر، کیا چل رہا ہے؟'' شرما نے کہا اور اندر آ کر بیٹھ گیا۔

پرمود کے اس فلیٹ میں آنے کے بعد شرما روز ہی ایک آدھ بار اِدھر آ نکلتا۔ اسی عمارت کے دوسرے وِنگ میں اس کا فلیٹ تھا۔ پرمود کو فلیٹ دلانے میں مدد کرنے کی وجہ سے اسے یہاں آ بیٹھنا ایک طرح سے اپنا حق محسوس ہونے لگا تھا۔ شرما قریب پینتالیس سال کا تھا؛ پرمود اور اس کی عمر میں خاصا فرق تھا۔ وہ یہاں چار سال سے رہ رہا تھا، اس لیے سینئر ہونے کے لحاظ سے وہ پرمود کو مشورے دیا کرتا۔ پرمود کو اب اس سے کوفت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے یہ پسند نہ تھا کہ کوئی شخص کسی بھی وقت اس کے گھر آ دھمکے۔

''آج کلب جانے کا ارادہ ہے نا؟'' شرما نے پوچھا۔ ''آج جمعرات ہے، کلب ڈے! ایشور سنگھ بتا رہا تھا کہ کل تازہ اخبار آ گئے ہیں۔ جلدی جانا اچھا رہے گا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ایک بار اخبار ہاتھ میں آ جائے تو دو دو گھنٹے اسے چھوڑتے نہیں۔ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک سب چاٹ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چلیں گے، ٹھیک ہے نا؟''

''آج میں کلب نہیں جا سکوں گا،'' پرمود نے کہا، ''ایک عراقی کے ساتھ کھانے پر جانا ہے۔''

میز پر سے ایک رسالہ اٹھا کر شرما اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اچانک پرمود نے پوچھا، ''یہاں سمندر ہے نا، کس طرف ہے؟ قریب ہی ہے کیا؟''

''سمندر،'' شرما رسالے پر سے سر اٹھا کر سوچتے ہوئے بولا، ''نیچے مشرق کی طرف ہے۔ لیکن میرا خیال ہے، بہت دور ہے۔ میں چار سال میں ایک بار بھی اُدھر نہیں گیا ہوں۔''

پھر وہ مکھر جی کے بارے میں بات کرنے لگے جو شرما کے فلیٹ میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ مکھر جی پچاس کے پیٹے میں تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو کلکتہ میں چھوڑ کر آیا تھا۔ شرما کی بیوی مر چکی تھی؛ اس کا اکلوتا بیٹا دلّی میں کالج میں پڑھتا تھا۔

''میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ فلیٹ جس میں اب تم رہتے ہو، میں اپنے لیے لے لوں،'' شرما بولا۔ ''اس مکھر جی کو ہر بات پر بحث کرنے کی عادت ہے۔ میرے لیے سر درد ہے۔ اور ٹیپ ریکارڈر پر ہمیشہ کلاسیکی موسیقی یا رابندر سنگیت! مجھے اس سے بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے کہا، ہندی گانے لگاتے ہیں، تو ناک سکوڑ دی۔ وہی بنگالیوں کا اپنے اعلیٰ کلچر کا خناس! سب بکواس!''

Scanned with CamScanner

پرمود نے سوچا، فلیٹ وغیرہ میں کسی کو حصہ دار بنانے میں یہی خرابی ہے۔ شروع شروع میں دوستی ہوتی ہے، لگتا ہے اس کے ساتھ معاملہ جم جائے گا۔ لیکن جب چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے کا موقع آتا ہے تو چھوٹی چھوٹی چیزیں چبھنے لگتی ہیں۔ جو لوگ ویسے دوست ہوتے ہیں، ساتھ رہنے سے ان میں دشمنی سی ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت حال سے شروع سے ہی دور رہنا بھلا ہے۔ تھوڑا فاصلہ قائم رکھنے سے لوگوں کے آپسی تعلقات ٹھیک رہتے ہیں۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ٹھکر جی ہی تھا۔ اس کی آواز اونچی اور گونج دار تھی۔

''ارے تم یہاں بیٹھے گپیں مار رہے ہو، اور میں سودا سلف لا کر وہاں تمھاری راہ دیکھ رہا ہوں،'' اس نے شرما سے کہا۔ پھر پرمود سے مخاطب ہو کر بولا، ''میں سودا سلف لاتا ہوں، یہ کھانا پکاتا ہے، ہمارے درمیان یہی طے ہوا ہے۔''

''ارے بیٹھو یار!'' شرما بولا۔ ''سب کچھ گھڑی کے حساب سے کرنا کیا ضروری ہے۔''

''بیٹھیے ٹھکر جی صاحب،'' پرمود نے بھی کہا۔

''اچھا تو کون سی سبزی لائے ہو آج بازار سے؟'' شرما نے ٹھکر جی سے پوچھا۔

''بینگن لایا ہوں،'' ٹھکر جی بولا۔

''کیا؟ پھر بینگن!'' شرما زور سے بولا۔ ''تمھیں بینگن پسند ہیں اس لیے روز یہی لاتے ہو، ٹھکر جی۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ تم جانتے ہو مجھے بینگن سے بوریت ہوتی ہے۔''

''بازار میں بینگن کے سوا کوئی اور سبزی ہی نہیں ملتی تو میں کیا کروں! ہر جگہ صرف بینگن کے ڈھیر! اگلی بار چاہو تو تم سودا لے آنا، میں کھانا پکا لوں گا۔''

''باپ رے!'' شرما بولا۔ ''تمھارے ہاتھ کا کھانا! نہیں نہیں! تم سودا لاؤ، میں کھانا پکاؤں، یہی ٹھیک ہے۔''

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں،'' ٹھکر جی نے کہا۔ پھر پرمود سے بولا، ''ویسے شرما جی کھانا اچھا پکاتے ہیں۔ میں چھٹی پر کلکتہ جاتا ہوں تو بیوی کے ہاتھ کا کھانا کھاتے ہوئے بھی شرما جی کے پکائے ہوئے کھانے کو یاد کرتا ہوں۔ ایک بار آپ ہمارے فلیٹ پر آ کر کھانا کھائیے، وینگور لیکر۔''

پرمود نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کتنا ہی چڑتے ہوں،

Scanned with CamScanner

انھیں ایک دوسرے کی عادت ہو گئی ہے اور ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے۔ گھر والوں اور رشتے داروں سے اتنی دور پردیس میں یہ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے بسر کر رہے ہیں، لوگ اسی طرح جیتے ہیں، پرمود یہ سوچ کر محظوظ ہوا۔

"ارے مکھرجی، یہ وینگور لیکر پوچھ رہا تھا کہ سمندر پر کیسے جایا جائے۔ تمھیں کچھ پتا ہے؟ تم اِدھر اُدھر بہت گھومتے رہتے ہو۔ میں نے تو شہر سے باہر مشکل ہی سے کبھی قدم نکالا ہوگا۔"

"سمندر پر کیسے جایا جائے؟ میں تو کبھی وہاں گیا نہیں۔ وہاں دیکھنے کے قابل کچھ نہیں ہے۔ دیکھنے والی چیزیں اس کے الٹی سمت میں واقع ہیں۔" پھر کچھ رک کر مکھرجی بولا، "لیکن سمندر پر جانے کا شوق کیوں؟ سمندر تو سب جگہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ اس کے بجائے یہاں بہت سی خاص قابلِ دید جگہیں موجود ہیں، انھیں دیکھیے۔"

"ہمارے مکھرجی بابو کو یہاں کی قابلِ دید جگہوں کی بہت معلومات ہیں،" شرما نے پرمود کو مطلع کیا۔ "بہت کتابیں پڑھی ہیں انھوں نے۔ خود کو امیچور آرکیالوجسٹ کہلاتے ہیں۔ یہ بنگالی لوگ آخر انٹلکچوئل جو ٹھہرے!"

شرما کے دوستانہ طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے پرمود بولا، "واہ! بہت خوب۔ مجھے بھی ان چیزوں سے دلچسپی ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے ان کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

شرما اور مکھرجی کے جانے کے بعد پرمود نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ باہر نکلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ کپڑے بدلنے اندر چلا گیا۔ پہلے اس نے بنا سوچے ایک کالر والی ٹی شرٹ نکالی، پھر کچھ رک کر سوچنے لگا۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہاں لوگ زیادہ تر سوٹ اور ٹائی پہنتے ہیں۔ پرمود کو امریکہ میں ٹی شرٹ پہن کر گھومنے کی عادت تھی۔ چار دن پہلے وہ ڈپارٹمنٹ کی ٹی پارٹی میں گیا: وہاں سب لوگ سوٹ اور ٹائی پہنے تھے جبکہ پرمود نے بنا کالر کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسے بڑا عجیب محسوس ہوا۔ آج عقیل غالباً سوٹ ہی پہن کر آئے گا؛ پرمود نے سوچا کہ اسے کم سے کم کوٹ تو پہن ہی لینا چاہیے۔

مرجینا ریستوران میں عقیل پرمود کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھایا۔ "ہیلو بڈی!" اس نے زور سے کہا۔ وہ لحیم شحیم اور بڑی آواز والا شخص تھا۔ امریکی طرز کی انگریزی بڑے ٹھسے سے بولتا تھا۔ امریکی لہجے اور روزمرہ کی نمائش کرتے ہوئے بہت خوش معلوم ہوتا

Scanned with CamScanner

تھا۔اس کی بیوی امریکی تھی۔

دودن پہلے جب یونیورسٹی میں پرمود سے اس کی ملاقات ہوئی تو یہ معلوم کر کے کہ وہ حال ہی میں امریکہ سے آیا ہے، اسے پرمود سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ پھر انھوں نے آج شام ملنے کا طے کیا۔

ریستوران دریا کے قریب واقع تھا؛ میز کے پاس کھڑکی سے اچھا منظر دکھائی دیتا تھا۔ابھی پورا اندھیرا نہیں ہوا تھا۔شط العرب کے اُس کنارے پر سورج کی آخری کرنیں کھجور کے پیڑوں کے قطار پر پڑ رہی تھیں۔ پچھلے ایک دو بار کے مقابلے میں آج پرمود کو دریا کے پانی میں زیادہ طغیانی محسوس ہوئی۔ وہ جھک کر دھارے کو دیکھتا رہا۔

"کیا دریا میں سیلاب آرہا ہے؟" اس نے کہا۔

"نہیں سیلاب نہیں،" عقیل بولا۔ "یہاں سے آگے دریا سمندر میں گرتا ہے نا۔سمندر میں جوار آتا ہے تو دریا کے بہاؤ پر اس کا اثر پڑتا ہے۔دھارا رُکنے کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ دریا میں سیلاب آرہا ہے۔"

"سمندر کدھر ہے؟ کیا ساحل اچھا ہے؟" پرمود نے پوچھا۔

"سمندر؟ دور ہے یہاں سے۔میرا ابھی جانا نہیں ہوا،" عقیل بولا۔ "یہاں کا کیا سمندر اور کیا ساحل! اس میں کوئی دم نہیں۔ساحل دیکھنا ہو تو کیلیفورنیا میں دیکھو! کیسا خوبصورت ساحل! ایک دم سُوپرڈُوپر! سان فرانسسکو میں ہم ہمیشہ وہاں تیرنے جایا کرتے تھے۔"

ویٹر نے بیئر کی بوتل پرمود کے سامنے لاکر رکھی۔ عقیل کی بوتل آدھی ہو چکی تھی۔

"کیا تم بہت سال سان فرانسسکو میں رہے؟"

"سات سال،" عقیل نے کہا۔

"سات سال؟ اس کا مطلب ہے وہاں سیٹل ہی ہوگئے تھے؟ ویسے سان فرانسسکو خوبصورت شہر ہے۔میں نے ایک بار جلدی میں دیکھا تھا۔وہاں دوبارہ جانا چاہتا تھا، لیکن جانہ سکا۔"

"فرِسکو جیسا کوئی اور شہر نہیں!" عقیل بولا۔

کھانے کے بعد عقیل نے کہا، "شہر کی ذرا سیر کی جائے، کیا خیال ہے؟"

Scanned with CamScanner

''لیکن تمھاری بیوی گھر میں انتظار کر رہی ہوگی،'' پرمود نے کہا۔

''میری بیوی آج کل یہاں نہیں ہے۔ گرمیوں میں اسے بچے کے ساتھ کیلیفورنیا بھیج دیا ہے۔ مہینے بھر میں آئے گی۔ میرا بھی جانے کا ارادہ تھا، لیکن یہاں کام تھا اس لیے نہ جا سکا۔''

''اچھا، تو جب تک تمھاری بیوی نہیں ہے تمھارے ساتھ گھوما پھرا جا سکتا ہے۔ بیوی آ گئی تو پھر تم دکھائی نہیں دو گے!''

''نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کے آنے کے بعد تم میرے گھر کھانے پر آنا۔ تم امریکہ میں رہے ہو اس لیے اُسے بھی تم سے بات کرنا اچھا لگے گا۔ یہاں اسے اچھی کمپنی نہیں ملتی۔''

''نہیں، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ لیکن شادی شدہ لوگوں کے ساتھ مجھے اس قسم کا تجربہ ہو چکا ہے۔ بیوی موجود نہ ہو تو ہم جیسے چھڑے لوگوں کے ساتھ پینے پلانے، گھومنے پھرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ بیوی واپس آ جائے تو ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں۔''

''ارے اس میں بیچارے شوہر کو کیوں قصوروار ٹھہراتے ہو۔ بیوی کے لوٹنے کے بعد غریب پکڑا جاتا ہے۔ اسے گردن باہر نکالنے تک کا موقع نہیں ملتا... لیکن میری بیوی پٹی بہت عمدہ عورت ہے۔ ایک دم کیلیفورنین! اسے اس طرح کے انٹلکچوئل دوستوں کا گھر آنا پسند ہے۔ اسے دوسری عورتوں کے ساتھ شاپ ٹاک کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم لٹریچر والے ہو نا؟ تب تو اس کی تم سے اچھی گپ شپ رہے گی۔ اس نے بھی برکلے میں لٹریچر پڑھا تھا۔''

ریستوران سے باہر نکل کر کچھ دیر دونوں گھومتے رہے۔

''کہیں کوئی اچھی انگریزی فلم چل رہی ہے کیا؟''

''دو اٹالین گینگسٹر فلمیں لگی ہوئی ہیں؛ باقی دو عربی کی ہیں۔''

''گینگسٹر فلم تو دیکھنے کا موڈ نہیں ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''اور کیا کر سکتے ہیں؟''

عقیل بولا، ''یہاں کرنے کو کچھ زیادہ چیزیں نہیں ہیں۔'' پھر کہنے لگا، ''دو تین کیبرے ہیں۔ چلنا ہے؟ اصل عربی بیلی ڈانس دیکھنے کو ملے گا۔ آج جمعرات ہے، ویک اینڈ۔ آج بہتر پروگرام ہو گا۔ رونق بھی کافی ہوگی۔''

''چلو چلتے ہیں،'' پرمود نے کہا۔ ''کلاسیں شروع ہونے سے پہلے جو کرنا ہے کر لیں۔ ایک بار

کلاسیں شروع ہو گئیں تو پھر وقت نہیں ملے گا۔''

راستے میں عقیل بولا، ''اصل میں کبھرے وغیرہ جانے میں ذرا احتیاط کرنی چاہیے۔ آخر ہم معزز پروفیسر لوگ ہیں! اس چھوٹے سے شہر میں طلبا ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ پھر بھی میں ان چیزوں کی زیادہ فکر نہیں کرتا۔'' پھر وہ بولا، ''لیکن فرسکو جیسے مین وومن شوز نہیں ہوتے یہاں!'' وہ پرمود کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنسا۔

کبھرے شہر کے بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں تھا۔ ٹکٹ لے کر دونوں اندر پہنچے۔ ایک ہاتھ پر بڑے سے ہال جیسی عمارت تھی؛ بائیں طرف لان تھا، اس پر میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس کے بالکل آخر میں، دیوار کے نزدیک اسٹیج بنایا گیا تھا۔

''آج کل جب تک ہوا گرم ہے، کبھرے باہر صحن میں ہوتا ہے،'' عقیل نے بتایا۔ ''جاڑوں میں اندر ہال میں۔''

''باہر ہی اچھا ہے، کھلی ہوا میں،'' پرمود نے کہا۔

بیشتر میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے، لیکن شو شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے تو تیز میک اپ کیے ہوئے دو تین عورتیں ان کی طرف بڑھیں۔ وہ ہنستے ہوئے عقیل سے باتیں کرنے لگیں۔ عقیل نے جواب میں کچھ کہا تو چلی گئیں۔ ''اگر ہم چاہیں تو وہ ہماری میز پر آ کر بیٹھ جائیں گی، اور ہماری مرضی ہو تو اس سے آگے بھی جا سکتی ہیں!'' عقیل آنکھ مار کر بولا۔ ''میں نے منع کر دیا۔ ہم پروفیسروں کو اتنا آگے نہیں جانا چاہیے۔''

ویٹر وہسکی کے دو گلاس لے کر آیا۔ پرمود نے عقیل سے کہا، ''مجھے نہیں چاہیے۔ کھانے کے بعد پینا مجھے پسند نہیں۔''

عقیل بولا، ''لے کر رکھ لو۔ ایک گلاس کی قیمت ٹکٹ میں شامل ہے۔''

''میرا گلاس بھی تم پی لینا،'' پرمود نے کہا۔

''اوکی ڈوکی،'' عقیل بولا۔

آس پاس کی میزوں پر بیٹھے بہت سے لوگوں سر پر سفید عقال باندھ رکھے تھے جو عراق میں عام طور پر باندھے جانے والے لال اور کالے چوخانوں والے رومالوں سے الگ دکھائی دیتے تھے۔

Scanned with CamScanner

یہ لوگ خود بھی کچھ مختلف معلوم ہوتے تھے۔ ''ان میں سے زیادہ تر کویت یا سعودی عرب سے آئے ہیں،'' عقیل نے بتایا۔ ''ان دونوں ملکوں کی سرحد یہاں سے بہت نزدیک ہے نا، تو ویک اینڈ گزارنے یہ لوگ یہاں آ جاتے ہیں۔ پینے پلانے اور کیبرے وغیرہ دیکھنے کے لیے۔ یہاں یہ سب ہوتا ہے، لیکن کویت اور سعودی عرب میں بہت سختی ہے۔ دارو وغیرہ پر بالکل پابندی ہے۔ اس لیے مزے کرنے کے لیے لوگوں کو اِدھر آنا پڑتا ہے۔''

''اچھی ٹورسٹ اٹریکشن ہے،'' پرمود نے کہا۔

عقیل بولا، ''ظاہر ہے یہاں آنے والے کویتی اور سعودی زیادہ مالدار لوگ نہیں ہوتے۔ اُن ملکوں کے حساب سے انھیں غریب کہا جا سکتا ہے۔ جو سچ مچ مالدار ہیں وہ لندن اور پیرس جاتے ہیں!''

تھوڑی دیر میں اسٹیج پر کچھ ہلچل شروع ہوئی۔ اسٹیج کے پچھلے حصے میں پانچ چھ کرسیاں قطار میں لگائی گئیں؛ ان پر گانے بجانے والے آ کر بیٹھ گئے۔ بیچ میں گٹار جیسا کوئی ساز لیے بیٹھا کالے چشمے والا آدمی اندھا تھا۔ وہ اس تمام چہل پہل اور تیز روشنیوں کے درمیان وہ اپنے آپ اور اپنے ساز میں محو دکھائی دیتا تھا۔ پرمود اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے سازندے کچھ دیر کوئی دھن بجاتے رہے اور ایک شخص گاتا رہا۔ پھر ایک کھنکھناہٹ کے ساتھ رقاصہ اسٹیج پر آ گئی اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

رقاصہ کا بدن مٹاپے کی طرف مائل تھا، اس کے باوجود اس کی حرکات خاصی تیز تھیں۔ عقیل بولا، ''یہاں سلم رہنے کا زیادہ رواج نہیں۔ یہاں کی عورتوں کو بڑی حیرت ہوتی ہے جب وہ ہمیں کو سلم رہنے کی کوشش میں مصروف دیکھتی ہیں۔''

دھیرے دھیرے ماحول رنگین ہوتا گیا۔ لوگ بیچ بیچ میں تالیاں بجا رہے تھے، کچھ زور زور کی آوازیں نکال رہے تھے۔ ایک دو نے اسٹیج پر جا کر رقاصہ کے ہاتھ پر نوٹ رکھے جو اس نے مسکرا کر قبول کیے اور ایک سازندے کو تھما دیے۔ اس دوران تماشبینوں میں سے کسی نے ویٹر کے ہاتھ شمپین کی بوتل اور گلاس اسٹیج پر بھجوایا۔ اس نے ایک گھونٹ لے کر ٹرے واپس بھیج دی۔ پرمود نے عقیل نے کہا، ''بلومنگٹن میں ایسٹ اینڈ کیفے نام کا ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ طلبا میں بہت مقبول تھا۔ اس کے

مالک نے نئے پن کے خیال سے ویک اینڈ پر بیلی ڈانس شروع کروایا۔ ایک امریکی لڑکی بیلی ڈانس سیکھ کر آئی تھی۔ اس نے اچھا ڈانس کیا، سب نے تعریف کی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی محنت سے تیاری کی ہے۔ لیکن اس سب میں جو کمی تھی وہ اب میری سمجھ میں آئی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہاں لوگ اس ڈانس کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی انوکھی چیز کا مشاہدہ کر رہے ہوں، سکون اور احترام کے ساتھ۔ یہاں جس طرح تماشائیوں کا ناچنے والی کے ساتھ برجستہ مکالمہ جاری رہتا ہے وہ وہاں نہیں تھا۔ یہاں یہ بالکل فطری اور حقیقی لگتا ہے۔''

''اِٹس دَ رِیئل تھِنگ! یو لائیک اِ۔۔۔ آں؟ گڈ گڈ!'' عقیل بولا۔ ''لیکن تمھیں سچ بتاؤں، مجھے فرِسکو کا مین ووَمن شو اِس سے بہتر لگتا ہے۔ دیٹ از ہاٹ اسٹف، مین! ایک دم سوپر ڈوپر! اس کے سامنے یہ تو بالکل پھوک ہے۔ امریکہ میں اصل مسالہ دیکھنے کو ملتا ہے۔''

''پھر بھی تم یہاں واپس آ گئے؟'' پرمود نے کہا۔ اسے خیال آیا کہ جب وہ یہاں کی کسی چیز کی تعریف کرتا ہے تو عقیل بہت خوش ہوتا ہے، لیکن خود اُسے امریکہ کی چیزیں زیادہ پسند ہیں۔ وہ اتنے برس امریکہ میں رہنے کے بعد واپس آیا تھا۔ وہاں اور یہاں کی زندگی کے فرق سے اس نے کس طرح سمجھوتا کیا ہوگا؟

''عقیل، تم سات آٹھ سال امریکہ میں رہ کر اس ملک میں لوٹ آئے، مجھے یہ بڑی خاص بات معلوم ہوتی ہے،'' پرمود نے کہا۔

''میں بتاتا ہوں کیا ہوا۔ عراقی حکومت نے اعلان کیا کہ بیرون ملک رہنے والے عراقی اگر واپس آئیں تو انھیں خاص سہولتیں دی جائیں گی۔ وہ کار، فرنیچر وغیرہ بغیر ڈیوٹی کے لا سکیں گے، اس کے علاوہ انھیں مکان کے لیے زمین رعایتی دام پر دی جائے گی۔ میں نے سوچا اس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اس لیے آ گیا۔''

''یہ تو محض ایک اضافی کشش ہوگی۔ تمھیں یہاں کی زندگی بھی تو اپنی طرف کھینچتی ہوگی۔ تم لوگوں کی رشتے داریاں خاصی مضبوط ہوتی ہیں نا؟''

''مجھے واپس آنے کا خیال ٹھیک لگا۔ ویسے سچ کہوں تو میں نے اس کے بارے میں کچھ زیادہ

Scanned with CamScanner

سوچا نہیں۔"

پرمود کو محسوس ہوا کہ عقیل کو دونوں جگہوں کے فرق اور تضاد کا زیادہ احساس نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اس بارے میں سوچتا نہیں۔ اس کے حساب سے امریکہ کا مطلب امریکی لہجہ، بڑی بڑی گاڑیاں اور فرسکو کے سیکس شوز ہی ہیں۔ اسے لگا کہ وہ خود اتنی اُتھلی سطح پر نہیں جی سکتا۔ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ خود کو عقیل سے برتر سمجھ رہا ہے۔ اس کے باوجود اسے عقیل پر رشک بھی آتا تھا۔ پھر اس نے پوچھا، "تمھاری بیوی کو یہاں رہنا اچھا لگتا ہے؟"

تیزی سے پرمود کی طرف مڑ کر عقیل بولا، "بالکل! اچھا کیوں نہیں لگے گا؟"

پرمود کو جھٹکا سا لگا۔ عقیل کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔ اسے گمان نہ تھا کہ اتنے سادہ سے سوال پر اس کا اتنا تیز ردعمل ہوگا۔ "نہیں... میرا مطلب ہے... " وہ آہستہ سے بولا۔

"وہ یہاں بہت خوش ہے۔ اسے کوئی کمی نہیں،" عقیل اسی اونچی آواز میں بولا۔

پھر اس نے اپنے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گردن گھما کر اسٹیج کی طرف دیکھنے لگا۔ زیادہ نہ بولنا ہی بہتر ہے، پرمود نے سوچا۔ وہ بھی خاموشی سے شو دیکھنے لگا۔ اسٹیج پر دوسری رقاصہ آ گئی تھی۔ یہ پہلی والی سے زیادہ جوان اور چھریری تھی اور اس کی حرکات زیادہ پرکشش تھیں۔

کچھ دیر بعد پرمود نے عقیل کی طرف دیکھا تو وہ سر جھکائے کسی نقطے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ سچ مچ غصے میں ہے، پرمود نے سوچا۔ "آئی ایم سوری آئی آسکڈ اباؤٹ یور وائف،" وہ بولا۔

"او نو نو، دیٹس آل رائٹ!" عقیل نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ تم نے پنکی کے بارے میں سوچا تو اچانک مجھے اس کی یاد آ گئی۔ آئی مس ہر۔"

لیکن یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر کرسی پر پیچھے کو سرک کر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے رکھے گلاس کو تکنے لگا۔ پرمود کو محسوس ہوا کہ اس نے جو بات کہی وہ پورا سچ نہیں؛ اصل بات اس سے کچھ زیادہ ہوگی۔ وہ اسٹیج کی طرف دیکھنے لگا لیکن بے چینی سے کسمساتا رہا۔ پھر اس کی نظر بائیں طرف گئی۔ صحن سے باہر اندھیرے کے دوسری طرف عمارتیں تھیں، ان میں سے دو ایک کی اوپری منزلیں اور بالکونیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہاں کچھ لوگ کھڑے اسٹیج پر ہونے والا شو دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے نظارہ کچھ زیادہ

Scanned with CamScanner

اچھا نہیں ہوگا، لیکن مفت میں کیا برا تھا۔

رات گہری ہو رہی تھی اور تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ ٹھنڈی، خوشگوار ہوا۔ اسٹیج کے پہلو میں کھجور کے دو تین پیڑ تھے جن کے بڑے بڑے پتے ہوا میں زور زور سے ہلتے ہوئے سرسرا رہے تھے۔ پہلو میں سرسراتے ہوئے پتے، اور بیچ اسٹیج پر باریک گھیر دار لباس کو گھماتی ہوئی رقاصہ۔ بڑا حسین منظر تھا۔ ہوا کے اوپر کو اٹھتے ہوئے جھونکے ماحول کو جاندار بنا رہے تھے۔ بہت لطیف احساس ہو رہا تھا۔ اب تک عقیل کا موڈ بھی بحال ہو چکا تھا اور وہ ہنسی مذاق کرنے لگا تھا۔ شام عمدہ گزر رہی ہے، پرمود نے سوچا۔ اچانک اس کی توجہ عقیل کی انگلیوں میں دبے سگریٹ کی طرف گئی۔ وہ سگریٹ کے کش لگانا بھول کر وہ خود میں گم تھا اور تیز ہوا کے باعث سگریٹ تیزی سے جل کر ختم ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کی زد میں آ کر دھوئیں کے مرغولے یوں اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے جیسے ایک ساتھ کئی سمتوں میں جانا چاہتے ہوں۔

جب دونوں گھر کی طرف روانہ ہوئے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ''سی یو لیٹر، ایلی گیٹر!'' اسے الوداع کہتے ہوئے عقیل نے اونچی آواز میں کہا اور مسکرا کر اپنی اس قافیہ بندی کا مزہ لینے لگا۔ پرمود بھی اس کے اس امریکی مذاق پر ہنستا ہوا اپنے فلیٹ کی عمارت میں داخل ہو گیا۔

اگلے دن پرمود کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اس نے لیٹے لیٹے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھڑی باندھ کر سونے کی عادت جو اسے امریکہ جا کر پڑ گئی تھی اب تک قائم تھی۔ وقت پونے نو بجے، تاریخ بارہ، دن جمعہ۔ یعنی اتوار۔ اتوار کے بجائے جمعے کے دن کی چھٹی اب تک اس کی عادت کا حصہ نہیں بنی تھی۔ جمعے کا مطلب ویک اینڈ اور اتوار ورکنگ ڈے، یہ بات اب تک اسے عجیب لگتی تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹا رہا۔ اسے خیال آیا کہ شروع شروع میں اسے جو ایک طرح کی بے دلی محسوس ہوتی تھی وہ اب جاتی رہی ہے۔ کسی نوزائیدہ بچے کی طرح جو شروع شروع میں پریشان ہو کر روتا ہے لیکن جلد ہی ہنسنے کھیلنے لگتا ہے۔ پرمود کو نوزائیدہ بچے سے اپنے موازنے کا خیال مزے کا لگا۔

نو بجے کے قریب باہر چہل پہل شروع ہو گئی۔ لوگوں کے بازار میں نکلنے کا وقت تھا۔ سڑک پر کوئی بھکاری اونچی آواز میں بار بار ''الیوم جمعہ... الیوم جمعہ...'' کہہ رہا تھا۔ پرمود ان لفظوں کے معنی نہ جانتا تھا۔ یہ اجنبی لفظ بلاوجہ اس کے ذہن میں اٹکنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ پلنگ سے اٹھا۔

Scanned with CamScanner

غسل کرنے کے بعد وہ اِدھر اُدھر کے کام کرتا رہا۔ کتابیں الٹ پلٹ کیں۔ اگلے دن سے کلاسیں شروع ہونے والی تھیں۔ اس نے طے کیا کہ دوپہر کو بیٹھ کر پڑھانے کی تیاری کرے گا۔ اسی درمیان کھانے کا وقت ہوگیا۔ پہلے اس نے باہر جاکر کھانے کا ارادہ کیا، پھر اسے خیال آیا کہ اب فلیٹ مل گیا ہے تو گھر میں کھانا تیار کرنے کی عادت ڈالنا بہتر ہوگا۔ اس نے کچھ چیزیں لاکر ریفریجریٹر میں رکھ لی تھیں۔ کھانے کے لیے باہر جانے کا کوئی خاص جواز نہیں تھا۔ صرف باہر جاکر روٹی لانی تھی۔ اسے جس قسم کی روٹی کھانے کی عادت تھی، وہ یہاں نہیں ملتی تھی۔ سموَن نام کی چپٹی، دونوں کناروں پر نوکدار روٹی تھی یا خبوس نام کی پھیلی ہوئی بڑی گول روٹی۔ ہوٹلوں میں زیادہ تر سموَن ہی دستیاب ہوتی تھی، لیکن گھروں میں کھانے کے لیے لوگ خبوس لے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ بچوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں اوپر تلے چنی ہوئی خبوس کے ڈھیر لے جاتے دیکھنا ایسا ہی دلچسپ نظارہ ہوتا تھا جیسے ہنومان ہتھیلی پر درونا گری پہاڑ اٹھائے چلا جارہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا روز کھانے کے وقت پڑوس کی دکان سے سموَن یا خبوس لے کر آنے کا کام گھر کے بچوں کے ذمے ہے۔ اس روٹی کو ایک دو دن سے زیادہ ریفریجریٹر میں رکھا جاتا تو سوکھ کر سخت ہوجاتی تھی، دوسری روٹیوں کی طرح اسے پانچ چھ دن محفوظ نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ عورتوں بچوں والے گھروں کے لیے روز کے روز خبوس خریدنا مشکل نہ تھا، لیکن اس جیسے اکیلے آدمی کے لیے یہ زحمت کی بات تھی، اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا کہ فلیٹ کے قریب ہی ایک خبوس کی دکان ہے۔ وہ باہر نکلا۔

دکان کا سامنے والا حصہ لکڑی کے خالی کھوکھوں سے بنائی گئی میز پر مشتمل تھا۔ لوگ اس سے سٹے ہوئے انتظار کر رہے تھے۔ اندر مٹی کے بنے، گول منھ والے تین چولھے تھے: ان کے اندر گیس کے لال شعلے نظر آرہے تھے۔ ایک جانب ایک لڑکا آٹے کے پیڑے بنا رہا تھا۔ چولھے کے سامنے کھڑا نانبائی ڈھال کی شکل کی گول دھاتی چیز ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور پھرتی سے اس پر پیڑوں کو پھیلا کر روٹی کی شکل دے رہا تھا۔ ایک ایک منٹ کے بعد وہ لمبے سے چمٹے سے چولھے کی دیواروں پر لگی پکی ہوئی روٹیاں الگ کر کر کے لکڑی کی میز پر پھینکتا تھا۔ اس کی مہارت پر نظر جمائے ہوئے پرمود کو تازہ گرم روٹیوں کی خوشبو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آگ پر سِکتی ہوئی روٹیوں کی لذیذ، بے حد بنیادی، اور نہایت قدیم خوشبو۔ اولین انسانوں نے بھی اس مہک کو بالکل اسی طرح محسوس کیا ہوگا۔ روٹی

Scanned with CamScanner

بنانے کا سینکڑوں برس سے چلا آتا یہ انسانی رواج؛ پرمود کو لگا جیسے ایک سیدھا سادہ سچ اسے نئے سرے سے حاصل ہوا ہو۔ پلاسٹک یا کاغذ کے تھیلوں میں پیک شدہ مشین سے کٹی ہوئی ڈبل روٹی کھاتے کھاتے یہ سادہ سچ اس کے ذہن سے اوجھل ہو گیا تھا۔ انگلیوں کو جھلسا دینے کی حد تک گرم روٹیاں گھر لے جاتے ہوئے پرمود نے اس کا ایک خستہ ٹکڑا توڑ کر کسی بچے کی طرح منھ میں ڈال لیا۔

کلاسیں شروع ہوئیں؛ کالج میں چہل پہل بڑھ گئی۔ پرمود نے سوچا کہ اب اسے سنجیدگی سے اپنی ذاتی تحقیق بھی شروع کر دینی چاہیے۔ درسی تحقیق کرنے کا اس کا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ اسے اس کی کچھ زیادہ خواہش نہ تھی۔ اس نے اپنے تھیسس کا پیچیدہ اور آخر میں اکتا دینے والا کام ابھی کچھ دن پہلے ہی ختم کیا تھا۔ فٹ نوٹس کی بنیاد پر کتابی علم کی نمائش کی ایک اور عمارت کھڑی کرنے کا کھٹ راگ وہ کم از کم فی الحال شروع نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ اور ہی منصوبہ تھا۔ اس نے اپنی کتاب کا نام بھی سوچ رکھا تھا: On Identity۔ بہت عرصے سے یہ موضوع اس کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ اس کے حالیہ تجربات نے اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس کتاب کی جو شکل پرمود کے تصور میں تھی وہ ایک حد تک خودنوشت، ایک حد تک اِنشائی، اور کچھ فلسفیانہ تھی۔ وہ اسے علمی اور بوجھل کے بجائے 'اصل' معنوں میں فکرانگیز بنانا چاہتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ بصرہ جیسی جگہ یہ کام کرنے کے لیے نہایت موزوں ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان یا امریکہ دونوں سے ہر لحاظ سے دور اس مقام پر اسے وہ معروضیت اور گہرائی حاصل ہو سکے گی جو اس کام کے لیے درکار ہے۔ یہی سوچ کر امریکہ سے روانہ ہونے سے پہلے پرمود نے فکر اور فلسفے کے موضوعات پر بہت سی کتابیں ایک ٹرنک میں رکھ کر یہاں اپنے ڈپارٹمنٹ کے پتے پر بھیج دی تھیں۔ اسے جس طرح کی کتاب تحریر کرنی تھی اس کے لیے یہ امدادی کتابیں کافی تھیں۔ اسے کام باقاعدہ شروع کرنے کے لیے ان کتابوں کا انتظار تھا۔

اسے اپنے ٹائپ رائٹر کا بھی انتظار تھا جو اسی ٹرنک میں کتابوں کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ وہ لکھنے کا کام ٹائپ رائٹر پر ہی کرنا چاہتا تھا۔ ٹائپ رائٹر پر لکھتے ہوئے اسے زیادہ علیحدگی حاصل ہوتی؛ اس طرح وہ اپنے ذاتی تجربات کو کسی اجنبی کی طرح برت سکتا تھا، اپنی تحریر میں زیادہ معروضیت سے کام

لے سکتا تھا۔

ٹرنک ابھی پہنچا نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سمندر کے راستے پہنچنے میں اسے وقت لگے گا۔ وہ انتظار کرتا رہا۔

بڑے سے ہال میں پرمود کے علاوہ چھ سات اور لوگوں کی میزیں تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ کمرہ اصل میں کلاس روم تھا۔ اس کی ایک دیوار پر چوڑا سا بلیک بورڈ تھا۔ دفتر کے لیے جگہ کم پڑنے کی وجہ سے اسے دفتر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا۔ کمرے کے ایک سرے پر رکھی میز پر مسز نزار بیٹھتی تھی، ڈپارٹمنٹ کی ٹائپسٹ۔ پرمود کی اس سے اب تک کچھ زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ بس آتے جاتے ''ہیلو، ہاؤ آر یو!'' ہو جاتا تھا۔ وہ عراقی نہیں تھی۔ اس کے انگریزی تلفظ سے پرمود کو اس پر امریکی ہونے کا گمان ہوا تھا۔ اس کی میز پر بہت بڑا سا الیکٹرک ٹائپ رائٹر تھا جس کے پیچھے وہ تقریباً پوری کی پوری چھپ جاتی تھی۔ صرف اس کے سر کا بالائی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہر روز تھرماس ساتھ لاتی اور اس میں رکھا ہوا اورنج جوس، یا جو کچھ بھی، وقفے وقفے سے پیا کرتی۔ اپنی میز پر پڑھتے پڑھتے جب پرمود سر اٹھاتا تو اس کی نگاہ انجانے میں اس کی طرف اٹھ جاتی اور اکثر وہ اس کی آنکھوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا۔ لیکن چونکہ چہرے کا نچلا حصہ ٹائپ رائٹر کی اوٹ میں چھپا رہتا، اس لیے پرمود کی سمجھ میں نہ آتا کہ اسے مسکرانا چاہیے یا نہیں۔ پرمود کو احساس ہوا، رسمی 'سماجی' رکھ رکھاؤ بنائے رکھنے کے لیے صرف آنکھیں کافی نہیں بلکہ پورا چہرہ دکھائی دینا ضروری ہے۔

امریکن لٹریچر کی کلاس کے بعد پرمود ہاتھ میں ایک کتاب لیے مسز نزار کی میز کے پاس گیا۔ وہ اس بڑی جسامت کے ٹائپ رائٹر کے پیچھے بیٹھی دکھائی دی۔ اسٹینسل کی غلطیاں درست کرنے والے سیال کی چھوٹی سی شیشی بائیں ہاتھ میں لیے وہ داہنے ہاتھ سے اسٹینسل کو برش سے ٹھیک کر رہی تھی۔ اس سیال کی تیز بو پرمود کی ناک میں چبھی۔ پٹرول، فینائل جیسے کیمیائی مادّوں کی بو پرمود کو عجیب طرح اپنی طرف کھینچتی تھی۔ مسز نزار نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ دو چار نظمیں مجھے اسٹینسل کروانی ہیں،'' پرمود نے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ امریکن لٹریچر کے کورس کے لیے یہاں کوئی ٹیکسٹ بک دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے مجھے اس کے لیے تھوڑا

تھوڑا میٹر یل سائیکلواسٹائل کر کے کلاس میں تقسیم کرنا ہوگا۔''

مسز نزار نے کتاب ہاتھ میں لے کر اس پر نظر ڈالی۔''واہ! ایمرسن کی نظم 'برہما' پڑھا رہے ہیں آپ،'' وہ بولی۔''بہت خوب! مجھے یہ نظم بہت پسند ہے۔ اور یہ نظم کوئی ہندوستانی پڑھائے تو اور بھی زیادہ مناسب ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک نظم چنی ہے۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں کہ میں ہندوستانی ہونے کے ناتے ہندوستانی فلسفے یا کلچر کا پرچار کر رہا ہوں۔ دراصل اس بارے میں میری کچھ خاص معلومات بھی نہیں ہیں۔ میں نے تو بس یہ سوچا کہ اس نظم کو پڑھانا مزیدار رہے گا۔''

کتاب میز پر رکھتے ہوئے وہ بولی،''ٹھیک ہے، کل کر دوں گی۔ اس بہانے میں بھی تھوڑا بہت پڑھ لوں گی۔ آج کل ایسی چیزیں پڑھنے کا مجھے موقع نہیں ملتا۔ اسے ٹائپ کرنے میں مجھے دوسری چیزوں سے زیادہ اچھا لگے گا۔ کیا امریکن لٹریچر آپ کا خاص موضوع ہے؟''

''بالکل نہیں،'' پرمو نے کہا۔''میرے منع کرنے کے باوجود انھوں نے مجھے یہ کورس دے دیا۔ میں امریکہ سے آیا ہوں، شاید اس لیے! اصل میں میں نے امریکن لٹریچر کا مطالعہ کبھی کیا نہیں۔ اب یہ کورس پڑھانے کے لیے مجھے کافی پڑھنا پڑ رہا ہے۔ آپ امریکی ہیں نا، مسز نزار؟''

''نہیں، میں اصل میں ساؤتھ امریکہ کی ہوں۔ ارجنٹینا کی۔ لیکن میں نے کئی سال امریکہ میں گزارے، زیادہ تر کیلیفورنیا میں، وہاں میں کالج میں پڑھتی تھی۔ وہیں نزار سے ملاقات ہوئی۔ پھر ہم یہاں آ گئے۔''

''کیلیفورنیا؟ پھر تو آپ کیمسٹری کے عقیل کو جانتی ہوں گی۔ وہ بھی وہیں تھا۔ اس کی بیوی کیلیفورنیا کی رہنے والی ہے۔''

''اوہ یس! پیٹی سے میری اچھی دوستی ہے۔ ہم کافی وقت ساتھ گزارتے ہیں۔ آج کل وہ یہاں نہیں ہے، اس لیے میرا بھی دل نہیں لگتا۔''

-- اس دوران اچانک ہال میں بجلی چلی گئی۔''اوہ ویل! بجلی پھر چلی گئی،'' مسز نزار بولی۔''یعنی میرا ٹائپ رائٹر بند۔ اب خالی بیٹھنا پڑے گا۔ کب واپس آئے گی، کون جانے!'' پھر اس نے تھرماس باہر نکالا۔''اورنج جوس لیں گے؟'' اس نے پوچھا۔ پانچ دس منٹ بعد گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی،

''لگتا ہے بجلی جلدی نہیں آئے گی۔ یوں بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ! میں اب گھر جاتی ہوں۔'' اس نے ٹائپ رائٹر پر پلاسٹک کا غلاف چڑھا دیا۔

''اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بڑا سا کتا کمبل اوڑھے لیٹا ہو،'' پرمود نے کہا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں!'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو ان کاروں کو دیکھ کر مزہ آتا ہے جن پر لوگ بڑے بڑے غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ لمبی چوڑی سفید چادروں کے نیچے کاہلی سے لیٹی ہوئی کاریں! جیسے دوپہر کو قیلولہ کرتے ہوئے بھوت! یہاں کے کار پارک میں صبح مجھے ہمیشہ ایک آدمی اپنی مرسڈیز پر غلاف چڑھاتا دکھائی دیتا ہے۔ بہت دیر تک احتیاط اور پیار سے غلاف کی شکنیں دور کرتا رہتا ہے۔''

''ذرا تصور کیجیے اگر کسی روز واپس آ کر وہ غلاف اتارے اور اس کے نیچے کچھ بھی نہ ہو، کتنا مزہ آئے!''

دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر پرمود نے کہا، ''میرے جانے کا بھی وقت ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی نکلتے ہیں۔''

مسز نزار بولی، ''میرے پاس کار ہے۔ اگر چاہیں تو آپ کو ڈراپ کر سکتی ہوں۔'' پھر کار میں کہنے لگی، ''پرسوں شام عقیل ہمارے گھر آ رہا ہے۔ آپ بھی آئیے۔'' اس نے اپنے گھر کا راستہ سمجھایا۔

گاڑی سے اترتے ہوئے پرمود نے مڑ کر کہا، ''تھینک یو مسز نزار۔''

''ماریا،'' وہ بولی۔ ''کال می ماریا۔''

ماریا نزار کا گھر شہر کے خوشحال علاقے میں تھا۔ پرسکون سڑکیں، بنگلے جیسے مکانوں کی قطاریں، سیمنٹ کی دیوار کے پیچھے پھولوں کے پودے۔ ماریا نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا کتا پرمود کے پیروں میں لوٹنے لگا۔ پرمود بیٹھ گیا۔ پیروں تلے دبیز ایرانی قالین۔ بہترین فرنیچر۔ آرائش کی چیزیں۔ اِدھر اُدھر گھومتے کتوں کو دیکھ کر پرمود بولا، ''یہاں پالتو کتے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

''عربوں کو کتوں سے نفرت ہے۔ یہاں کتے پالنے کا رواج نہیں،'' ماریا نے کہا۔ ''جب میں نے کتا پالنے کی بات کی تو نزار کو بالکل پسند نہیں آئی۔ لیکن میں نے ضد کی کہ مجھے کتا ضرور چاہیے۔''

Scanned with CamScanner

ماریا کے دونوں بچے باہر آئے۔ بڑا آٹھ سال کا اور چھوٹا چھ سال کا۔ پرمود سے ہاتھ ملا کر وہ باہر کھیلنے چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں ماریا کا شوہر اندر سے آیا۔ وہ ماریا کا ہم عمر ہی رہا ہوگا، لیکن اس کے چہرے پر تھکان کا تاثر تھا جس کے باعث اس کی عمر زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ صوفے پر یوں بیٹھا تھا کہ اس کے جس ہاتھ میں سگریٹ تھا وہ کہنی کے بل صوفے کے بازو پر کھڑا تھا اور پہنچے پر سے جھکا ہوا تھا۔ وہ قالین پر ماریا کے پیروں کے پاس بیٹھے کتے کی طرف اور کتا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک قسم کا دوستی سے عاری سمجھوتا معلوم ہوتا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ آج مہمان آنے والے ہیں،'' وہ ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں کلب جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ وہاں مجید سے ملنا ہے۔''

''اگر اس سے کوئی اہم کام ہے تو تم چلے جاؤ،'' ماریا نے کہا۔ ''مجھے تو یوں بھی وہاں بوریت ہی ہوتی ہے۔ آج منگل ہے نا؟ یعنی آج کلب میں فلم بھی نہیں ہوگی۔ فلم دیکھنے سے کم از کم وقت اچھا گزر جاتا ہے۔'' اس کی ناک سے دھوئیں کا مرغولہ باہر نکلا۔ سگریٹ پینے والی بیشتر عورتیں چھوٹے چھوٹے کش لے کر منھ سے دھواں نکالتی ہیں۔ اتنا گہرا کش لینے والی عورت پرمود نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

ماریا پرمود سے مخاطب ہو کر بولی، ''آپ کو تو یہاں کے کلبوں کے بارے میں پتا ہوگا۔ مرد بیئر کی بوتلیں خالی کرتے اور گپیں لگاتے ہیں، اور عورتیں ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتی ہیں۔ میں اس چوکھٹے میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔''

پرمود کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اسے عجیب سا لگا۔ ''ہندوستان میں بھی زیادہ تر ایسا ہی ہے،'' وہ منھ ہی منھ میں بولا۔ لیکن ہندوستان کے سماجی حالات سے ماریا کو کوئی مطلب نہ تھا۔ نتھنوں سے دھواں نکالتے ہوئے وہ سامنے کے خالی صوفے کی طرف دیکھتی رہی۔

ماریا کا شوہر کنٹریکٹر تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ شہر میں نئی صنعتیں لگ رہی تھیں، نئی عمارتیں بن رہی تھیں؛ کاروبار کا اچھا چلنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ پرمود نے اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نزار زیادہ کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ پرمود خود کو عجیب سی صورت حال میں پا رہا تھا۔ نزار کو نظرانداز کر کے صرف ماریا سے باتیں کرنا ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ اس نے

Scanned with CamScanner

ماریا سے پوچھا، ”عقیل آنے والا تھا نا؟“

”ہاں، اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔ اکیلے آدمی کو جھٹ پٹ گھر سے آنے میں کیا مشکل ہوگی۔ پنٹی کے امریکہ جانے کے بعد وہ کاہل ہو گیا ہے۔“

عقیل جلدی آ جائے تو اچھا ہے، پرمود نے سوچا۔ کوئی بات کرنے والا تو ہوگا۔ تب ہی عقیل آ پہنچا۔ ”ہیلو بڈی!“ وہ زور سے بولا۔ ”تمھیں یہاں دیکھنے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ لگتا ہے ان دنوں میں تم لوگوں کی دوستی ہوگئی!“ اس نے پرمود اور ماریا سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح زور سے ہنس بول رہا تھا، پھر بھی کچھ اُکھڑا اُکھڑا معلوم ہو رہا تھا۔

”کیا حال میں پنٹی کا کوئی خط آیا؟“ ماریا نے عقیل سے پوچھا۔

”ہاں، پچھلے ہفتے آیا تھا،“ عقیل بولا۔

”کیا لکھا ہے؟“

”مزے میں ہے۔“

”کب واپس آ رہی ہے؟“

”اس خط میں تو کچھ نہیں لکھا۔ کہتی تھی جلدی میں خط لکھ رہی ہے، جلد ہی تفصیل سے لکھے گی۔ تمھارے پاس اس کا کوئی خط آیا؟“

”آٹھ دس دن پہلے آیا تھا۔ سمیر کو کیلیفورنیا کے پکچر پوسٹ کارڈ چاہیے تھے، وہ بھجوائے ہیں۔ پورا البم بھیج دیا ہے۔ بہت خوبصورت تصویریں ہیں۔ سمیر ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کہتا ہے، ہم بھی کیلیفورنیا جائیں گے۔“ وہ ہنسی اور نزار سے مخاطب ہو کر بولی، ”کیا خیال ہے، نزار، چلیں؟“

نزار اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔ ماریا ایش ٹرے کے کنارے پر اپنا سگریٹ گھماتی رہی۔ ماریا کو سگریٹ پر جمی ہوئی راکھ جھٹکنے کے بجائے اسے ایش ٹرے کے کنارے سے آہستہ آہستہ الگ کرنے کی عادت تھی۔ جیسے سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے پر راکھ کو بالکل جمع نہ ہونے دینا اسے ضروری محسوس ہوتا ہو۔

”اور بھی کچھ لکھا ہے پنٹی نے تمھیں؟“ عقیل نے ماریا سے پوچھا۔

ماریا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”نہیں، کچھ خاص نہیں،“ اس نے کہا اور پھر سامنے دیکھنے

Scanned with CamScanner

لگی۔

عقیل خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد نزار ماریا سے کہنے لگا، ''اچھا، میں کلب جاتا ہوں۔ آج مجید سے ضرور ملنا ہے۔''

عقیل بیچ میں بولا، ''اچھا، کلب جا رہے ہو؟ میں بھی چلتا تمھارے ساتھ۔ مجھے تم لوگوں کا کلب پسند ہے۔'' پھر اس نے پرمود سے پوچھا، ''تم کبھی گئے ہو انجینئروں کے کلب میں؟ ان مالدار لوگوں کا کلب بہت شاندار ہے، ہم پروفیسروں کے کلب سے۔'' پھر دوبارہ نزار سے بولا، ''مگر مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے آج۔ پرمود کو کیوں نہیں لے جاتے؟ اسے دکھاؤ نا اپنا کلب۔''

باپ رے! پرمود نے سوچا۔ اس نزار کے ساتھ جانا تو ایک سزا ہوگی! تب ہی ماریا نے عقیل سے کہا، ''اس بیچارے کو کیوں بھیج رہے ہو؟ نزار مجید سے کاروبار کی باتیں کرے گا اور پرمود کو بوریت ہوگی۔''

نزار کے جانے کے بعد پرمود سوچنے لگا: یہ عقیل مجھے اس کے ساتھ جانے کو کیوں کہہ رہا تھا؟ یہ ماریا کے ساتھ تنہا ہونا چاہتا تھا یا کیا؟ کیا اس کا ماریا کے ساتھ افیئر ہے؟ عقیل اب بھی بے چینی سے کسمسا رہا تھا۔ اس کا پورا دھیان بات چیت میں نہیں تھا۔ بیچ بیچ میں کوئی مزاحیہ فقرہ کہہ کر خود ہی زور زور سے ہنسنے لگتا۔ پھر اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، ''اچھا، میں چلتا ہوں۔ مجھے کل کے لیے کچھ کام مکمل کرنا ہے۔'' اپنی کی چین انگلی میں گھماتے ہوئے پرمود سے کہنے لگا، ''چلتے ہو تو تمھیں راستے میں اتار دوں؟''

''ارے، اتنی جلدی جا رہے ہو تم لوگ؟'' ماریا بولی۔ ''پرمود، تم تو ٹھہرو تھوڑی دیر۔''

عقیل باہر گیا۔ باہر سے اس کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ماریا کچھ دیر خاموشی سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر گویا اپنے آپ سے بولی، ''پوئر فیلو!'' پرمود نے اس کی طرف دیکھا، لیکن یہ سوچ کر چپ رہا کہ اس سے اس بات کی وضاحت چاہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ماریا نے بھی کچھ نہیں کہا۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا، پھر بھی دیوان خانے میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ ماریا اٹھی اور

Scanned with CamScanner

کمرے کے ایک کونے میں جا کر بتی جلائی، پھر دوسرے کونے میں جا کر دوسری بتی جلائی۔اس کی چال بڑی دلکش تھی۔

''یو نو، پرمود، آئی ایم گلیڈ یو آر ہیئر ٹوڈے!'' ماریا ہنس کر بولی۔ پرمود نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ماریا بولی، ''تم نہ ہوتے تو عقیل مجھ سے پتا نہیں کیا کیا باتیں پوچھتا۔ میں اسے ٹالنا چاہتی تھی۔'' پرمود کو لگا کہ وہ اپنی بات کی مزید وضاحت کرے گی، لیکن اس نے یہ بات وہیں چھوڑ کر کچھ اور تذکرہ شروع کر دیا۔''یہاں کیسا لگ رہا ہے تمھیں؟ دل لگ گیا یہاں؟''

اس کے بولتے بولتے ہی پرمود نے کہا، ''ماریا، تم ڈپارٹمنٹ میں ٹائپسٹ ہو، یہ سوچ کر عجیب سا لگتا ہے۔یو آر ناٹ مائی آئیڈیا آف اے ٹائپسٹ! یہ ظاہر ہے کہ تمھیں وہاں سے ملنے والے پیسوں کی ضرورت نہیں۔''

ماریا زور سے ہنسی۔''ارے، کام تو میں یونہی مزے کے لیے کر رہی ہوں۔انھیں کوئی اچھا انگریزی ٹائپسٹ نہیں مل رہا تھا۔ میں نے کہا میں آجاتی ہوں۔ ریگولر جاب کے طور پر نہیں۔ وہ ٹائپ کیے ہوئے کاغذوں کی تعداد کے حساب سے مجھے پیسے دیتے ہیں۔ مجھے بھی یہی ٹھیک لگتا ہے۔ پورے ہفتے باقاعدہ دفتر کا وقت پورا کرنے کی ذمے داری نہیں۔ جب جی چاہے جاؤں، اور ہفتے میں صرف تین دن۔اس طرح گھر سنبھالنے کا بھی وقت مل جاتا ہے۔''

باہر ماریا کے بچوں کے شور مچانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کان لگا کر سنتی رہی۔''بات یہ ہے،'' وہ بولی، ''اب میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔اور ان کے معاملوں میں الجھے رہنے سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔اس لیے میں نے یہ ٹائپسٹ کا کام لے لیا، تاکہ باہر کی دنیا سے کچھ تعلق قائم رہے۔''

''کافی وقت ہو گیا تمھیں یہاں؟''

''دس سال۔''

''دس سال۔اِٹس اے لانگ ٹائم!''

''یس، اِٹس اے لانگ ٹائم! سال گزرتے دیر نہیں لگتی۔ . .''

''سچ کہا۔سال گزرتے دیر نہیں لگتی۔زمین پر کسی بھی جگہ رہو، سال گزرتے جاتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''خلیج کے منہ میں واقع اس شہر میں... '' ماریا بڑبڑائی، ''سال گزرتے رہتے ہیں۔ بیونس آئرس، لاس اینجلس، بصرہ... فرام کانٹیننٹ ٹو کانٹیننٹ... '' پھر ایک دم زور سے ہنس کر بولی، ''اور تم ہندوستان میں... پھر امریکہ میں... اور اب یہاں! اب ہم یہاں ایک دوسرے سے بات کر رہے ہیں۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں!'' پل بھر رک کر اس نے کہا، ''مگر تم تو یہاں دس سال نہیں رہو گے؟''

''غالباً نہیں،'' پرمود نے کہا۔

''خلیج کے منہ پر... اس قدیم دریا کے کنارے... '' ماریا منہ ہی منہ میں بولی۔ ''دریا کے کنارے کھجور کے پیڑوں کی قطاریں... دریا کا پانی چڑھتا اترتا ہے... پیڑوں کو سالہا سال پانی ملتا رہتا ہے۔'' پرمود کی طرف دیکھ کر بولی، ''تمھیں معلوم ہے یہاں کے لوگ کتنے خوش نصیب ہیں۔ پیڑوں کو پانی دینے کی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی۔ دریا سے نہریں نکالی گئی ہیں۔ نیچے سمندر میں جوار اٹھتا ہے تو دریا کی سطح اونچی ہو جاتی ہے، نہروں سے پانی چھلک کر پیڑوں کو سینچتا ہے۔ اس کے بعد پانی کی سطح پھر نیچے ہو جاتی ہے۔ فطری طور پر، سادگی سے، اپنے آپ۔ سال بہ سال۔ پیڑوں کو بھی اندازہ نہیں ہوتا ہوگا کہ سال کس طرح گزرتے جاتے ہیں۔''

''دریا کے اُس کنارے پر کھجور کے بہت سے باغ ہیں نا؟'' پرمود نے کہا۔ ''میں ایک بار وہاں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کھجور کے پیڑ اچھے نہیں لگتے۔ بالکل ماٹھے اور سیدھے کھڑے رہتے ہیں۔ درختوں کا درخت پن نہیں ہوتا ان میں۔ ارجنٹینا میں کیسی گھنی جھاڑیاں اور پیڑ ہوتے ہیں۔ گنجان، ایک دوسرے میں گتھے ہوے۔ یہاں کھجور کے پیڑ جیسے ایک دوسرے سے خفا، روکھی زمین پر الگ تھلگ کھڑے رہتے ہیں۔''

''آر یو ہیپی ہیئر؟'' پرمود نے اچانک سوال کیا۔

ماریا نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر دھیرے سے ہنسی۔ ''اِٹس اے لائف۔'' کچھ پل دونوں خاموش رہے۔ پھر وہ پرمود کی طرف دیکھ کر دوبارہ ہنسی۔ ''اینڈ ناٹ اے بیڈ لائف!'' اس نے ہاتھ لہرا کر کمرے میں ہر طرف اشارہ کیا۔ ''میرے شوہر کا کاروبار اچھا چل رہا ہے، بڑا سا گھر

Scanned with CamScanner

ہے، بچے اچھے ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہم یوروپ میں گزارتے ہیں۔۔۔"

"اٹس اے نائس لائف،" پرمود نے کہا۔

"مجھے بتاؤ، پرمود، ہیپی نیس کسے کہتے ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں،" پرمود نے کہا۔ "ایک نظم کی سطر یاد آتی ہے: 'ہیپی نیس از اے برڈ'۔"

"کیسی سچ بات ہے!" ماریا بولی۔ "ہیپی نیس از اے برڈ۔ پنچھی اڑتا ہے، اڑ جاتا ہے۔ اور ہم اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ اِس ملک سے اُس ملک۔۔۔ اِس کانٹینیٹ سے اُس کانٹینیٹ۔۔۔ لیکن ہم بھی تو بے چین پنچھی ہی ہیں، کیوں، ہے نا؟"

"جس شاعر کی یہ نظم ہے، وہ اپنا وطن ترک کر کے امریکہ جا بسا۔ پھر بڑھاپے میں مرنے سے پہلے انگلینڈ لوٹ کر دو چار سال وطن میں گزارے۔"

"یعنی مرنے کے لیے گھر پہنچا؟ ہے نا؟۔۔۔ کیا میں بھی گھر جاؤں گی مرنے کے لیے؟۔۔۔ یا یہیں مر جاؤں گی۔۔۔ اس دریا کے دہانے پر۔۔۔"

پرمود نے سوچا کہ گفتگو کا رخ تبدیل کرنا چاہیے۔ "دس سال میں یہاں بہت تبدیلیاں دیکھی ہوں گی تم نے؟" اس نے کہا۔

"او، یس!" ماریا بولی۔ "شہر دھیرے دھیرے بدلتا گیا۔ اب تو بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ زندگی بدل رہی ہے۔ جب میں یہاں آئی تب کسی عورت کو گاڑی چلاتے دیکھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن اب تو بہت سی عورتیں گاڑی چلاتی دکھائی دیتی ہیں۔"

"ایسی تبدیلی ہر جگہ آتی ہے آہستہ آہستہ۔ اور پھر یہاں کی حکومت نئی ہے۔ بادشاہ کی معزولی کب ہوئی تھی، سنہ پچپن میں یا۔۔۔"

"چھپن میں۔"

"ہاں چھپن میں۔ اور اب سوشلسٹ حکومت ہے۔ کیا اس سے کوئی خاص بہتری دکھائی دیتی ہے؟"

"ہاں، بالکل۔ نئی حکومت نے بہت سے اچھے کام کیے ہیں۔ پہلے غریبی بہت تھی یہاں۔ اب غریبوں کی حالت عام طور پر بہتر ہو گئی ہے۔"

Scanned with CamScanner

''لیکن مجھے تعجب ہوا جب مجھے امریکن لٹریچر کا کورس پڑھانے کو دیا۔ میں نے سوچا، اس سوشلسٹ ملک میں امریکن لٹریچر؟''

''ارے، یہ تھرڈ ورلڈ کا سوشلزم ہے۔ روس یا ایسٹ یوروپ جیسی نظریاتی سخت گیری یہاں نہیں برتی جاتی۔ دراصل یہاں اتنی باریکی سے سوچ بچار نہیں کیا جاتا۔'' پھر ذرا رک کر ماریا بولی، ''لیکن یہ حالات آہستہ آہستہ بدلنے لگے ہیں۔ وزارت تعلیم کی طرف سے اگلے سال کے لیے نیا نصاب آیا ہے۔ مجھے اسٹینسل کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس میں تمھارا امریکن لٹریچر دکھائی نہیں دیا۔ اس کے بجائے انٹرنیشنل سوشلسٹ لٹریچر نام کا نیا کورس رکھ دیا گیا ہے۔ تو اب تمھیں اگلے سال ایمرسن کے بجائے گورکی پڑھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے، ٹھیک ہے؟''

''کیوں نہیں!'' پرمود نے کہا۔ ''لطف رہے گا۔''

ماریا نے اسے اپنی لائبریری دکھائی۔ کتابوں کے عنوان دیکھتے دیکھتے پرمود کو احساس ہوا کہ ریڈیکل بائیں بازو کی خاصی کتابیں ہیں۔ ماؤ کی لال کتاب بھی تھی۔ ماریا بولی، ''ارے، جب میں برکلے میں تھی تو مجھے اس سیاست سے بہت دلچسپی تھی۔ اجلاسوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ نزار سے میری ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ اُن دنوں نزار کو بھی سوشلسٹ تھیوری سے بہت گہرا شغف تھا۔ مجھے اس کے ساتھ یہاں آنے کا تصور بڑا ایکسائٹنگ لگا۔ ان دنوں امریکہ بے معنی دکھائی دیتا تھا۔ ویت نام کا زمانہ تھا وہ۔'' تھوڑا رک کر وہ بولی، ''اب ہم دونوں کی بھی ریڈیکل سیاست میں دلچسپی گھٹ گئی ہے۔'' پھر وہ زور سے ہنسی اور کہنے لگی، ''زمانہ بدل جاتا ہے نا!''

پرمود کو یاد آیا کہ سنہ سڑسٹھ اڑسٹھ میں برکلے جیسی جگہ ریڈیکل سیاست کا مرکز تھی۔ یہ اُسی ماحول میں پلی بڑھی ہے، اور اب اِس ملک میں آ کر خوشحالی کی زندگی گزار رہی ہے۔ ماؤ کی لال کتاب پڑی دھول کھا رہی ہے۔

ماریا کے بچے دوڑتے ہوئے گھر میں آئے۔ چھوٹا سمیر آ کر ماریا کے گلے سے لپٹ گیا۔ بڑا عماد ماریا کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ دونوں بچے پرمود کو اسی انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے بچے مہمانوں کو دیکھتے ہیں۔ ماریا نے مسکرا کر پرمود کو دیکھا اور سمیر کو اپنی طرف کھینچا۔ ''سمیر، یہ انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ سمجھے؟ اگر ان سے کہو تو یہ وہ نظم پڑھا دیں گے جو تمھاری کتاب میں ہے۔''

Scanned with CamScanner

سمیر کھڑا شرماتا رہا۔ ہلکے سے مسکراتے ہوئے پرمود نے ماریا کی طرف دیکھا۔ نزار اور عقیل کی موجودگی میں اس کے چہرے پر جیسا تناؤ تھا وہ اب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب وہ آسودہ اور پرسکون معلوم ہو رہی تھی۔ صوفے پر آرام سے بیٹھی تھی، اس کا بایاں ہاتھ سمیر کو آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ پرمود دیکھتا رہا؛ ادھیڑ عمر کو پہنچتی ہوئی لیکن اب بھی چست اور دلکش دکھائی دیتی ماریا، اور اس کے آس پاس دو عمدہ پرورش یافتہ، تمیزدار بچے۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے،'' پرمود کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

ایک بار پرمود کو احساس ہوا کہ چار پانچ دن سے شرما نے اس کے گھر کا چکر نہیں لگایا۔ پچھلی بار پرمود اس سے روکھے پن سے پیش آیا تھا، شاید یہ وجہ ہوگی، یا پھر کلاسیں شروع ہونے کی وجہ سے۔ ایک دن مکھر جی سے راستے میں مڈبھیڑ ہوئی تو پرمود نے پوچھا، ''کیوں، شرما جی کیسے ہیں؟ آج کل دکھائی نہیں دیتے۔''

مکھر جی بولا، ''ارے، آپ کو معلوم نہیں؟ شرما ہسپتال میں ہے۔ میں خود اسے سنیچر کو وہاں لے گیا تھا۔ اس کی پیٹھ میں اچانک سخت درد اٹھا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کی کوئی بیماری ہے۔''

''اوہ!'' پرمود نے کہا۔ ''کتنے دن ہسپتال میں رہنا ہوگا؟''

''ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ٹیسٹ ایکسرے وغیرہ چل رہے ہیں۔''

''دیکھنے جانا چاہیے۔ کیا آپ ایک آدھ دن میں جائیں گے؟''

''میں تو روز جاتا ہوں، جب بھی وقت مل جائے،'' مکھر جی نے کہا۔

اگلے دن کالج سے سیدھے ہسپتال چلیں گے، اس نے مکھر جی سے طے کیا۔

ہسپتال شہر کے ایک کونے میں تھا۔ بس سے وہاں پہنچنے میں خاصا وقت لگا۔ راستے میں پرمود سوچتا رہا: پردیس میں اکیلے ہسپتال میں پڑا رہنا بڑی بدقسمتی ہے۔ آدمی جب تک تندرست ہو، اسے کچھ پروا نہیں ہوتی، لیکن جب ایسی کوئی بات ہو جائے تو حالت قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ اپنے جیسے جوان آدمی کو شاید اس کا پورا احساس نہ ہو، لیکن شرما جیسا ڈھلتی عمر والا شخص بہت خطرے کی زد میں ہوتا ہے۔ پرمود کو وہ وقت یاد آیا جب امریکہ میں اس کا بایاں بازو ٹوٹ گیا تھا۔ اسے جوڑنے کے لیے آپریشن کرانا پڑا۔ آپریشن کے لیے لے جاتے ہوئے نرس نے پوچھا تھا، ''تمھارے گھر سے کوئی نہیں

Scanned with CamScanner

آئے گا؟''

''میرے گھر والے یہاں سے دس ہزار میل دور ہیں،'' اس نے بتایا۔ اسپتال میں پڑے پرمود کو دیکھنے دوست آیا کرتے؛ لیکن سب جلدی میں ہوتے، اپنی اپنی دنیا سے تھوڑا سا وقت نکال کر آئے ہوتے۔ وہ صرف پانچ دن ہسپتال میں رہا، اور وہ بھی امریکہ جیسے ملک کا ہسپتال۔ دنیا کے دور افتادہ کونے میں واقع کسی غیر ترقی یافتہ ملک کے ہسپتال میں داخل ہونا تو بڑا بھیانک ہوگا۔ یہاں تو قابل اعتماد طبی سہولتیں ملنا ہی دشوار ہو سکتا ہے۔ شرما کو یہاں کتنے دن ہسپتال میں رہنا پڑے، کون جانے۔

پرمود ہسپتال کے کوریڈور سے گزرتے ہوئے تجسس سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ہسپتال اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بھی کون سے اچھے ہسپتال ہوتے ہیں! اس حساب سے یہاں کی صورت حال کچھ زیادہ خراب دکھائی نہ دیتی تھی۔ پھر بھی، ہسپتال تو ہسپتال ہی ہے۔ دواؤں کی مخصوص ملی جلی بو، نرسوں کے سفید یونیفارم، کوریڈور میں قدموں کی چاپ، یہ سب چیزیں ذہن پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

پانچ چھ دن میں شرما کی حالت خاصی ابتر ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی باتوں میں اب بھی زندہ دلی تھی۔ ''ارے وینگورلیکر جی، آپ آ گئے؟'' وہ بڑے جوش سے بولا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹروں نے اب تک کچھ بتایا نہیں، لیکن شاید آپریشن کرانا پڑے۔

شرما کے بیڈ کے پاس بیٹھے بیٹھے پرمود آس پاس کے بستروں پر نظر ڈالتا رہا۔ اسے اداسی محسوس ہونے لگی۔ اسے لگا کہ اس کا تعلق شرما کی قابل رحم حالت یا ہسپتال کے ماحول سے نہیں؛ اس کی اداسی کی وجہ یہ خیال تھا کہ وہ کسی وقت خود کو بھی شرما کی طرح ہسپتال میں پڑا ہوا پا سکتا ہے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد پرمود جانے کے لیے اٹھا۔ شرما نے ٹھکر جی کو ایکسرے والے ڈاکٹر سے مل کر بات کرنے کے لیے روک لیا۔ ہسپتال سے باہر نکل کر چلتے چلتے پرمود کے ذہن میں اچانک سمندر پر جانے کا خیال ابھر آیا۔ یہاں آنے کے بعد کتنے ہی دن سے وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا مگر یہ معاملہ متواتر آج سے کل پر ٹلتا جا رہا تھا۔ اب مجھے اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ پھر اسے خود پر ہنسی آنے لگی۔ آخر اس نے سمندر پر جانے کے خیال کو اپنے ذہن پر کیوں مسلط کر رکھا ہے؟ جیسے وہ صرف

اسی مقصد کے لیے یہاں آیا ہو! کسی اجنبی جگہ اکیلے آ رہنے سے ایسی کوئی نہ کوئی پاگل پن کی بات دماغ میں گھس جاتی ہے۔ اب سے اس پاگل پن کو قابو سے باہر نہیں ہونے دینا چاہیے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے چھوٹے بچوں کو کسی بات کی ضد ہو جاتی ہے۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ ایک بار چھ سال کی عمر میں بڑی بہن کے ساتھ گھومنے نکلا تھا اور باغ میں پھسلنی پر پھسلنا چاہتا تھا۔ بہن بولی، باغ تو روز ہی جاتے ہیں، آج کیوں نہ دریا پر چلیں، بعد میں باغ بھی چلے جائیں گے۔ دریا پر گھومنے میں دیر ہو گئی اور اندھیرا چھانے لگا۔ بہن نے کہا، اب باغ کو چھوڑو، گھر چلتے ہیں، ورنہ ماں ناراض ہو گی۔ اس پر وہ بہن سے تکرار کرنے لگا۔ اس تکرار سے اکتا کر آخر بہن بولی، اچھا بابا، چلو، پانچ منٹ کے لیے پھسلنی پر کھیل لینا۔ باغ میں پہنچے تو مالی باغ کا پھاٹک بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بہن نے مالی سے کہا، میرا پرس یہاں گر گیا ہے، اسے ڈھونڈ نا ہے۔ مالی نے انھیں اندر جانے دیا۔ اس نے پھسلنی پر جا کر چار پانچ بار پھسل لیا۔ بہن پاس ہی اپنا پرس ڈھونڈنے کا ناٹک کرتی رہی۔ سنسان اندھیرے باغ میں، بہن کو ناراض کر کے، پھسلنے کی ضد پوری کر کے بھلا اسے کیا مزہ ملا؟ الٹا سنسان اندھیرے میں پھسل کر نیچے آتے ہوئے اسے عجیب سے خالی پن کا احساس ہوا تھا۔ اس بار بھی یہی ہو گا۔ اتنی ضد کے ساتھ، دوڑ دھوپ کر کے سمندر پر جائے تو شاید یہ خیال آئے گا کہ یہاں بھلا کیوں آیا۔ ایسے خیالات دماغ میں آنے کے باوجود، وسیع نیلے سمندر اور ہوا بھرے کھلے آسمان کی تصویریں اس کے تصور میں جھلکتی رہیں۔

دو بجے کا وقت تھا اور سخت دھوپ محسوس ہو رہی تھی؛ گرمیوں کا زور ابھی ٹوٹا نہ تھا۔ اس کے علاوہ آج غبار چھایا ہوا تھا؛ ہوا گرم اور ساکت تھی۔ ہوا سے بکھرے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پرمود کو ریت کی کھسکھساہٹ محسوس ہوئی۔ شہر کے اس سرے پر سنسان، کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے، فضا میں دھول زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ دوپہر کے اس وقت یہاں سڑکوں پر زیادہ آمد و رفت نہ تھی۔ سڑکیں بھی ہموار نہ تھیں۔ بعض جگہ تو بغیر تارکول کے، دھول بھرے کچے رستے تھے۔ چلتے چلتے پرمود کا دھیان سڑک کے کنارے ایک سنسان قطعے کی طرف گیا: کھجور کے سات آٹھ پیڑ۔ ایک پیڑ کے نیچے کالے برقعے والی ایک بوڑھی عورت اکڑوں بیٹھی گری ہوئی کھجوریں بین رہی تھی۔ اپنے آپ میں گم، زمین پر غور سے دیکھتے ہوئے وہ اپنے سوکھے ہوئے ہاتھوں کی لمبی انگلیوں سے ایک ایک دانہ

Scanned with CamScanner

اٹھا رہی تھی۔ پرمود ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دراڑیں پڑی بھوری زمین، کھجور کے پیڑوں کی جھریاں پڑی چھال، اور بڑھیا کا کالے برقعے میں لپٹا، سوکھا ہوا چہرہ۔ جلتے سورج کے نیچے کی دھندلی گرمی میں پرمود کو یہ منظر سراب سا معلوم ہوا۔ شاید اس کے سڑک پر رکنے کو محسوس کر کے، بڑھیا نے گردن اٹھا کر دیکھا: پل بھر کو اس کا ہاتھ رک گیا۔ پھر گردن جھکا کر دوبارہ کھجوریں بیننے میں مصروف ہوگئی۔ وہ اٹھے بغیر، اکڑوں بیٹھے بیٹھے پیر اٹھا کر ادھر اُدھر سرک رہی تھی۔ بالکل ایسا دلچسپ منظر تھا جیسے کوئی مرغی زمین پر پڑے دانے چگ رہی ہو۔ جب دھول میں دھنسے ہوئے جوتوں میں سے گرمی پرمود کے پیروں تک پہنچنے لگی تو وہ آگے چل پڑا۔

جمعرات کی شام کو فرانسوا نے پرمود کو اپنے فلیٹ پر بلا رکھا تھا۔ بیچ میں کچھ دن پرمود کی اس سے کچھ خاص بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ فرانسوا پرمود سے دوستی بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سینما جانے یا شام کو پینے کے لیے پرمود کا ساتھ اچھا رہے گا۔ ظاہر ہے پرمود کو بھی ساتھ کے لیے کوئی شخص چاہیے تھا۔ چلتے چلتے پرمود کو خیال آیا کہ کل جمعہ ہے، چھٹی کا دن: کیوں نہ فرانسوا سے سمندر پر چلنے کے لیے کہا جائے۔ اس کے پاس کار ہے، اس کا فائدہ اٹھایا جائے۔ ویسے تو وہاں جانا مشکل ہوگا۔

راستے میں پرمود کی ملاقات حمید سے ہوئی۔ انڈین کلب جانا قریب قریب ترک کرنے کے بعد سے وہ دونوں آپس میں نہیں ملے تھے۔ حمید نے اس سے کہا، ”چلو کہیں چل کر چائے پیتے ہیں۔“

پرمود بولا، ”میں ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ فرانسیسی پڑھاتا ہے۔ تم بھی چلو۔ اچھا جولی آدمی ہے۔“

دونوں ساتھ چل پڑے۔

”کیوں، تمھاری بیوی کب آ رہی ہے؟“ پرمود نے پوچھا۔

”ابھی کچھ ٹھیک نہیں،“ حمید بولا۔

”فلیٹ نہیں ملا؟“

”ہاں، ابھی نہیں ملا۔“

”ارے مجھ جیسے چھڑے آدمی کو فلیٹ مل گیا، تو تمھیں کیوں اتنی مشکل ہو رہی ہے؟ ذرا

Scanned with CamScanner

اِدھر اُدھر جا کر، چار لوگوں سے مل ملا کر کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تم نے دل لگا کر کوشش ہی نہیں کی ہوگی۔"

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ گردن گھما کر داہنی طرف کی دکانوں کے شوکیسوں کو دیکھتے ہوئے چلتا رہا۔ پرمود کو عجیب لگا کہ نیا شادی شدہ آدمی، اور بیوی کو اپنے پاس بلانے کے معاملے میں اتنا بے پروا۔

"ہیلو، کم اِن، کم اِن!" گھنی مونچھوں کے درمیان سے ہنستے ہوئے فرانسوا نے دونوں کا سواگت کیا۔ "او! او! ہیوا ین اُدر اِنڈین فرینڈ۔ گڈ، گڈ!"

فرانسوا کا فلیٹ یونیورسٹی ہاؤسنگ میں تھا۔ "مجھے اسی سال یہ فلیٹ ملا ہے،" فرانسوا نے کہا۔

پرمود نے فلیٹ پر غور سے نظر ڈالی۔ "بہت اچھا ہے،" اس نے کہا۔

"اس عمارت میں بہت سے ہندوستانی لوگ ہیں،" فرانسوا بولا۔

"ہاں، میں نے کئی ہندوستانی بچوں کو راہداری میں کھیلتے دیکھا تھا،" پرمود نے کہا۔ "تمھیں اس شور سے الجھن نہیں ہوتی؟"

فرانسوا ہنسنے لگا۔ "بچوں کے شور کی بات تو جانے دو؛ لیکن تم ہندوستانیوں کی ایک اور بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ روز صبح پونے چھ بجے ان سب کے ریڈیو اونچی آواز میں بجنے لگتے ہیں اور ٹھیک سوا سات بجے بند ہوتے ہیں! میری صبح سویرے کی نیند ٹوٹ جاتی ہے، اور جھنجھلاہٹ پر قابو پا کر جوں ہی میں بستر سے باہر آنے لگتا ہوں، ریڈیو بند ہو جاتے ہیں۔ جیسے ان سب نے میری نیند خراب کرنے کے لیے ہی سازش کر کے ریڈیو چلائے ہوں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے سویرے سب کے سب اتنی پابندی سے ریڈیو کیوں سنتے ہیں۔"

پرمود نے کچھ دیر سوچا، پھر زور سے ہنس پڑا۔ "ہاں، ٹھیک ہے! صبح پونے چھ بجے سے سوا سات بجے تک ریڈیو سیلون پر ہندی گانوں کا پروگرام ہوتا ہے۔ اسے سننے کے لیے سب ہندوستانی بے تاب رہتے ہیں۔"

فرانسوا کو ریڈیو سیلون کی 'عظمت' کا اندازہ نہ تھا، اس لیے بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

"ڈرنک لوگے؟" فرانسوا نے پوچھا۔ "میرے پاس کئی اچھی چیزیں ہیں۔ . . ابھی لا کر دکھاتا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

وہ اندر گیا اور دونوں ہاتھوں میں دو بوتلیں لہراتا ہوا باہر آیا۔ پھر انھیں ڈرامائی انداز میں تیز حرکت دیتے ہوئے آہستہ سے میز پر رکھ دیا۔ پھر ایک بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے بڑی روانی سے اور فخریہ لہجے میں اس مشروب کا نام لیا جو پرمود کی سمجھ میں نہ آیا، لیکن اسے اتنا معلوم ہو گیا کہ وہ کوئی عمدہ قسم کی فرنچ وائن تھی۔ فرانسوا بولا، ''پچھلی چھٹیوں میں فرانس گیا تھا تو خاص طور پر اس وائن کی بوتلیں ساتھ لایا۔ یہاں نہیں ملتی۔'' پھر دوسری بوتل کی طرف اشارہ کر کے بولا، ''اور بیروت سے لوٹتے وقت یہ ساتھ لایا تھا: لبنانی عرق!''

''عرق؟ نہیں چاہیے بابا!'' پرمود نے کہا۔ بے رنگ، پیپرمنٹ کے ذائقے والی یہ شراب پرمود نے ایک بار پی تھی۔ وودکا سے ملتی جلتی، لیکن اس سے کہیں زیادہ تیز، دو گھونٹ پیتے ہی انگلیوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

''ارے تم نے عراقی عرق پیا ہو گا۔ اس میں کچھ دم نہیں ہوتا،'' فرانسوا بولا۔ ''لبنانی عرق کی بات ہی اور ہے! اک بار پی کر دیکھو۔''

''سچ کہوں تو میں بیئر پینا پسند کروں گا،'' پرمود نے کہا۔ ''آئی ایم اے بیئر ڈرنکر بیسیکلی۔''

''بیئر!'' تھیٹر کے سے انداز میں ناک اوپر اٹھا کر فرانسوا بولا۔ ''یہاں میں تمھیں اتنی شاندار دو چیزیں پیش کر رہا ہوں، اور تمھیں بیئر چاہیے؟ ٹھیک ہے، بیئر بھی ہے میرے پاس، اگر تمھیں وہی چاہیے۔ بَٹ آئی پِٹی یو! (But I pity you.)'' پھر اس نے حمید سے پوچھا، ''تم تو عرق آزماؤ گے نا؟''

پرمود کو زور سے ہنسی آئی۔ ''حمید ڈرنک کرتا ہی نہیں!'' اس نے کہا۔

''نو ڈرنکس؟'' فرانسوا بھنویں چڑھا کر بولا۔ ''آئی پِٹی یو ایون مور! (I pity you even more.) تو تمھارے لیے پیپسی لاتا ہوں، ٹھیک ہے؟''

پھر سوچنے لگا کہ خود اسے کیا پینا چاہیے۔ اس انداز میں جیسے انتخاب کرنا مشکل ہو رہا ہو، سامنے رکھی دونوں بوتلوں کو باری باری دیکھتا رہا۔ پھر بولا، ''میرا خیال ہے مجھے عرق پینا چاہیے۔''

''تو تم لبنانی عرق کو فرانسیسی وائن پر ترجیح دیتے ہو؟'' پرمود نے کہا۔

فرانسوا ہنسنے لگا۔ ''سچ ہے! مطلب یہ ہے کہ فرنچ وائن ایک لحاظ سے اسپیشل ہوتی ہے۔ روز

Scanned with CamScanner

کے پینے کے لیے عرق ہی ٹھیک ہے۔ عرق گھر جیسا لگتا ہے۔ یو انڈرسٹینڈ؟''

''آئی تھنک آئی ڈو!'' پرمود نے کہا۔

فرانسوا ڈرنکس لانے اندر گیا۔ پرمود نے حمید سے مخاطب ہو کر کہا، ''ارے حمید، تم سگریٹ، ڈرنک وغیرہ کو چھوتے تک نہیں۔ اور یہاں کے لوگ جم کر عرق پیتے ہیں، ہیوی سموکنگ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو تو زیادہ پکا مسلمان ہونا چاہیے تھا۔ پھر ایسا کیوں ہے؟''

''یہی بات ہے!'' برابر رکھی میز پر زور سے گھونسا مارتے ہوئے حمید بولا۔ ''مجھے یہاں آ کر بہت صدمہ ہوا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں عربستان جا رہا ہوں، جو اسلام کا گھر ہے۔ یہاں مجھے حقیقی دین ملے گا، اسے زیادہ گہرائی سے سمجھ سکوں گا۔ اور دیکھتا کیا ہوں؟ ہر طرف باروں اور کلبوں میں لوگ اپنے سامنے بیئر کی بوتلیں سجائے بیٹھے ہیں۔ بھیانک بات ہے!''

''ہاں، اور مجھے داڑھی کا بھی خیال آیا،' پرمود نے کہا۔ ''ہندوستان میں تم مسلمان لوگ عام طور پر داڑھی رکھتے ہو۔ یہاں کوئی داڑھی والا مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔''

''ایسا ہی ہے،'' داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حمید بولا۔ ''میری داڑھی حقیقی اسلامی طریقے کی ہے۔ اس پر کبھی قینچی نہیں لگی۔ اور یہاں سڑک پر چلتے ہوئے لوگ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی انوکھا جانور دیکھ لیا ہو۔''

پرمود ہنسنے لگا۔ ''تو وہاں ہندوستان پاکستان میں تم لوگوں نے اسلامی طریقوں کو سنبھال کر رکھا ہے، اور یہاں اسلام کے اصل گھر میں انھیں جڑ سے ختم کر دیا گیا ہے۔''

''اور تمھیں اس سے خوشی ہوتی ہے؟'' حمید نے کہا۔ اس کی آواز تیکھی ہو گئی تھی۔

پرمود نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے جس بات کا مشاہدہ کیا وہ تم سے کہہ دی۔ اس سے مجھے خوشی یا ناخوشی کیوں ہو گی؟ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔ آئی ہوپ یو انڈرسٹینڈ!''

لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ حمید کے غصے کا رخ اس کی طرف نہیں تھا۔ ''یہ لوگ بھٹک گئے ہیں،'' حمید بولا۔ ''ان حالات کو بدلنا چاہیے۔ سب کچھ پھر سے اصل بنیاد پر تعمیر کیا جانا چاہیے۔'' وہ اسی غصے بھرے انداز میں بولتا رہا۔

Scanned with CamScanner

پرمود کو لگا کہ اس نے خواہ مخواہ یہ موضوع چھیڑ دیا۔ اس کے سلسلے میں اس کے جذبات بہت حساس ہیں۔ پرمود چپ بیٹھا رہا۔ کوئی اتنے جذباتی انداز میں بات کرنے لگے تو اسے شرمندگی سی ہونے لگتی تھی۔ حمید شروع شروع میں اونچی اور جارحانہ آواز میں بول رہا تھا، پھر اچانک اس کی آواز دھیمی اور ملتجیانہ ہوگئی۔ اپنے آپ سے بات کرنے کے سے انداز میں کہنے لگا: ''اب اگر یہ لوگ ایسا کرتے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ بہت بری بات ہے، بہت بری... دکھ کی بات ہے...'' اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرمود کو لگا کہ اس کے اندر غصے اور چڑ سے زیادہ دکھ اور افسوس کا احساس ہے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہو۔ اسی وقت فرانسوا ڈرنکس اور کھانے کی چیزیں لے کر باہر آیا اور پرمود کو چھٹکارے کا سا احساس ہوا۔

دو تین ڈرنکس کے بعد پرمود نے کہا: ''چلو، اب باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔''

فرانسوا بولا، ''یہیں کیوں نہ کھالیں؟ میرے ریفریجریٹر میں کچھ چیزیں رکھی ہیں۔ ایک دو ٹن کھول لیتے ہیں۔''

پرمود نے حمید کی طرف دیکھا۔ حمید بولا، ''ٹھیک ہے۔''

فرانسوا نے فرج سے چیزیں نکالیں۔ ان میں روسٹ چکن بھی تھا۔ پرمود حمید سے مخاطب ہو کر بولا، ''یہ تو تم نہیں کھاؤ گے، ہے نا؟''

''کھالوں گا،'' حمید بولا۔ ''اب کھانے لگا ہوں۔ کیا کروں! یہاں رہنا ہے تو تھوڑا بہت ایڈجسٹ تو کرنا ہی ہوگا۔ نہیں تو چکن کھانا ہی چھوڑنا ہوگا!... اور یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں۔''

''اچھی بات ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''ایڈجسٹ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ تمھیں معلوم ہے، پہلی یا شاید دوسری عالمی جنگ میں افریقہ میں لڑنے والے ہندو گائے کا گوشت کھانے لگے تھے۔''

کھانے کے آخر میں فرانسوا نے پنیر نکالا۔ پرمود نے کہا، ''فرانسوا، یہ بہت زیادہ ہو گیا۔ تم نے تو باقاعدہ فرنچ دعوت کر ڈالی۔ میرے حساب سے یہ بہت بھاری ہے۔''

فرانسوا خوش ہو کر بولا، ''کھانا ایک آرٹ ہے۔ اس کی قدر کرنا ضروری ہے۔ اور یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہم تو وائن بھی نہیں پی رہے۔ اچھی طرح تیار کیا گیا اصل فرانسیسی کھانا تو بہشت کا سا تجربہ ہوتا ہے۔'' پھر کہنے لگا، ''دکھ کی بات یہ ہے کہ فرانسیسی بھی اب بھولتے جا رہے ہیں کہ اصل فرانسیسی کھانا کیا

ہوتا ہے۔ یہاں شہر کے نزدیک ایک فرانسیسی کمپنی کا کیمپ ہے۔ میں کئی بار وہاں کھانے پر جا چکا ہوں۔ لیکن وہاں کسی میں ڈھنگ سے کوئی کام کرنے کا شوق دکھائی نہیں دیا۔''

پرمود کو خیال آیا کہ اتنے سال لبنان میں رہنے کے بعد بھی اس کے ذہن میں فرانسیسی کلچر کا وہی قدیم تصور جما ہوا ہے۔ اس عرصے میں فرانسیسی لوگ بدل گئے ہوں گے، ماڈرن ہو گئے ہوں گے؛ لیکن فرانسوا کے حساب سے وہی پرانا، ست رو کلچر اصل چیز ہے۔

فرانسوا نے حمید سے بات چیت کرنے کی کچھ کوشش کی؛ لیکن ان دونوں کا معاملہ جما نہیں۔ پھر اس نے پرمود کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور بولا، ''لگتا ہے مسز نزار سے تمھاری خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔''

پرمود مسکرایا لیکن کچھ بولا نہیں۔

کچھ دیر بعد فرانسوا اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا، ''ارے نو بجنے والے ہیں۔ مجھے خبریں سننی ہیں۔'' اس نے ریڈیو لگایا۔ ''نو بجے مونا کو کے ریڈیو مانٹی کارلو پر فرانسیسی خبریں آتی ہیں۔'' خبریں شروع ہوئیں تو وہ غور سے سننے لگا۔ تھوڑا بہت پرمود کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ پہلے لبنان کی کوئی خبر تھی۔ پھر خبریں ختم ہونے سے پہلے ہی فرانسوا نے ریڈیو بند کر دیا اور بولا، ''بیروت کی کوئی خاص خبر نہیں ہے آج۔'' معلوم ہوتا تھا اسے باقی دنیا کی خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

روانہ ہوتے وقت پرمود نے اگلے دن سمندر پر جانے کا موضوع چھیڑا۔ فرانسوا نے کہا، ''اگر تمھارا اتنا ہی اصرار ہے تو چلتے ہیں۔ مجھے کل کوئی کام نہیں ہے۔''

انھوں نے اگلی صبح وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ پرمود نے حمید سے پوچھا، ''تم چلو گے؟''

حمید کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ ''کتنے بجے لوٹو گے تم لوگ؟'' اس نے پوچھا۔

پرمود نے فرانسوا کی طرف دیکھ کر کہا، ''لنچ ٹائم تک واپس آ جائیں گے، کیوں؟ جانے آنے میں زیادہ وقت تو نہیں لگنا چاہیے۔''

''پھر ٹھیک ہے،'' حمید بولا۔

''کیوں، تمھیں کوئی کام ہے کیا؟'' پرمود نے پوچھا۔

حمید بولا، ''کل جمعہ ہے نا۔ مجھے نماز پڑھنے جانا ہے، بارہ ساڑھے بارہ بجے۔''

Scanned with CamScanner

دوسرے دن وہ صبح نو بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ ہوا کچھ نم آلود اور دھندلی تھی۔ فرانسوا بولا،
''جنوب مشرق کی طرف سے بڑی سڑک فاؤ نامی گاؤں کی طرف جاتی ہے۔ یہی سڑک آگے کہیں سمندر پر نکلتی ہے۔''

سڑک دریا سے دور لیکن کم وبیش اس کے متوازی تھی۔ کنارے پر کھجور کے پیڑوں کے جھنڈ ہونے کی وجہ سے دریا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پیڑوں اور سڑک کے درمیان بنجر زمین تھی۔ سڑک کے داہنی طرف یہی بنجر زمین دور تک پھیلی نظر آ رہی تھی۔ کچھ مقامات پر نمک کی سفید تہہ جمی ہوئی تھی۔ سمندر کے پانی کے یہاں تک آنے کا تو کوئی سوال نہ تھا؛ یہاں کی زمین ہی شورزدہ معلوم ہوتی تھی۔

فاؤ پیچھے رہ گیا۔ اس کے بعد کچی سڑک شروع ہوگئی۔ گارے کے پلستر والے مکان دکھائی دیے۔ فرانسوا بولا، ''یہاں کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔'' اس نے حمید سے پوچھا، ''تمھیں تھوڑی بہت عربی آتی ہے؟''

حمید نے کہا، ''ہاں۔''

''پھر تم ہی بات کرنا۔ میری عربی ان کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آتی۔''

ایک شخص راستے پر جاتا دکھائی دیا تو فرانسوا نے گاڑی روک لی۔ حمید نے کچھ کہا، لیکن شاید اس شخص کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر فرانسوا نے اپنی عربی میں سوال کیا۔ کچھ کوشش کرنے کے بعد فرانسوا کو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوئی۔ پرمود نے حمید سے پوچھا، ''کیوں بھئی، تم تو کہتے تھے تمھیں عربی آتی ہے، اور تمھاری بات اس آدمی کی سمجھ میں نہیں آئی!''

حمید بولا، ''میری عربی بہت اچھی ہے۔ اِن فیکٹ، اِٹ اِز ٹو گڈ فار دیز پیپل! (In fact, it is too good for these people.) میں نے کلاسیکی عربی پڑھی ہے، قرآن کی فصیح عربی۔ ان لوگوں کی بولی الگ طرح کی ہے۔''

اس شخص نے بتایا تھا کہ آگے فوجی علاقہ ہے: وہاں جانا منع ہے۔ پرمود نے کہا، ''یعنی سمندر پر نہیں جا سکیں گے؟ بیچ میں سے لوٹنا پڑے گا؟ یہ تو بلاوجہ کی مشکل پڑ گئی۔''

''جہاں تک جا سکتے ہیں وہاں تک جا کر دیکھتے ہیں،'' فرانسوا بولا۔

''زیادہ وقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ممکن نہیں ہے واپس چلتے ہیں،'' حمید کلائی کی

Scanned with CamScanner

گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

پھر ایک پھاٹک آیا۔اس کے دونوں طرف تاروں کی باڑ تھی۔فرانسوا نے پھاٹک کے پاس گاڑی روکی۔ پھاٹک پر موجود سپاہی سے بات کی۔ پھر پرمود اور حمید سے کہا،''چلو، افسر سے بات کرتے ہیں۔''

ایک سپاہی انھیں افسر کے کمرے میں لے گیا۔تینوں بیٹھ گئے۔افسر نے انگریزی میں ان سے شناختی کارڈ طلب کیے۔تینوں نے اپنے کارڈ میز پر رکھ دیے۔افسر نے دیکھا:ایک فرانسیسی اور دو ہندوستانی۔اس نے فرانسوا سے مخاطب ہو کر کہا،''کیوں آئے ہیں اس طرف؟''

پھر افسر نے ایک سپاہی کو بلا کر کچھ حکم دیا۔پھر ان تینوں سے بولا،''آپ اپنی گاڑی آگے نہیں لے جا سکتے۔میں آپ کو جیپ میں لے چلتا ہوں۔''

جیپ میں بیٹھتے ہوئے پرمود کو خیال آیا کہ اس کا کیمرا فرانسوا کی گاڑی میں رہ گیا ہے۔لیکن پھر فوراً ہی سوچا، کیمرے کو رہنے ہی دیا جائے، خواہ مخواہ اور مشکل اٹھانے سے فائدہ۔

کھجور کے پیڑوں کے بیچ سے ناہموار سا راستہ نکلتا تھا۔جیپ ہچکولے کھاتی چل رہی تھی۔ سورج چڑھ آنے سے گرمی بڑھ گئی تھی۔ پرمود کو لگا کہ یہاں ہوا زیادہ مرطوب ہے۔پسینے سے چپچپاتے بدن کو جیپ کے ہچکولے لگنے سے پرمود کو جھنجھلاہٹ محسوس ہونے لگی۔گاڑی دریا کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔آخر ڈرائیور نے ایک بند پر گاڑی چڑھائی اور اس کے دوسری طرف دریا کا کنارا دکھائی دیا۔

تینوں نیچے اتر کر افسر کے ساتھ بند پر کھڑے ہو گئے۔دریا پر نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسر بولا،''وہ وہاں ہے سمندر۔میں آپ لوگوں کو یہیں تک لا سکتا تھا۔اس کے آگے جانا ممکن نہیں۔''

پرمود نے سمندر کی سمت نظر ڈالی۔ وہ شط العرب کے دہانے کے نزدیک آ پہنچے تھے؛ دور سمندر کا پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا۔پھیلی ہوئی چادر کی طرح سمندر کا پانی ساکت تھا۔ بھاری، نم ہوا کے باعث سمندر کا پانی بے چمک، راکھ کے رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ پرمود دیکھتا رہا۔

''لو، یہ رہا تمھارا سمندر!'' فرانسوا نے ہنستے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

مایوسی بالکل صاف تھی۔ سمندر نظر کے گھیر میں تھا لیکن اس کے پاس جانا ممکن نہ تھا۔ نیلا پانی، اٹھتی ہوئی لہریں، ریتیلا ساحل، چٹانیں، ان میں سے کچھ بھی تصور سے حقیقت میں تبدیل نہ ہو سکا

Scanned with CamScanner

تھا۔ افسر بولا، ''آگے کچھ خاص نہیں۔ بس ایسا ہی ہے۔ دریا کا دہانہ ہونے کی وجہ سے دلدلی زمین ہے۔''

پرمود نے شط العرب کے دوسرے کنارے کی طرف نظر دوڑائی۔ اونچے نرسلوں کے گھنے جھنڈ، اور دلدلی زمین کا سونا پن۔ ''کیا ہم اُس طرف جاسکتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اُس طرف ایران ہے،'' افسر ہنس کر بولا۔ اُس پار دوسرا ملک — نرسلوں سے بھری وہ زمین پرمود کو اجنبی سی محسوس ہونے لگی۔

دریا کا پانی ٹیالا اور کھاری دکھائی دیتا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہاں وہ سمندر میں گرتا تھا۔ دریا پر سے پرمود نے بند کے قدموں کی طرف نگاہ پھیری۔ دریا کا کنارہ اُتھلا اور کیچڑ بھرا تھا۔ وہاں دیکھتے دیکھتے پرمود کی نظر ایک قسم کے جانداروں پر پڑی۔ وہ غور سے انھیں دیکھنے لگا۔ بھورے رنگ کے چھپکلی کی شکل کے یہ جاندار کھلی کیچڑ میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ وہ کیچڑ میں رینگ رہے تھے، کیچڑ میں چھلانگیں لگا رہے تھے، بیچ بیچ میں پانی میں تیر رہے تھے اور زمین پر مینڈکوں کی طرح اُچھل اُچھل کر چل رہے تھے۔ پرمود کو ان سے گھن کے ساتھ ساتھ عجیب سا تجسس بھی محسوس ہوا۔ یہ رینگنے والے جانور ہیں یا مچھلی کی کوئی قسم یا کچھ اور، وہ سوچنے لگا۔ بہت قدیم، ابتدائی قسم کے جاندار معلوم ہوتے تھے۔ لگتا تھا ان کا ارتقا بیچ میں رک گیا ہے۔ پانی، کیچڑ، زمین، ہر جگہ جینے والا وجود تھا ان کا، حیوانی زندگی کے سخت جان، قدیم نمونے۔ ان کی طرف دیکھتے دیکھتے پرمود کو زور سے کراہت محسوس ہوئی۔

ایک طرف نرسلوں سے بھرا سنسان ساحل، سست پڑا غلیظ دریا سمندر کے ساکت، بے جان پانی میں گرتا ہوا، اور سامنے کیچڑ میں رینگتے ہوئے کریہہ جاندار — اور وہ نم آلود نمکین ہوا میں بند پر کھڑا دیکھتا ہوا۔ کبھی کبھی انسان ذرا بھی ہلنے جلنے کے قابل نہیں رہتا، پرمود کو احساس ہوا۔

''چلو، اب واپس چلتے ہیں،'' حمید گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

افسر نے انھیں ان کی گاڑی کے پاس لاکر اتار دیا۔ فرانسوا نے گاڑی شہر کی طرف موڑ لی۔

''چلو، سمندر کی سیر تو ہوگئی!'' وہ بولا۔

حمید تیوری چڑھا کر کہنے لگا، ''خواہ مخواہ ہی آئے اس طرف! دیکھنے کے قابل کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی اچھے پکنک اسپاٹ پر جانا چاہیے تھا۔''

Scanned with CamScanner

فرانسوا نے کہا، ''ویسے وہ افسر اچھا آدمی تھا۔ ہمیں اتنے اہتمام سے اپنی جیپ میں وہاں تک لے کر گیا۔''

پرمود کچھ سوچ کر بولا، ''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس میں ایک عجیب بات تھی۔ ہم ایک لحاظ سے اس کے مہمان تھے، دوسرے لحاظ سے اس کے قیدی! اس کے ساتھ گھومتے ہوئے ہمیں اِدھر اُدھر آنے جانے یا تصویریں کھینچنے کا موقع ملنا ممکن نہ تھا۔''

فرانسوا ہنسنے لگا۔ ''یہ تم نے خوب نکتہ نکالا۔''

اچانک پرمود پھٹ پڑا۔ ''سالی کیا مصیبت ہے! سمندر کو قید کر رکھا ہے!''

فرانسوا اور حمید خاموش رہے۔ غالباً انھیں اس بات پر چراغ پا ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

تینوں کو کچھ تھکن محسوس ہو رہی تھی، اس لیے بات چیت رک گئی تھی۔ ہونٹوں میں سگریٹ اٹکائے فرانسوا گاڑی چلاتا رہا۔ پرمود کو کچھ عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی؛ سمندر کو قید میں دیکھنے کی وجہ سے، یا دریا کے دہانے کے پاس رینگنے والے ان احمق جانداروں کی وجہ سے، اس بارے میں سوچنے کی توانائی وہ خود میں نہیں پا رہا تھا۔

حمید بے تاب تھا۔ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ ''لگتا ہے پہنچتے پہنچتے دیر ہو جائے گی،'' وہ بڑبڑایا۔

پرمود نے فرانسوا سے کہا، ''شہر پہنچتے ہی پہلے اسے مسجد کے پاس اتار دینا۔''

فرانسوا نے گاڑی مسجد کے پاس روکی تو اچانک پرمود کو خیال آیا کہ اس نے کبھی مسجد میں جا کر نہیں دیکھا؛ اب حمید ساتھ ہے تو کیوں نہ مسجد میں جائے۔ یہ بات سن کر حمید بولا، ''ہاں ہاں، بالکل۔''

وسیع ہال میں پرمود ایک کونے میں جا بیٹھا۔ حمید نماز پڑھنے کے لیے ایک صف کے کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اونچے منبر سے امام گہری، گمبھیر آواز میں نماز پڑھا رہا تھا۔ لوگ صفوں میں نماز پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھ رہے تھے۔ گنبد کے نیچے ہال بہت ہوادار تھا؛ ہندو مندروں جیسا تاریک، گھٹن بھرا ماحول نہیں تھا۔ لیکن اس میں ایک طرح کا سپاٹ پن محسوس ہوتا تھا۔ دیواروں کے اوپری حصوں میں قرآن کی آیتیں خطاطی کے انداز میں لکھی ہوئی تھیں۔ عیسائیوں کے گرجوں جیسی خوبصورت آرائش یہاں دکھائی نہ دیتی تھی۔

Scanned with CamScanner

پرمود حمید کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں، وہ کسی ہپناٹائزڈ شخص کی طرح نماز کی حرکات انجام دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی یکسوئی اور تیکھے پن کا تاثر تھا: جیسے بڑی سہولت سے وہ کسی اور ہی دنیا میں گم ہو گیا ہو۔ پرمود تعجب اور تحسین کے انداز سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ یہ اتنی آسانی سے کس طرح ایسا کر سکتا ہے؟ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اسے ایک لحاظ سے حمید پر رشک آ رہا تھا، لیکن دوسری طرف یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ خود کو اس طرح کسی دھیان کے حوالے کر دینا اس سے ممکن نہیں ہوگا۔ اس تیکھی یکسوئی میں کھوئے ہوئے حمید کے ذہن کو کبھی قید کیے ہوئے سمندر یا دریا کے دہانے کے پاس رینگتے جانداروں کا خیال چھو بھی نہ پائے گا۔ نماز میں مشغول جماعت سے الگ بیٹھے پرمود کے ذہن پر خاردار تاروں میں بندھے سمندر اور کیچڑ میں لوٹتے ہوئے جانداروں کے خیالات آ جا رہے تھے۔ وہ حمید کی نماز پوری ہونے کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

4

یونیورسٹی کی بس کالج کے احاطے میں رکی اور پرمود نیچے اترا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے — بھاری دکھائی دیتے کالے بادل۔ یہ سوچنے میں کوئی حرج نہ تھا کہ گرمیاں ختم ہو رہی ہیں اور جاڑا شروع ہو رہا ہے۔ ہوا میں ابھی ٹھنڈک نہ تھی، لیکن بارش یقیناً آنے والی تھی۔ پرمود نے سنا تھا کہ گرمیوں کے خاتمے پر یہاں تھوڑی بہت بارش ہوتی ہے، اور پھر جاڑوں سے بہار تک وقفے وقفے سے ہوتی رہتی ہے۔ اس کے یہاں آنے کے بعد اب تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ آج ضرور ہوگی، اس نے سوچا۔ ان دنوں ہوا نم اور ٹھہری ہوئی ہو رہی تھی: آج آخرکار بادل بارش برسانے میں سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔

عمارت میں داخل ہوتے ہوئے پرمود خود کو تازہ دم، چست اور پرجوش محسوس کر رہا تھا۔ اپنی طبیعت کی اس جولانی کے سبب کی تلاش میں اسے خیال آیا کہ آج چار پانچ دن بعد ماریا سے ملاقات ہوگی۔

ٹائپ رائٹر کی اوٹ سے سر اٹھا کر ماریا اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ''ہیلو پرمود!'' وہ بولی۔ ''کئی دن دکھائی نہیں دیے۔ کیا طبیعت ٹھیک نہیں تھی؟''

Scanned with CamScanner

''نہیں نہیں! امریکہ سے میرا بھیجا ہوا ٹرنک پہنچ گیا۔ اسے لینے بغداد گیا تھا۔ کسٹم سے چھڑانے کے لیے وہاں جانا پڑا۔''

''اچھا! یعنی تمھارا گھربار اب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''گھربار کیسا! زیادہ تر کتابیں ہیں۔ لیکن یہ اچھا ہوا کہ وہ آخرکار پہنچ گئیں۔ اب کچھ لکھنا پڑھنا ہو سکے گا۔''

''اچھا خیال ہے — اور کتابیں پہنچی بھی صحیح وقت پر ہیں،'' ماریا کھڑکی سے باہر بادلوں سے ڈھکے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بارش کے دنوں میں یہاں گھر میں بیٹھ کر پڑھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ راستے کیچڑ سے بھر جاتے ہیں اور باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

اس دن دوپہر کو لوٹتے ہوئے ماریا نے اسے لفٹ کی پیشکش کی۔ ''بس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بارش کسی بھی وقت شروع ہو سکتی ہے، اور پھر تم پھنس جاؤ گے۔ جب بارش ہوتی ہے تو بہت تیز ہوتی ہے۔'' یونیورسٹی کی بسیں ہر ایک گھنٹے بعد شہر کے لیے نکلتی تھیں۔ ایک بس چھوٹ جاتی تو گھنٹہ بھر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی دوسرے لیکچرر پرمود کو لفٹ دے دیتے؛ لیکن ایسا کلاس ختم ہونے کے وقت ہی ہوتا تھا۔ بیچ میں جانے والا کوئی شخص مشکل ہی سے ملتا تھا۔ ماریا کی بات الگ تھی؛ وہ کبھی بھی دفتر سے اٹھ سکتی تھی۔ پرمود کئی بار ماریا کے گھر گیا تھا؛ ماریا نے کئی بار اسے لفٹ دی تھی۔ اس نے سوچا آج اسے رسمی طور پر پانچ منٹ کے لیے فلیٹ میں آنے کی دعوت دے گا۔ اس نے انکار بھی کر دیا تو کوئی حرج نہیں۔

عمارت کے پاس گاڑی رکی تو پرمود نے اس سے کہا۔ وہ اسٹیئرنگ ویل پر انگلیاں سیدھی کرتے ہوئے کہنے لگی، ''ٹھیک ہے، پانچ منٹ کے لیے چلتی ہوں۔ دیکھوں تمھارا انڈین گھر کیسا ہے۔''

''ارے وہاں دیکھنے کو کیا ہے! کچھ خاص نہیں۔ اور وہ بھی اکیلے آدمی کا گھر! سب بکھرا ہوا اِدھر اُدھر۔ تمھیں اس بے ترتیبی کو نظرانداز کرنا پڑے گا۔''

زینہ چڑھتے ہوئے پرمود کو خیال آیا کہ صبح نکلتے وقت گھر کو کچھ جھاڑ پونچھ لیا ہوتا تو اچھا رہتا۔

کرسی پر بیٹھ کر ماریا اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے بولی، ''واہ! تمھیں یہاں رہتے ہوئے

Scanned with CamScanner

تھوڑے ہی دن ہوے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی رہ رہا ہے۔ زندگی دکھائی دیتی ہے یہاں!''

پرمود ہنستے ہوے بولا،''ہم ہندوستانی لوگ زیادہ تر اسی طرح بے ترتیبی میں رہتے ہیں۔ امریکیوں جیسی صفائی پسندی ہمارے خون میں نہیں ہے۔''

''برکلے میں میرا ایک ہندوستانی دوست تھا؛ اس کا اپارٹمنٹ بھی اسی طرح ہوتا تھا۔ کیا نام تھا اس کا—'' اس نے آنکھیں بند کر کے پل بھر کو سوچا۔''جانے دو۔ لیکن ایک طرح سے اسی طرح رہنا ٹھیک ہے۔ گھر رستا بستا معلوم ہوتا ہے۔ ارجنٹینا میں ہمارا پرانا بڑا گھر اسی طرح بے ترتیب رہا کرتا تھا۔'' پھر دیوار پر پرمود کے لگائے ہوے پوسٹر دیکھ کر بولی،''پھر بھی خاصی آرائش کر لی تم نے۔''

''ارے، پوسٹر لگانے میں کیا ہے۔ پوسٹر اچھے رہتے ہیں۔ بس رول کھول کر لگا دیے اور ہو گئی آرائش! مکان تبدیل کرتے وقت اتار کر لپیٹ لیے اور ساتھ لے گئے۔ وزن کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں تو اس معاملے میں ایکسپرٹ ہو گیا ہوں۔''

''یہ تم لوگوں کا دیوتا گانیش ہے نا، یہ ہاتھی کے سر والا؟ اور یہ اس تصویر میں کون ہے؟''

''وہ کرشن ہے، اور اس کے ساتھ اس کی محبوبہ رادھا۔''

''اور اس کے ہاتھ میں بانسری ہے نا؟''

''ہاں۔ اس تصویر میں کرشن اسے بانسری بجانا سکھا رہا ہے۔''

''ہاؤ نائس! بڑا عمدہ خیال ہے!'' پھر بولی،''تم کافی مذہبی معلوم ہوتے ہو۔''

''میں، اور مذہبی؟ وہ کیسے؟''

''دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی تصویریں جو لگا رکھی ہیں۔''

''ارے نہیں!'' پرمود ہنسنے لگا۔''یہ تصویریں تو صرف رونق کے لیے ہیں۔ دیوار پر رنگین تصویریں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔''

ماریا ایک دم کرسی سے اٹھ کر بائیں طرف کی دیوار پر لگی تصویر کے پاس جا کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔ 'تانترک' تصویر تھی: ڈراؤنے چہرے والا ایک دیوتا، دونوں طرف چار اور چہرے، دونوں پہلوؤں پر نکلے بے شمار ہاتھ، بانہوں میں ایک دیوی کو لیے، دیوی کا چہرہ بھی ڈراؤنا؛ دیوتا کے بائیں

Scanned with CamScanner

پیر کے نیچے کچلا ہوا ایک راکھشس اور داہنے پیر کے نیچے ایک راکھشسی۔ تصویر کے تیز نارنجی، ہرے، نیلے، جامنی رنگ آنکھوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ ماریا بولی، ''غیر معمولی تصویر ہے۔ کچھ جارحانہ، سپر ہیومن قسم کا تاثر دیتی ہوئی، بھیانک، پھر بھی اپنی طرف کھینچتی ہوئی۔ اسے تانترک آرٹ کہتے ہیں نا؟''

''ہاں۔ لگتا ہے تم ان چیزوں کے بارے میں کافی کچھ جانتی ہو!''

''مجھے انڈین کلچر سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ لیکن کبھی اس کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب تم سے سیکھ سکتی ہوں۔ مجھے ان دیوی دیوتاؤں کے بارے میں جاننے کا بہت تجسس ہے۔''

پرمود ہنسنے لگا۔ ''سچ بتاؤں، مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں۔'' برابر کے شیلف سے ایک کتاب نکال کر ماریا کو دکھاتے ہوئے اس نے کہا، ''میں انڈین کلچر کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں وہ میں نے اس قسم کی پنگوئن بکس سے اخذ کیا ہے۔ عجیب بات ہے نا؟''

''اور یہ ہے تمھارا امریکی ٹرنک!'' اچانک ماریا زور سے بولی۔

کونے میں رکھے ٹرنک کی طرف دیکھ کر پرمود نے کہا، ''ہاں، راستے میں اس میں اتنے گڈھے پڑ گئے، پھر بھی آخر کار پہنچ ہی گیا! کل رات بغداد سے لوٹا تو اسے کھولا تک نہیں۔ ٹھیک سے دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ صرف تالا کھول کر اندر جھانک کر دیکھا تھا۔''

''اتنے بڑے ٹرنک میں صرف کتابیں ہیں؟ پھر تو بہت ساری ہوں گی۔ دیکھتے ہیں کیا کتابیں ہیں۔''

پرمود نے ٹرنک کا ڈھکنا اٹھایا۔ دو چار کتابیں الٹ پلٹ کے دیکھنے کے بعد ماریا بولی، ''فلسفے وغیرہ کی کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔ تمھیں اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی ہے؟''

''ہے تھوڑی بہت۔''

''تمھیں دیکھ کر لگتا بھی ہے! سارا وقت خود میں کھوئے رہتے ہو!''

پرمود کچھ بولے بغیر دو ایک کتابیں اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر ایک طرف کی کتابیں ہٹا کر اس نے ان کے نیچے رکھا ٹائپ رائٹر باہر نکالا۔ اسے میز پر رکھ کر کہنے لگا، ''اور یہ میرا ٹائپ رائٹر! جتنا انتظار مجھے کتابوں کا تھا اتنا ہی ٹائپ رائٹر کا بھی تھا... اب مجھے چھوٹی موٹی چیزیں ٹائپ کرنے کے لیے

Scanned with CamScanner

تمھیں زحمت نہیں دینی پڑے گی۔"

ماریا ٹائپ رائٹر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی، "عمدہ ہے۔" پھر پرمود کی طرف دیکھ کر پوچھا، "لیکن کسٹم والوں نے اسے پاس کیسے کر دیا؟"

"انھوں نے دیکھا ہی نہیں۔ میں نے ٹرنک کا ڈھکنا کھولا تو انسپکٹر نے پوچھا، کتابیں ہی ہیں نا سب؟ میں نے کہا، ہاں۔ ایسی بات نہیں کہ میں کچھ چھپانا چاہتا تھا: ٹائپ رائٹر اور ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں بھی تھیں، لیکن یہ بات مجھے اتنی اہم نہیں لگی۔ استعمال کیے ہوئے پورٹیبل ٹائپ رائٹر پر کتنی ڈیوٹی لگ سکتی تھی! اور پھر میں واپس جاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے ہی جاؤں گا۔ میں نے سوچا، اب یہ سب تفصیل کیا بتاؤں۔ انسپکٹر نے بھی میرے پروفیسر ہونے کا لحاظ کر کے چیک کیے بغیر مجھے جانے دیا۔"

ماریا ہنسنے لگی۔ "بے پروا لوگ ہیں! تم آسانی سے چھوٹ گئے۔ دراصل اب اس ملک میں ٹائپ رائٹر لانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔"

پرمود ٹائپ رائٹر کا ڈھکنا کھول کر حروف پر انگلیاں پھیر رہا تھا، یہ بات سن کر اس کا ہاتھ رک گیا۔ "ٹائپ رائٹر نہیں لا سکتے؟ کیا مطلب؟" اس کی انگلی نے ایک کی پر دباؤ ڈالا؛ وہ اچھلی اور ٹائپ کرنے کی جگہ جا کر اٹک گئی۔

"پچھلے سال ہی پابندی لگی ہے،" ماریا بولی۔ "اس سے پہلے ٹائپ رائٹر لا سکتے تھے، لیکن بہت جھنجھٹ کے بعد۔ مجھے یاد ہے، ایک سال پہلے جب عقیل آیا تھا تو اسے اپنے ٹائپ رائٹر کی وصولی کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑی تھی۔ سوال کسٹم کا نہیں، 'سکیورٹی ڈپارٹمنٹ' کا ہے۔ سکیورٹی ڈپارٹمنٹ کے پاس ٹائپ رائٹر رجسٹر کرانا پڑتا ہے۔ پہلے اسے کسٹم سے سکیورٹی کے پاس لے جاؤ، پھر واپس کسٹم میں لے جاؤ، ڈیوٹی بھرو، لمبا کام تھا۔"

ماریا مڑ کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ پرمود نے ٹائپ رائٹر سے ہاتھ اٹھایا؛ دبی ہوئی کی دوبارہ اپنی جگہ آ گئی۔ پرمود نے ٹائپ رائٹر کا ڈھکن آدھا کھلا چھوڑ دیا۔ بغیر کچھ بولے ماریا کی طرف دیکھتا رہا۔

"عقیل نے مجھے یہ پورا قصہ سنایا تھا۔ سکیورٹی میں لمبا سا فارم بھرا، اپنے دو فوٹو دیے، پھر کاغذ پر ٹائپ کر کے اس کے سیمپل جمع کرائے۔ عقیل کو بس مزہ ہی آ گیا!" ماریا زور سے ہنسی۔ "عقیل کا

Scanned with CamScanner

ٹائپ رائٹر نیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے کیرج کا لاک کیسے کھولا جاتا ہے۔ کیرج کھل کر ہی نہ دیتا تھا۔ وہ کھٹ پٹ کرتا رہا اور افسر چڑ گیا۔ آخر لاک کسی طرح کھلا۔ پھر ٹائپ رائٹر کا سیریل نمبر پوچھا گیا تو عقیل اسے تلاش نہیں کر سکا۔ نمبر باہر نہیں بلکہ کیرج کے اندر ایک کونے پر کھدا ہوا تھا؛ یہ بھی اسے معلوم نہ تھا۔ اس پر پھر افسر سے حجت ہوئی۔ عقیل نے اس سے یوں ہی کہہ دیا: نمبر نہیں ہے۔ یہ کوئی کار ہے کہ اس کا نمبر ہو؟ آخر کار سیریل نمبر کے بجائے ماڈل نمبر ہی کو افسر نے مان لیا!

''تو کیا میں اب اسے رجسٹر نہیں کرا سکتا؟'' پرمود نے پوچھا۔

''جہاں تک مجھے معلوم ہے، پچھلے سال سے انفرادی استعمال کے لیے ٹائپ رائٹر لانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔ صرف کمپنیاں لا سکتی ہیں۔ ایک فرانسیسی شناسا کا ٹائپ رائٹر آیا تھا، وہ اسے ویسا کا ویسا لوٹانا پڑا۔''

''اس کا مطلب ہے، میں اسے غیر قانونی طور پر لایا ہوں!'' پرمود نے میز پر رکھے ٹائپ رائٹر کو ایک الگ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ذہن کے مڈل کلاس، ڈرپوک اور قانون کی پابندی کرنے کے میلان نے سر ابھارا۔ اسے کچھ غصہ آنے لگا۔ ''ہنھ! میں بلاوجہ اس مصیبت میں پڑ گیا! خواہ مخواہ یہاں کے قاعدے قانون توڑنے کی مجھے بالکل خواہش نہیں تھی۔ ایسی بات تھی تو میں جب تک یہاں ہوں، ٹائپ رائٹر کے بغیر ہی کام چلا لیتا؛ میں یہاں ہمیشہ تو رہنے والا نہیں۔ صرف اپنی لاعلمی کی وجہ سے مجھ سے یہ ہو گیا۔ اب کیا کروں؟'' اس نے ماریا کی طرف دیکھا۔ ''کیا میں سکیورٹی ڈپارٹمنٹ جا کر کسی طرح اس معاملے کو نہیں نمٹا سکتا؟''

''دیکھو پرمود، اگر تم ان کے پاس گئے تو وہ کہیں گے: تم اسے کسٹم سے نکال کر گھر کیسے لے گئے؟ اسے واپس کسٹم والوں کے پاس لے کر جاؤ۔ یہ ایک الگ مصیبت ہو گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تمھیں اس کو رکھنے کی اجازت دیں گے نہیں۔ تمھیں اس کو کسٹم سے واپس ملک سے باہر بھجوانا ہو گا۔ کیا تم یہ سب کرنے کے لیے تیار ہو؟''

واپس بھیجنا ہو گا؟ پرمود جیسے اپنے آپ سے بولا۔ اور کہاں بھیجنا ہو گا؟ امریکہ میں کہاں بھیجوں گا؟ اور ہندوستان بھی کیوں بھیجا جائے؟

''معمولی سے ٹائپ رائٹر کے لیے اتنی کھکھیڑ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یہ کرو کہ ٹائپ

Scanned with CamScanner

رائٹر کسٹم والوں کو دے دو۔ کہہ دو وہ رکھ لیں۔ خواہ مخواہ کا سر درد!'' پھر کچھ رک کر بولی، ''لیکن تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ میں تمھیں بتاتی ہوں: خوش قسمتی سے تمھارا ٹائپ رائٹر یہاں تک پہنچ ہی گیا ہے تو اسے بے فکر ہو کر استعمال کرو۔ اس کے پیچھے پولیس تو تمھارے گھر آنے سے رہی۔ تم اسے آرام سے استعمال کر سکتے ہو۔ بس، کسی کو دکھانا مت اور کسی کو استعمال کے لیے دینا مت۔''

''اچھا، تمھارا یہ خیال ہے؟'' پرمود لمحہ بھر ماریا کو دیکھتا رہا۔ ''لیکن پھر جب ملک سے باہر جاؤں گا تب؟ ٹائپ رائٹر واپس کیسے لے جاؤں گا؟ کسٹم والے تلاشی لیں گے تو پوچھیں گے نہیں رجسٹریشن کے بارے میں؟''

''پھر سے چانس لینا! اسے ٹرنک کی تہہ میں رکھ دینا۔''

پرمود نے منھ بنایا۔ ''ہنھ! یہ مجھ سے نہیں ہوگا،'' اس نے کہا۔ ''لاعلمی میں لے تو آیا ہوں۔ لیکن جان بوجھ کر اسے چھپا کر لے جانا بالکل دوسری بات ہے۔ مجھے ان چیزوں سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تو اسے یہیں چھوڑ جانا۔ یہ کوئی ایسی قیمتی چیز تو ہے نہیں۔ کسی کو ضرورت ہو تو اسے دے دینا۔ ورنہ کوڑے میں پھینک دینا۔''

''یا پھر دور، شہر سے باہر، ریگستان میں جا کر اسے دفن کر دوں،'' پرمود نے کہا۔ ''کیسا زبردست خیال ہے — ویران صحرا میں مدفون ٹائپ رائٹر! سیکڑوں برس بعد کوئی اسے ڈھونڈ نکالے گا!'' پرمود زور زور سے ہنسنے لگا، پھر اچانک رک گیا، اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ پھر پیچھے مڑ کر کہنے لگا، ''میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سادہ سے ٹائپ رائٹر کا معاملہ اتنا گمبھیر ہو جائے گا۔ تم بھی تو کالج میں ٹائپنگ کرتی ہو۔ کیا یہ ایسی ہی غیر معمولی چیز ہے؟''

''وہاں بھی ٹائپسٹوں کے نام سکیورٹی ڈپارٹمنٹ کو فراہم کرنے پڑتے ہیں۔ صرف انھی لوگوں کو ٹائپ رائٹر استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے،'' ماریا بولی۔ ''لیکن یہ باتیں جانے دو۔ اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا خیال رکھنا کافی ہے کہ تمھیں خود کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ان جھمیلوں میں کون پڑنا چاہے گا۔ تم ٹائپ رائٹر پر کون سا نیا انقلابی مینی فیسٹو ٹائپ کرنے جا رہے ہو! تمھیں اپنے فلسفیانہ خیالات ہی تو ٹائپ کرنے ہیں۔ ان کی یہاں کس کو پروا ہے! جب تک

یہاں ہو، اسے استعمال کرتے رہو۔ جاتے وقت پھینک دینا۔ اس بارے میں خواہ مخواہ پریشان ہونا بیکار ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو،'' پرمود نے کہا اور پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ لیکن کچھ بھی ہو، اس ٹائپ رائٹر کے معاملے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ صبح سے چھائے ہوئے بادل گویا اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ پرمود بھی جما ہوا سا، بادلوں کی طرف دیکھتا رہا۔

''ہیلو فلاسفر!'' اس کے کانوں کے پاس ماریا کی آواز سنائی دی۔ ''بادلوں میں گم ہو گئے کیا؟ زمین پر واپس آ جاؤ۔'' اس کی سانس میں سگریٹ کی بو تھی۔

''مجھے لگتا ہے مجھے بھی سگریٹ کی ضرورت ہے،'' پرمود نے کہا۔ ماریا نے اپنے پرس سے پیکٹ نکالا، ایک سگریٹ اسے دیا اور اسے سلگایا۔

''یو نو،'' وہ بولی، ''اب مجھے تمھارے ٹائپ رائٹر کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ میں تمھیں بلیک میل کر سکتی ہوں۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں،'' پرمود نے کہا۔ اس نے ماریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اسے اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''او مائی گاڈ! تم کوئی راکھشسی ہو یا کیا؟ تمھاری انگلیوں پر تو خون ہے!''

''یہ اریزنگ اِنک ہے۔ صبح انگلیوں میں لگ گئی تھی۔ کالج میں ٹھیک سے صاف نہیں کر سکی۔''

''اس کی خوشبو مجھے اچھی لگتی ہے،'' اس کی انگلیوں کو ناک کے پاس لا کر پرمود نے کہا۔

''عجیب ہو تم!'' ماریا بولی۔

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پرمود باہر دیکھنے لگا۔ ''یہاں بارش کم ہوتی ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔ ''اور وہ بھی بنجر زمین پر؟''

''ہاں، سوکھی زمین اور دھول کو کیچڑ میں بدل دیتی ہے، بس،'' ماریا نے کہا۔ ''ارجنٹینا میں بارش کے بعد سب کچھ ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔ گھاس، بیلیں، جھاڑیاں، پیڑ پودے ہی ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اور متواتر پھیلتے اور گھنے ہوتے جاتے ہیں۔ بھیگے ہوئے پتوں کی گنجانی ایسی کہ سانس رکنے لگے... اور سبزے کی گاڑھی مہک...''

Scanned with CamScanner

"ہندوستان میں میں بھی بچپن میں ایک چھوٹے گاؤں میں رہا ہوں؛ وہاں بھی برسات میں اسی طرح خودرو سبزہ جنگل کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اور ہمارے گھر کی دیوار کے بالکل ساتھ دو چھوٹے سانپ رہا کرتے تھے۔"

"ارے، سانپ؟"

"ہاں، چھوٹے سانپ تھے، بغیر زہر والے۔ مجھے اس پرجاتی کا نام معلوم نہیں۔ آنگن میں اِدھر اُدھر سرسراتے بھاگتے پھرتے تھے۔"

"مگر سانپ تو سانپ ہی ہوتا ہے،" ماریا اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

پرمود نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا، "ابھی تم نے میرا فلیٹ پورا نہیں دیکھا ہے۔"

پلنگ پر کچھ دیر پڑا رہنے کے بعد پرمود کسمسانے لگا۔ پھر خود کو آہستہ سے الگ کر کے پلنگ سے اٹھا اور سنگھار میز کی درازیں کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ درازیں ایک ایک کر کے زور سے بند کرتے ہوئے وہ جھنجلانے لگا۔ 'سالا کنڈوم کہاں رکھ دیا، خدا جانے!' اس نے خود سے کہا۔ 'یہاں استعمال کرنے کا موقع نہیں آئے گا، اس خیال سے میں نے پرواہی نہ کی۔' اسے لگا ماریا کو غصہ آرہا ہوگا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ سکون سے لیٹی اس کی طرف دیکھتے ہوئے منتظر تھی۔ جب پرمود نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہلکے سے مسکرائی۔ پرمود نے سوچا، پکی عمر کی سمجھ داری ہے، بلاوجہ کا اُتاؤلا پن نہیں۔

ماریا کی رانوں کی حرکت تیز ہوئی تو پرمود نے اپنا منھ اس کے منھ سے بھڑا کر اس کی بند آنکھوں سے آگے دیکھا۔ دروازے میں سے اسے باہر کے کمرے میں میز پر رکھا ہوا ٹائپ رائٹر نظر آیا۔ ادھ کھلے ڈھکن کے ساتھ وہ کھلے ہوئے جبڑے جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ کیز کی چار قطاروں میں سے دو نظر آ رہی تھیں؛ سفید کیز کی وہ قطاریں پرمود کو دانتوں کی قطاروں جیسی معلوم ہوئیں۔ دانتوں کے بیچ بیچ میں خالی جگہیں، یوں لگتا تھا جیسے کسی بوڑھے راکھشس کی بتیسی ہو۔ پرمود کو لگا جیسے یہ کھلا ہوا جبڑا پلنگ پر اس کے اٹھتے گرتے کولھوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا ہو۔ اس کے کولھوں کی حرکت رک گئی اور وہ زور زور سے ہانپتا ہوا، اس قہقہے لگاتے جبڑے کی طرف خالی مور کھ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

Scanned with CamScanner

تکیہ اوپر سرکاتے ہوئے پرمود نے سگریٹ سلگایا۔ ''تمھیں چاہیے؟'' اس نے ماریا سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پرمود بائیں ہاتھ سے اس کے لائٹر سے کھیلتا رہا۔

''پرسوں عقیل ملا تھا،'' وہ بولا۔ ''ٹھیک سے بات نہیں کر رہا تھا؛ عجیب سا برتاؤ تھا اس کا۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہوا شاید کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہے۔''

''ارے یہ بات نہیں؛ اس کا اپنا پرابلم ہے۔'' پھر کچھ رک کر ماریا نے کہا، ''اسے شک ہے کہ اس کی بیوی پٹی کیلیفورنیا سے واپس نہیں آئے گی، اور یہ شک اس کے دماغ پر مسلط ہو گیا ہے۔ پٹی سے میری اچھی دوستی ہے؛ اس لیے عقیل کا خیال ہے کہ اس نے جانے سے پہلے مجھ سے ضرور بات کی ہوگی۔ اُس دن جب وہ تمھارے سامنے میرے گھر آیا تھا تو اسی بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ دو دن بعد وہ پھر آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ پٹی نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں اور کیا کہتی!''

''کیا پٹی کی اس سے بنتی نہیں؟''

''یوں تو ان دونوں کی اچھی بنتی ہے۔ لیکن یہاں پوری زندگی گزارنے کا خیال اُسے مشکل لگتا ہے۔ کچھ بھی کہو، یہاں جینے کے لیے خود کو بہت گھونٹ کر رہنا پڑتا ہے؛ کچھ چیزوں سے تو تعلق ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ پٹی کو محسوس ہوا کہ وہ ایسا نہیں کر پائے گی۔ اسے بھی کیسے دوش دیا جائے۔''

پرمود کچھ دیر چپ رہا۔ پھر کہنے لگا، ''تم نے تو کافی اچھا ایڈجسٹ کر لیا ہے۔''

ماریا ہنسی۔ ''میری بات اور ہے۔ پٹی ابھی پچھلے سال آئی ہے؛ میں تو یہاں دس سال گزار چکی ہوں۔ اب میں واپس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب اگر چاہوں بھی تو بہت دیر ہو چکی ہے۔'' اس نے پرمود کا لائٹر سے کھیلتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''مجھ میں اب اتنی توانائی نہیں بچی کہ سب کچھ چھوڑ کر پھر نئے سرے سے زندگی شروع کروں۔'' اس نے پرمود کا ہاتھ دبایا۔

''آج تمھارے یہاں چلے آنے سے کوئی مشکل کھڑی نہیں ہوگی؟''

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر بولی، ''کیا تم نزار کی بات کر رہے ہو؟'' پھر کچھ رک کر کہنے لگی، ''یہ پہلی بار نہیں ہے۔'' پرمود چپ رہا تو اس نے کہا، ''غلط مت سمجھنا، پرمود۔ مجھے سوئنگنگ لائف وغیرہ کی ہوس نہیں ہے۔ لیکن یہاں کی زندگی میں مجھے بیچ بیچ میں کچھ کھلے پن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ مگر میں اپنی شادی تباہ نہیں کرنا چاہتی۔''

Scanned with CamScanner

''نزار کو کوئی اعتراض نہیں؟''

''یہاں عام طور پر یہ سب نہیں چلتا؛ یہاں کے مرد بہت پزیسو ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے نزار کو صاف بتا دیا کہ میں اپنی نفسیاتی ضرورتوں کو مکمل طور پر نہیں دبا سکوں گی۔ نزار بھی نہیں چاہتا کہ میں اسے چھوڑ جاؤں۔ باقی سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ اس لیے وہ چشم پوشی کر لیتا ہے۔ ہی پریفرز ناٹ ٹو نو۔'' (He prefers not to know.)

باہر تیز ہوا کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پھر بارش کی آواز آئی۔ بیڈروم کی کھڑکی کے نیچے سے ٹپ ٹپ کی آواز آ رہی تھی: اُس طرف ایک دکان تھی، اس کی چھت ٹین کی تھی جس پر گر کر بارش کی بوندیں آواز پیدا کر رہی تھیں۔ پرمود ماریا سے کہنے لگا، ''بارش کی بوندیں ٹین کی چھت پر ٹائپنگ کر رہی ہیں۔''

ماریا ہنسی۔ ''کیا ٹائپ کر رہی ہے؟ نظم؟''

''نہیں۔ انقلاب کا نیا اعلان نامہ۔ نئی زندگی کا منصوبہ۔ ایسا کچھ!'' پھر زور سے ہنستے ہوئے بولا، ''بارش کو اپنا ٹائپ رائٹر سکیورٹی ڈپارٹمنٹ میں رجسٹر نہیں کرانا پڑتا! یہ اُن کی پکڑ میں نہیں آ سکتا۔ کیسی خوش قسمتی کی بات ہے، ہے نا؟''

دونوں بارش کی آواز سنتے رہے۔ پھر ماریا بولی، ''اب مجھے چلنا چاہیے؛ بچے اسکول سے آ گئے ہوں گے۔'' پھر جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہنے لگی، ''نزار نہیں ہے آج کل یہاں۔ کام سے بغداد گیا ہے۔ اکثر بغداد جانا ہوتا ہے اسے۔''

ماریا کو رخصت کر کے پرمود کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ اسے بارش میں ماریا کی گاڑی جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اسے لگا جیسے گاڑی کے شیشے کے پیچھے سے ماریا نے ہاتھ لہرایا ہو، لیکن برستی بارش میں وہ اسے ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا۔ بارش تیز ہو رہی تھی۔ ہوا میں ٹھنڈا پن آ گیا تھا۔

پرمود مڑ کر ٹائپ رائٹر کے پاس گیا۔ ڈھکن کھول کر اس کے کیرج میں کاغذ لگایا، کسی نظم کی دو چار سطریں جو اسے یاد آئیں، اس نے ٹائپ کیں۔ ٹائپ رائٹر کی آواز دکان کی ٹین کی چھت پر پڑتی بارش کی آواز میں مل گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے دونوں آوازیں مل کر ایک تان ہو گئی ہوں۔ اس نظم کی جو سطریں جہاں جہاں سے اسے یاد آتی رہیں وہ انھیں یونہی ٹائپ کرتا رہا۔

Scanned with CamScanner

ایک ہفتہ ہو گیا تھا جب وہ شرما کو دیکھنے ہسپتال گیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ مکھرجی کے پاس جا کر شرما کا حال دریافت کرنا چاہیے۔ وہ اس کے فلیٹ پر پہنچا۔

''اگلی جمعرات کو آپریشن ہو گا،'' مکھرجی نے بتایا۔ پرمود نے اس کے ساتھ ہسپتال جانے کا وقت طے کیا۔ اسے محسوس ہوا شرما کے بغیر مکھرجی کا دل نہیں لگ رہا ہے۔ ''یہ کتابیں پڑھ کر وقت گزارتا ہوں آج کل،'' مکھرجی بولا۔ کتابیں سُمیری اور آشوری کلچر کے بارے میں تھیں جو وہ لائبریری سے لایا تھا۔

پھر پرمود نے کہا، ''مکھرجی صاحب، آپ نے پچھلی بار مجھے بتایا تھا سوق میں مسالے کہاں ملتے ہیں۔ پرسوں میں وہاں گیا تو مجھے وہ دکان ہی نہ ملی۔ سوق میں ایسی تنگ ٹیڑھی میڑھی گلیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں کہ راستہ تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مجھے اب تک راستوں سے واقفیت نہیں ہوئی۔''

مکھرجی بولا، ''آج چار بجے میں بازار جاؤں گا۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ کچھ دکانیں دکھا دوں گا۔''

سوق شہر کے پرانے، گنجان آباد علاقے میں واقع تھا؛ تنگ گلیوں کا زیادہ تر حصہ کولتار کے بغیر تھا اور دو دن پہلے کی بارش نے ہر طرف کیچڑ پھیلا دی تھی۔ پرانے ڈھنگ کا بازار تھا۔ ایک ایک قسم کی دکانیں قطار سے ایک ایک گلی میں واقع تھیں: سناروں کی، آہن گروں کی، مسالوں کی۔ بازار کے ایک حصے سے گزرتے ہوئے مکھرجی نے کہا، ''پہلے اس جگہ ہندوستانیوں کی دکانیں تھیں۔ اب وہ زیادہ تر یہ جگہ چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن اس کا نام اب بھی سوق الہندی ہی ہے۔''

وہ مسالوں کی دکانوں والی گلی میں داخل ہوئے۔ ''ابھی کل تک یہ دکانیں بھی ہندوستانیوں ہی کی تھیں۔ اب صرف ایک دکان بچی ہے،'' ایک دکان پر رک کر مکھرجی نے کہا۔ ''اور بخاری، کیا حال ہے؟'' وہ دکاندار سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آیئے پروفیسر صاحب،'' دکاندار نے جواب دیا۔

''اچھے خالص مسالے ملتے ہیں یہاں،'' مکھرجی نے پرمود کو بتایا۔ ''کسی اجنبی دکان میں جاؤ

تو اچھی کوالٹی ملنے کا یقین نہیں ہوتا۔''

خریداری پوری ہوئی تو بخاری مکھر جی سے بولا،''پروفیسر صاحب، ریزیڈنس ڈپارٹمنٹ کے نام خط لکھ لیا ہے، آپ ذرا دیکھ لیں گے؟''

مکھر جی نے کہا،''ٹھیک ہے۔''

''چلیے، اوپر گھر میں چلتے ہیں،'' بخاری بولا۔

اس کا گھر وہیں دوسری منزل پر تھا۔ زمینی منزل پر دکان اور اوپر کی منزل پر گھر، یہی عام رواج معلوم ہوتا تھا۔ لکڑی کے پرانے زینے پر چڑھ کر تینوں اوپر پہنچے۔ کمرے کی ایک دیوار کی جگہ لکڑی کی جالیاں تھیں۔ بیٹھنے کے لیے کرسیاں نہیں تھیں۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی اور اس کے برابر میں بڑا سا پلنگ تھا۔ مکھر جی اور پرمود پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ بخاری نے پیٹی میں سے خط نکالا۔ مکھر جی پرمود کی طرف اشارہ کر کے بولا،''خط انھیں دکھایئے۔ یہ انگریزی کے پروفیسر ہیں۔'' پھر پرمود کو بتایا، ''ریزیڈنس ڈپارٹمنٹ نے بخاری کو ملک چھوڑنے کو کہا ہے۔ اس نے اس کی میعاد بڑھانے کی درخواست لکھی ہے۔'' پرمود نے خط پڑھا۔ لکھا تھا: آج کل کویت سے ہندوستان سامان لے جانے والے جہاز کی سروس دستیاب نہیں ہے، اس لیے چھ مہینے اور رہنے کی اجازت دی جائے۔ پرمود نے ایک دو جگہ غلطیاں درست کیں۔

بڑے پروفیسر صاحبان آئے تھے، اس لیے بخاری کی بیوی نے جلدی سے زیادہ دودھ ڈال کر کافی بنائی اور عمدہ پیالیوں میں لا کر پیش کی۔ وہ بوہری وضع کی لمبی گھیر دار فراک نما قمیص اور اوڑھنی پہنے تھی۔ ایک طرف بارہ چودہ سال کا لڑکا تجسس سے منڈ رہا تھا۔ پڑوس کا ایک لڑکا آیا اور دونوں آپس میں رواں عربی میں بات کرنے لگے۔ گھر میں گجراتی بولی جا رہی تھی۔

بخاری پرمود سے بولا،''یہاں اتنے سال سے کاروبار کر رہا ہوں۔ اب ہندوستان میں کہاں جائیں۔ اب وہاں کوئی قریبی عزیز بھی نہیں رہا۔''

بخاری کے گھر سے نکل کر پرمود نے کہا،''بیچارے کو اتنے سال بعد یہاں سے نکلنا پڑ رہا ہے۔ کتنی مشکل ہے۔''

مکھر جی بولا،''مگر یہاں کی حکومت کو دوش نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ دو

Scanned with CamScanner

میں سے ایک راستہ چن لیں: یا تو یہاں کی شہریت لے لیں یا یہاں سے چلے جائیں۔ یہ لوگ شہریت لینے کو تیار نہیں ہوئے۔ یہاں رہ کر پیسہ کمانا تو ٹھیک، لیکن یہاں کی شہریت لینا ٹھیک نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

''سچ کہتے ہیں آپ،'' پرمود نے کہا۔

تنگ کیچڑ بھری گلیوں میں بھیڑ میں سے ہو کر چلنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ پرمود جوتوں کو کیچڑ میں لت پت ہونے سے بچانے کی بے کار کوشش کرتا رہا۔ ان تنگ گلیوں میں بھی بیچ بیچ میں کوئی گاڑی لے کر گھس آتا تھا۔ کیچڑ میں گاڑی کے پہیوں کے گہرے نشان پڑ جاتے۔ ان گڑھوں میں سے کیچڑ دونوں طرف اونچی ہو کر جم جاتی اور گڑھوں میں کم کیچڑ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر پیر رکھ کر چلنے کا کرتب کرنا پڑتا تھا۔

کیچڑ بہت گاڑھی اور چپچپی تھی۔ پرمود کو خیال آیا کہ اس نے ایسی کیچڑ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی؛ یہ اُس قدیم ابتدائی مٹی سے بنی ہے جو سینکڑوں برس سے دجلہ اور فرات کے پانی لا لا کر اس خطے میں بچھاتے رہے ہیں۔ اسے وہ عجیب جاندار یاد آئے جنھیں اس نے دریا کے دہانے کے پاس کیچڑ میں لوٹتے دیکھا تھا۔ گلیوں میں بھی اس کیچڑ پر لوگوں کے ہجوم چل رہے تھے۔

راستے میں کئی جگہ سڑک کے کنارے پر گتے کے کارٹن کھول کر زمین پر بچھا دیے گئے تھے۔ مکھر جی بولا، ''یہ دکاندار اپنی دکانوں کے سامنے کیچڑ پر یہ گتے بچھا دیتے ہیں تا کہ چلنا آسان ہو جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ گتے گل گل کر کیچڑ میں شامل ہو جاتے ہیں اور اسے اور بڑھا دیتے ہیں۔''

یعنی یہ کیچڑ زیادہ تر گلے ہوئے گتے سے بنی ہے، پرمود نے سوچا، اور میں اس کے قدیم ابتدائی مٹی سے بنے ہونے کے رومانی تصورات باندھ رہا تھا!

ایک دن دفتر میں صبری مزفر پرمود کے پاس آیا۔ وہ بھی اسی سال ڈپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ اس نے اسی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا اور اب انگلینڈ سے ایم اے کر کے لوٹا تھا۔ چہرہ گورا تھا لیکن ہونٹ موٹے تھے اور بال مصریوں کی طرح گھنگھریالے۔

''آپ سے کچھ کام تھا،'' وہ بولا۔

Scanned with CamScanner

"کہیے،" اسے کرسی دے کر پرمود نے کہا۔

"سگریٹ؟" صبری نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا اور انگریزی سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر پرمود کی طرف بڑھایا۔ یہاں لوگ کسی کو سگریٹ پیش کرتے وقت پورا پیکٹ نہیں بڑھاتے تھے بلکہ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر پیش کرتے تھے۔ صبری دو سال انگلینڈ میں رہ آیا تھا لیکن اس کی یہ مقامی عادت برقرار تھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی عادتیں لوگ شعوری طور پر اختیار نہیں کرتے۔

"ہم نے فرسٹ ایر کے طلبا کا استقبال کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا گیٹ ٹوگیدر کرنے کا پروگرام بنایا ہے،" صبری نے بتایا۔ "اس کا انتظام مجھے سونپا گیا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ کسی انگریزی ڈرامے کا ایک آدھ سین پیش کیا جائے۔ بچوں کی انگریزی بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔ اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میرا بیک گراؤنڈ لسانیات کا ہے، لٹریچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ کیا آپ ڈرامے کی ہدایت کاری وغیرہ اپنے ذمے لے سکتے ہیں؟"

"بہت عمدہ خیال ہے!" پرمود نے جوش سے کہا۔ "میں بہت خوشی سے یہ کام کروں گا۔ مجھے ڈرامے سے دلچسپی ہے۔ ہدایت کاری کا مجھے کوئی تجربہ تو نہیں ہے، لیکن میرا خیال ہے کوشش کر کے کر لوں گا۔"

"خوب!" صبری بولا۔ "تو کسی دن بیٹھ کر اس کے بارے میں تفصیل سے بات کر لیتے ہیں۔ ڈرامے کا انتخاب، طلبا کا انتخاب، ریہرسل کا وقت وغیرہ، سب کچھ طے کرنا ہوگا۔ یہاں تھرڈ ایر میں طلبا جولیس سیزر پڑھتے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ کھیلا جا سکتا ہے۔"

"شیکسپیئر کھیلنا تو ہمیشہ اچھا ہی رہتا ہے،" پرمود نے کہا۔ "زبان ذرا مشکل ضرور ہے لیکن پھر بھی شیکسپیئر ہر جگہ کے دیکھنے والوں کو پسند آتا ہے۔ کسی جدید ڈراما نگار کے بارے میں ایسی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

"تو آپ آج شام میرے گھر کیوں نہیں آ جاتے؟ ہماری اب تک ٹھیک سے ملاقات نہیں ہوئی ہے، وہ بھی ہو جائے گی۔ جولیس سیزر کی کچھ کاپیاں میں نے لائبریری سے نکلوائی ہیں۔ ایک آپ کو دے دوں گا۔"

Scanned with CamScanner

صبری کا مکان پرانے بصرہ کی طرف واقع تھا۔ پرانی وضع کی بڑی بڑی موٹی دیواریں، اوپر بالاخانے پر لکڑی کی جالیاں۔ صبری نے اپنے مکان کی قدامت کے بارے میں ایک آدھ معذرت خواہانہ بات کی۔ ”ہمارا نیا کنکریٹ کا مکان شہر میں بن رہا ہے؛ پانچ چھ مہینے میں پورا ہو جائے گا۔ تب یہ مکان چھوڑ دیں گے۔“

پرمود نے کہا، ”ویسے ان پرانے مکانوں کی اپنی بات ہے۔ گارے کی یہ موٹی دیواریں گرمیوں میں مکان کو ٹھنڈا رکھتی ہوں گی۔ جس زمانے میں ایرکنڈیشننگ نہیں ہوتی تھی، تب بڑی کارآمد ہوتی ہوں گی۔“ گھر اندر سے بہت آراستہ تھا جس سے امارت ظاہر ہوتی تھی۔ پرمود نے کہا، ”آپ کے ہاں کے یہ پرانے مکان باہر سے بہت سادہ بلکہ بھدے سے دکھائی دیتے ہیں؛ اندر جاؤ تو بالکل ماڈرن، سب عیش آرام موجود! مجھے دو چار بار ایسا تجربہ ہوا ہے۔“

صبری ہنستے ہوئے بولا، ”یہ بہت پرانی روایت ہے۔ پہلے زمانے میں لوگوں کے پاس پیسہ ہوتا بھی تھا تو لوگ اس کی نمائش کرنے سے بچتے تھے۔ اُس زمانے کے غیر مستحکم اقتدار میں دولت کی نمائش سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔“

صبری کی بہن گھر میں سے باہر آئی تو صبری نے پرمود سے اس کا تعارف کرایا۔ پرمود کو لگا جیسے اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہو، لیکن پرمود کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہاتھ ملائے یا نہ ملائے۔ یہاں عورتیں مردوں سے ہاتھ ملاتی نظر آتی تھیں۔ برقعے کا رواج کافی حد تک باقی تھا لیکن ایک لحاظ سے عورتیں خاصی ترقی یافتہ تھیں۔ ہندوستان میں عورتیں مردوں سے فاصلہ قائم رکھتی ہیں؛ یہاں ایسا نہیں تھا۔ کلاس میں لڑکیاں لڑکے گھل مل کر بیٹھتے تھے۔

صبری کی بہن سعودی عرب میں شاہی گھرانے کی ایک لڑکی کو ریاضی اور سائنس پڑھاتی تھی۔ دن میں صرف گھنٹے دو گھنٹے کا کام تھا، کبھی کبھی تو اتنا بھی نہیں۔ تنخواہ بہت اونچی۔ ”واہ! مجھے بھی ایسی ہی کوئی ملازمت کیوں نہیں ڈھونڈ دیتیں!“ پرمود نے اس سے کہا۔

کچھ دیر بعد صبری کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی، بولی اسے باہر جانا ہے۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس بار پرمود نے اس سے ہاتھ ملایا۔

صبری اور پرمود بیٹھ کر ڈرامے کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ صبری بولا، ”بہت

Scanned with CamScanner

سے لوگ سیزر کے قتل والا سین کرنا چاہتے ہیں۔ بیک گراؤنڈ دینے کے لیے اس سے پہلے کے چند سین بھی چننے ہوں گے۔ لیکن زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے ورنہ طلبا کو مشکل ہوگی۔"

پرمود نے کہا، "میں پڑھ کر دیکھتا ہوں، پھر انتخاب کروں گا۔ ٹھیک سے پڑھ کر کاٹ پیٹ کرنی ہوگی۔"

اچانک صبری جذباتی آواز میں بولا، "کاش جل یہاں ہوتی! وہ کتنے شوق سے اس میں شامل ہوتی۔ اسے ڈرامے کا بہت شوق تھا۔ تھیٹر میں کام بھی کر چکی تھی۔" پھر پرمود سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، "یو نو، جل... میری انگلش گرل فرینڈ۔ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر پھر سب کچھ خاک میں مل گیا۔" پرمود کے چہرے پر سوالیہ تاثر دیکھ کر بولا، "سرکاری ضابطہ بیچ میں آ گیا..."

"ضابطہ؟ کیسا ضابطہ؟"

"پڑھنے کے لیے باہر جانے والے غیر ملکی بیوی کو ساتھ نہیں لا سکتے۔"

"کیا؟" پرمود نے کہا اور ایک دم چپ ہو گیا۔ صبری بھی خاموشی سے جل کو یاد کرتا رہا۔ پھر پرمود نے کہا، "لیکن یہ کس طرح؟ یہاں تو کئی لوگوں کی غیر ملکی بیویاں ہیں۔"

"پچھلے سال تک اجازت تھی۔ اب نیا قانون آ گیا ہے۔"

صبری نے جولیس سیزر کی کاپی میز پر پھینکی اور دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے رکھ کر بولا، "ہمارا سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ میں نے یہاں والد کو خط بھی لکھ دیا تھا: نیا مکان جلدی بنوا لیجیے، مجھے انگریز بیوی کے ساتھ اس پرانے مکان میں نہیں رہنا ہے۔ اور پھر یہ ہو گیا! جب میں یہاں آیا تو میری ذہنی کیفیت بہت خراب تھی۔ ڈپارٹمنٹ میں کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے تم سے بھی کچھ خاص شناسائی نہ ہو سکی۔ بہت ڈپریسڈ رہتا تھا میں۔"

"تو تم نے انگلینڈ میں رہنے کے بارے میں نہیں سوچا؟"

"سوچا تھا، لیکن پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ پوری زندگی پردیس میں گزار دینا میرے بس کی بات نہیں۔ یہاں اپنے سب رشتے توڑ کر باہر رہ جانا بہت مشکل تھا۔"

پھر صبری اٹھ کر جل کی تصویریں لے آیا اور پرمود کو دکھانے لگا۔ فوٹو دیکھ کر وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔ پرمود اس کی بات سنتے ہوئے، عجیب سا محسوس کرتا رہا۔

اگلی صبح یونیورسٹی کی اسٹاف بس میں اس کی صبری سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس بس میں زیادہ تر کلرک اور دفتر کے لوگ سفر کرتے تھے، اور کچھ مصری پروفیسر۔ غیر ملکی پروفیسر عارضی قیام کی وجہ سے عموماً گاڑی نہیں رکھتے تھے۔ بیشتر عراقی پروفیسروں کے پاس اپنی گاڑیاں تھیں۔ پرمود نے ایک بار صبری سے پوچھا تھا، ''تمھارے پاس گاڑی نہیں ہے؟'' صبری نے جواب دیا تھا، ''انگلینڈ سے روانہ ہوتے وقت گاڑی کو سمندر کے راستے بھجوایا تھا۔ ابھی پہنچی نہیں۔'' بس میں سفر کرنا شاید اسے پسند نہیں تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی بس میں دکھائی دیتا؛ زیادہ تر کسی کی گاڑی میں لفٹ لے لیتا۔ اس کا گھر کالج کے راستے میں پڑتا تھا، اس لیے کوئی نہ کوئی اسے پک اپ کر لیتا تھا۔

صبری کے برابر کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پرمود نے کہا، ''کل رات میں نے ڈرامے کا وہ ایکٹ غور سے پڑھا اور اس میں سے سین منتخب کر لیے۔ میرا خیال ہے کہ زبان کو تھوڑا آسان کر دیا جائے تو اچھا ہوگا۔ مکالموں میں تبدیلی کرنے کے بعد اسے اسٹینسل کرا لیں گے۔''

''بہت خوب!'' صبری بولا۔ ''اچھا ہوا تم جیسا شخص مل گیا جسے اس کا شوق ہے۔ ورنہ مجھے بہت مشکل ہوتی۔''

راستے میں ایک جگہ بس رکی اور کالج کے ڈین کے دفتر میں کام کرنے والی ایک جوان عورت سوار ہوئی۔ پرمود کو احساس ہوا کہ آج اس نے برقع نہیں پہنا تھا۔ اس نے ملازمت نئی نئی شروع کی تھی؛ پہلے پہل جب وہ بس میں سوار ہوتی تو برقع پہنے ہوتی تھی۔ پھر کچھ دن بعد پرمود نے دیکھا کہ برقع ہاتھ میں لیے ہوتی؛ گھر سے پہن کر نکلتی ہوگی اور پھر بس اسٹاپ پر آ کر اسے اتار لیتی ہوگی۔ اور اب اس نے برقعے کو بالکل خیرباد کہہ دیا تھا! پرمود کو یہ تبدیلی دلچسپ معلوم ہوئی۔ اس نے صبری سے اس کا ذکر کیا۔ ''اسی طرح دھیرے دھیرے ترقی ہوتی ہے،'' پرمود نے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ صبری کو اس قسم کی تبدیلی سے ہمدردی ہوگی۔ لیکن صبری بولا، ''روایات کو اتنی بے پروائی سے ترک کیا جا رہا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔''

جمعرات کی شام ماریا نے اپنے گھر پر پارٹی کا اہتمام کیا تھا جس میں پرمود بھی مدعو تھا۔ وہ ٹیکسی کر کے ماریا کے گھر پہنچا۔ پارٹی کا وقت آٹھ بجے تھا لیکن پرمود جان بوجھ کر کچھ دیر سے گیا۔

Scanned with CamScanner

''ارے تم آ گئے، اتنی جلدی!'' ماریا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ''میں ابھی تیار نہیں ہوئی۔ آج کھانا پکانے میں مجھ سے سستی ہو گئی۔'' پرمود اس کے پیچھے پیچھے دیوان خانے میں گیا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ماریا ہنس کر کہنے لگی، ''تم استادوں کو کلاس میں وقت پر پہنچنے کی عادت پڑ جاتی ہے! ویسے اچھی عادت ہے یہ، لیکن اِدھر مجھے یہاں کے لوگوں کے دیر سے پہنچنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ بیٹھو، دھیرے دھیرے لوگ آتے جائیں گے۔'' اسے ایک دو رسالے تھما کر وہ اندر چلی گئی۔

ایک رسالہ اپنے زانو پر رکھے پرمود بیٹھا اس وسیع، خالی دیوان خانے میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پانچ دس منٹ بعد ایک میاں بیوی پہنچے۔ ماریا نے ان کا پرمود سے تعارف کرایا، ''ڈاکٹر اور مسز کیمرون۔'' پھر ڈاکٹر کیمرون سے بولی، ''اچھا ہوا آپ ابھی آ گئے۔ آپ دونوں بھی پروفیسر ہیں، اس لیے پرمود سے آپ کی اچھی گپ شپ رہے گی۔'' کیمرون میڈیکل کالج میں استاد تھا۔ پہلے پہل اس کے واضح طور پر اسکاٹش تلفظ کے باعث پرمود کو اس کی بات سمجھنے میں دقت ہوئی: 'گرل' کا تلفظ 'گال'، وغیرہ۔ لیکن کیمرون خاصا باتونی تھا۔ پرمود نے اس سے دریافت کیا کہ آیا وہ یونیورسٹی کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ کیمرون نے کہا، ''جب آیا تھا تو شروع شروع میں وہیں رہا تھا۔ لیکن میری بیوی کو وہ جگہ پسند نہیں آئی۔'' کیمرون کی بیوی سوئس تھی۔ اسے شاید یونیورسٹی کے فلیٹوں میں رہنے والے ہندوستانی پاکستانی خاندانوں کے بچوں کا شور غل، مسالے دار کھانوں کی خوشبو وغیرہ ناگوار گزری ہو گی۔ وہ ایک فرانسیسی انجینئرنگ کمپنی کے ملازمین کے بچوں کو پڑھانے کا کام کرتی تھی۔ اس بنا پر انھیں کمپنی کی عمارت میں رہنے کی جگہ مل گئی۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ کمپنی اپنا کام پورا کر کے چلی گئی۔ اسی دوران مسز کیمرون کو ایک جرمن کمپنی میں بچوں کو پڑھانے کی ملازمت مل گئی اور وہ اس کمپنی کے دیے ہوئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس نے اپنے سوئس ہونے کا پورا فائدہ اٹھایا: فرنچ بھی کار آمد نکلی اور جرمن بھی۔ جرمن کمپنی کی عمارتیں شہر سے اٹھارہ میل پرے واقع تھیں اور کیمرون روز گاڑی میں آتا جاتا تھا۔

نو بجے کے قریب کچھ اور مہمان آ پہنچے۔ وہ زیادہ تر کنٹریکٹر یا انجینئرنگ کمپنیوں کے اہلکار تھے۔ یہ سب خاصا اعلیٰ طبقے کا معاملہ تھا۔ پرمود نے سوچا کہ وہ اور کیمرون، دونوں پروفیسر، مڈل کلاس لوگ، اپنے پاگل پن میں وقت سے پہلے آ دھمکے۔

Scanned with CamScanner

کیمرون میاں بیوی کے سوا پانچ جوڑے اور تھے۔ سب مرد عراقی تھے اور ان سب کی بیویاں غیر ملکی تھیں، زیادہ تر امریکی یا برطانوی۔ غالباً یہ غیر ملکی بیویاں مختلف پس منظر رکھنے کے باعث یہاں کی سماجی زندگی میں پوری طرح گھل مل نہیں پاتی تھیں۔ زبان کی مشکل الگ تھی: ان میں سے بیشتر کو زیادہ عربی نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ ناگزیر طور پر ایک دوسرے کے قریب آ گئی تھیں، یعنی ان غیر ملکی بیویوں والے گھرانوں کی ایک الگ سماجی زندگی وجود میں آ گئی تھی۔ ساری بات چیت ظاہر ہے کہ انگریزی میں ہو رہی تھی؛ شوہر ایک دوسرے سے بھی انگریزی ہی میں بات کرتے تھے اور انگریزی بولتے ہوئے اوپرے سے معلوم ہوتے تھے، کیونکہ وہ آپس میں عربی میں زیادہ اچھی طرح گفتگو کر سکتے تھے۔ ان کے باہم انگریزی بولنے کے عمل میں ایک طرح کی خاص، اعلیٰ درجے کی رسم کا سا انداز محسوس ہوتا تھا۔

پردیس میں اتنے سال گزارنے کے بعد ان عورتوں کے آپس میں گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ دوستیوں اور رقابتوں کے دھاگوں نے ان کے حلقے کے گرد مضبوط گرہیں ڈال دی تھیں۔ اس اجنبی ملک میں انھوں نے اپنا ایک خوشحال جزیرہ تخلیق کر لیا تھا۔ ان کی گفتگو کے موضوع کچھ اس طرح کے ہوتے تھے کہ پچھلی گرمیاں اٹلی یا یونان میں گزاری تھیں، اس بار کہاں جانے کا ارادہ ہے، یا وہ نفیس چیزیں کیسے حاصل کی جائیں جو عراق میں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ پرمود خود کچھ بولے بغیر ان کی باتیں تحسین کے سے انداز میں سنتا رہا۔ پھر اسے صبری کی بات یاد آئی — آئندہ اس ملک کا کوئی باشندہ غیر ملکی بیوی نہیں لا سکے گا۔ یعنی اس حلقے میں مزید ارکان کا اضافہ نہیں ہوگا؛ گویا انھیں معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار نسل سمجھنا چاہیے۔ یہ بڑی بات ہے کہ اُسے اِس ڈوڈو جیسی، جلد ہی ختم ہو جانے والی پرجاتی کے مشاہدے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ ان غیر ملکی بیویوں کو اس طرح غور سے دیکھتا رہا جیسے چڑیا گھر میں جانداروں کی کسی نایاب نسل کو دیکھ رہا ہو۔

شروع میں پرمود سے ایک آدھ بات کرنے کے بعد نزار نے اسے زیادہ تر نظرانداز کیا۔ پرمود کو احساس ہوا کہ اس پارٹی میں صرف وہی اکیلا آیا ہے۔ ماریا نے اسے بتایا تھا کہ عقیل بھی آنے والا ہے۔ اس نے ماریا سے پوچھا۔ ماریا بولی، ''اسے بلایا تو تھا؛ پتا نہیں کیوں نہیں آیا۔''

''اوہ، عقیل!'' یہ کہہ کر ایک عورت نے ماریا کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

''پی کر گھر میں پڑا ہوگا،'' دوسری نے سرگوشی کی۔

ماریا نے محسوس کرلیا کہ پرمود کچھ پریشان اور گھبرایا ہوا ہے۔ وہ اس کے پہلو میں آ بیٹھی اور اسے گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کرنے لگی؛ اس کے بارے میں دوسروں کو بتانے لگی۔ پرمود کو محسوس ہوا کہ دو ایک عورتیں اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ اس پارٹی میں اس اکیلے کو مدعو کرنا اسے دوسروں کی نظروں میں نمایاں کرنے کے مترادف تھا۔ پرمود کو اور زیادہ عجیب احساس ہونے لگا۔ اسے لگا اسے اس پارٹی میں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس نے سوچا کہیں ماریا نے اسے دوسری عورتوں کے سامنے نمائش کے لیے پیش کرنے کی غرض سے تو نہیں بلایا۔ وہ ان عورتوں کو چڑیا گھر کے باسی سمجھ رہا تھا؛ مگر شاید حقیقت یہ تھی کہ وہ خود ایک ایسا جاندار تھا جسے لوگ محظوظ ہو کر دیکھ رہے تھے۔ اس خیال پر وہ کچھ جھنجلا گیا اور پہلے سے زیادہ خاموش ہو گیا۔

قریب قریب نصف شب کے وقت ماریا نے مہمانوں کو بوفے ڈنر تیار ہونے کی اطلاع دی۔ ڈرنکس کے ساتھ گزک کے طور پر بہت سی تلی ہوئی چیزیں کھا چکے ہونے کی وجہ سے پرمود کو خاص بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ یوں بھی اسے اتنی رات گئے کھانا کھانے کا خیال پسند نہ تھا؛ اسے یہ بدہضمی کو دعوت دینے جیسا لگتا تھا۔ اس نے اپنی رکابی میں برائے نام کھانا نکالا۔ ماریا بولی، ''ارے، تمھیں کھانا اچھا نہیں لگا؟ میں نے تو تمھارے خیال سے ہندوستانی اسٹائل کی کری تیار کی تھی۔'' وہ خود اس کی رکابی کو اوپر تک بھر لائی۔

ایک بار امریکی لٹریچر کی کلاس میں پڑھاتے ہوئے پرمود نے ہرمن میلوِل کا ذکر کیا۔ نوٹس لیتے ہوئے ایک طالب علم نے کچھ دیر بعد پوچھا، ''اس ہرمن کے باپ کا کیا نام بتایا تھا آپ نے؟'' اس پر اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے لڑکے نے اسے ٹوکا، ''ارے باپ کا نام نہیں، خاندانی نام، سرنیم۔'' پرمود کو احساس ہوا کہ یہاں خاندانی نام کا رواج نہیں: لوگ اپنے نام کے ساتھ باپ اور دادا کا نام لگاتے ہیں؛ کبھی کبھار قبیلے کا۔ اس لیے بہت سے طلبا مغربی ادیبوں کے سرنیم کو ان کے باپ کا نام سمجھتے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ امتحان کی کاپیوں میں بھی طلبا ادیبوں کا ذکر ان کے پہلے نام سے کرتے تھے، مثلاً 'براؤننگ' کے بجائے 'رابرٹ'۔ ان کے خیال میں ہیملٹ کا مصنف ایک ولیم تھا،

''لوسی'' کے عنوان کی نظمیں ایک اور ولیم کی تھی، اور ''دی ٹائیگر'' نامی نظم ایک تیسرے ولیم نے لکھی تھی۔ یہ خاصا پر لطف معاملہ تھا: پرمود کو لگا کہ یہ انگریزی لٹریچر کو دیکھنے کا ایک نیا، انوکھا زاویہ ہو سکتا ہے۔

ایک اور کلاس میں صرف تین طالب علم تھے۔ یہ کورس فیل ہو جانے والے یا کسی وجہ سے اس میں شامل نہ ہو پانے والے طلبا کے لیے دوبارہ پڑھایا جا رہا تھا۔ کلاس کے تینوں لڑکے فلسطینی تھے۔ فلسطینی طلبا کی زندگی عموماً خاصی غیر مستحکم ہوتی تھی؛ اس لیے وہ اکثر دوسروں سے پیچھے رہ جاتے یا فیل ہو جاتے۔ شروع کی تعارفی کلاسیں پوری ہونے کے بعد جب پرمود نے اصل متن پڑھانا شروع کیا تو ان میں ایک، محمد نامی، کلاس سے غائب تھا۔ باقی دونوں میں سے ایک نے اسے بتایا، ''محمد لڑنے گیا ہے۔ لبنان میں پھر حالات خراب ہو گئے ہیں نا!''

''لڑنے گیا ہے؟''

''جی ہاں۔ محمد اچھا کمانڈو فائٹر ہے۔ بندوق اچھی چلاتا ہے۔''

''اچھا؟'' پرمود کی سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔

اس نے باقی دونوں طالب علموں کو پڑھانا جاری رکھا۔ محمد ان تینوں میں مقابلتاً زیادہ ذہین تھا؛ باقی دو اوسط ذہانت کے مالک تھے۔ محمد ہمیشہ ان دونوں کے بیچ میں بیٹھتا تھا۔ پرمود کو ایک عجیب سا خیال آیا، جیسے یسوع زندہ ہو کر چلا گیا ہو اور صلیب پانے والے دو چور پیچھے رہ گئے ہوں۔

پرمود کو کچھ دنوں سے بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے لگتا تھا اسے اس ملک میں اپنی زندگی کو زیادہ بامقصد بنانے کی کوشش کرنی چاہیے، بجائے اس کے کہ بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے۔ ماریا جیسی پردیسی عورت سے آشنائی میں بھلا وہ کیوں پھنس گیا؟ اسے اپنے یہاں آنے سے پہلے کے تصورات یاد آنے لگے: یہ ملک 'انسانی تہذیب کا گہوارہ' ہے۔ اسے یہاں کی قدیم، لازماں حقیقت کو تلاش کرنا چاہیے، شہر کے قریب واقع قدیم آثار کو جا کر دیکھنا چاہیے۔ سمندر پر جانے کا اس کا جنون بے معنی، جذباتی لہر سے زیادہ کچھ نہ تھا: اسے بامعنی چیزوں کی جستجو کرنی چاہیے۔

اسے احساس ہوا کہ یہاں کی تاریخ کے متعلق اس کا علم بہت سرسری ہے۔ اس نے طے کیا کہ

Scanned with CamScanner

پہلے اس کمی کو دور کرنا چاہیے۔ وہ اٹھ کر کھرجی کے گھر گیا۔ ''میں کوئی اچھی کتاب پڑھنا چاہتا ہوں۔'' کھرجی یہ سن کر خوش ہوا۔ اس نے بڑے شوق سے پرمود کو سات آٹھ موٹی موٹی کتابیں دکھائیں؛ اور ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی۔ ''بہت زیادہ علمی کتاب درکار نہیں،'' پرمود نے کہا۔ ''کوئی عام معلومات کی کتاب کافی ہوگی۔''

شہر کے نزدیک 'اُر' اور 'اریدو' نام کی دو تاریخی جگہیں تھیں؛ اس نے انھیں جا کر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے فرانسوا سے یہ ذکر چھیڑا۔ فرانسوا اور وہ کبھی کبھی ویک اینڈ یا چھٹی پر شہر سے باہر، دریا کے کنارے یا کسی اور مقام پر چلے جاتے اور باربی کیو کرتے۔ اس کا سامان فرانسوا کے پاس موجود تھا: المونیم کے برتن، کوئلے، چمٹا وغیرہ۔ وہ باربی کیو چکن بنانے میں ماہر تھا۔ ''بیروت میں یہ میری خصوصیت سمجھی جاتی تھی،'' اس نے پرمود کو بتایا۔ ''میرے دوست احباب مجھ سے ہمیشہ فرمائش کرتے تھے۔'' کبھی کبھی ان دونوں کے ساتھ فرانسیسی کیمپ کے کچھ لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ ان کی آپس کی بات چیت سن کر پرمود کو فرانسیسی زبان زیادہ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ پرمود نے اس سے کہا، ''اس جمعے کو باربی کیو کے بجائے اُر دیکھنے کا پروگرام رکھا جائے۔''

موسم سیر کے واسطے بہت مناسب تھا۔ تروتازہ ہوا، ہلکی سی ٹھنڈک، صاف کھلی دھوپ۔ دونوں یہ بات کرنے لگے کہ اور کس کو ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ فرانسوا بولا، ''میں نے اپنے دو فرانسیسی دوستوں سے پوچھا تھا، لیکن وہ دلدلی علاقے میں جا رہے ہیں۔ تمھارا وہ داڑھی والا دوست ساتھ چلے گا؟''

''حمید نا؟ وہ مجھے ملا نہیں کئی دن سے،'' پرمود نے کہا۔

فرانسوا بولا، ''دو چار دن پہلے مجھے ایک ریستوران میں کسی کے ساتھ بیٹھا دکھائی دیا تھا۔ سامنے بیئر کی بوتلیں تھیں۔''

''ارے نہیں! حمید نہیں پی سکتا،'' پرمود نے کہا۔ ''اس کے ساتھ والا شخص پی رہا ہوگا۔''

آخر جمعے کے دن وہی دونوں سیر پر نکلے۔ فرانسوا نے گاڑی میں پٹرول بھروایا۔ پھر اس نے گاڑی ایک مکینک کے گیراج کے پاس روکی۔ اسے مرمت کے کچھ پیسے چکانے تھے۔ گیراج میں فرانسوا اور مکینک کے درمیان کچھ دیر تکرار ہوتی رہی۔ فرانسوا گاڑی میں لوٹا تو کچھ غصے میں تھا۔ ''مجھ سے زیادہ پیسے اینٹھنے کی کوشش میں تھا،'' وہ بولا۔ ''یہ عرب بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ان سے

Scanned with CamScanner

ہوشیاری سے نمٹنا پڑتا ہے۔"

پرمود نے کہا، "دھوکے باز لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ سارے عربوں کو ایک جیسا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس کے برعکس مجھے تو یہ عام طور پر اچھے، کھلی طبیعت کے معلوم ہوتے ہیں۔"

فرانسوا بولا، "ارے تم یہاں نئے آئے ہو؛ تمھیں تجربہ نہیں۔ میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں!"

بے شک، کیونکہ تم خود آدھے عرب ہو! یہ بات پرمود کے ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئی۔

وہ شہر سے باہر نکل آئے۔ پچھلی بار سمندر کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے یہی راستہ اختیار کیا تھا؛ البتہ اِس بار وہ اسی سڑک پر مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ "لمبا راستہ ہے،" فرانسوا بولا، "تقریباً تین گھنٹے لگیں گے۔"

"یعنی بارہ بجے تک پہنچیں گے،" پرمود نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

شہر کے باہر حسب معمول بھوری، بنجر زمین شروع ہوگئی۔ یہاں 'ڈیزرٹ' یعنی ریگستان نہیں تھا بلکہ سوکھی، سخت زمین تھی۔ یہاں آنے سے پہلے پرمود ریتیلی زمین کا تصور کرتا رہا تھا جہاں چلتے ہوئے لوگوں کے پیر ریت میں دھنستے ہوں گے، لیکن درحقیقت اسے ریگستان جیسی کوئی چیز اب تک دکھائی نہیں دی تھی۔

دیکھنے کو کچھ نہیں تھا؛ پھر بھی پرمود عادتاً گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ مسلسل اس سوکھی بنجر زمین کو دیکھتے رہنے سے اس کے ذہن پر ایک عجیب خالی پن چھا گیا۔ بیچ بیچ میں اچانک کوئی آدمی راستے پر چلتا دکھائی دیتا یا کوئی کچی مٹی کا گھر تیزی سے پیچھے جاتا۔ ایک دفعہ پرمود کو دور ایک عورت افق کی جانب جاتی نظر آئی: خشک سپاٹ زمین پر کالا برقع پہنے وہ پیچھے سے ایک دھبے جیسی دکھائی دیتی تھی؛ برقعے کے گھیرے ہوا سے پھول کر اس کے پیچھے غبارے کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ آس پاس کہیں کچھ نہیں تھا؛ جس سمت میں عورت جا رہی تھی وہاں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ اکیلی عورت اس بنجر علاقے میں کہاں جا رہی ہوگی؟ یہ ایک عجیب، پراسرار قسم کی زندگی تھی۔ پرمود اس سیاہ دھبے جیسی شکل کی طرف اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

ایک جگہ سڑک کے کنارے ایک گدھا مرا، پھولا ہوا پڑا تھا۔ اس کے اردگرد کئی کتے جمع تھے جو ایک دوسرے پر غرّا رہے تھے۔ وہ بہت ڈراؤنے دکھائی دے رہے تھے: کھال پر لمبے کھردرے بالوں

Scanned with CamScanner

والے وہ کتے جنگلی اور وحشی معلوم ہوتے تھے۔ فرانسوا بولا، ''اس سڑک پر اس قسم کے کتے اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بالکل وحشی ہو چکے ہیں۔ عربوں کو کتوں سے نفرت ہے، اس لیے انھیں شہر کے باہر اسی طرح جینا پڑتا ہے۔ خطرناک بھی ہوتے ہیں! ایک بار کسی شخص کی گاڑی بند ہو گئی اور وہ باہر نکلا تو کتوں نے اس پر حملہ کر دیا۔''

کچھ دیر بعد فرانسوا نے کہا، ''چلو، ٹرم شروع ہوئے ایک مہینہ تو گزر گیا۔ اب مڈ ٹرم چھٹیوں میں کتنے دن رہ گئے؟''

پرمود ہنستے ہوئے بولا، ''لگتا ہے تم ایک ایک دن گن رہے ہو۔''

''بالکل!'' فرانسوا بولا۔ ''بیروت جانے کے موقعے کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ جب بھی بیروت سے لوٹتا ہوں، اگلی بار جانے کے لیے دن گننے لگتا ہوں۔''

''اور اگر چھٹیاں شروع ہونے کے وقت وہاں زیادہ گڑبڑ ہو گئی تو؟''

''ارے، اس کی تو عادت ہو گئی ہے۔ گڑبڑ کم زیادہ ہوتی ہی رہتی ہے۔ مگر زندگی چلتی رہتی ہے۔'' پھر پرمود سے پوچھا، ''اور تمھارا کیا ارادہ ہے؟ ان چھٹیوں میں ہندوستان جاؤ گے؟''

''میں؟'' پرمود نے کہا، اور پھر رک گیا۔ ''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہندوستان تو شاید نہ جاؤں، ممکن ہے اسی علاقے میں کہیں ایران وغیرہ ہو آؤں۔'' بمبئی؟ وہاں جانے کو اس کا جی نہ کرتا تھا۔ امریکہ؟ دو ہفتے کی چھٹیوں میں وہاں جانے کا خیال بے معنی تھا۔ بہرحال، پرمود کسی بھی جگہ جانے کے لیے ایسا بے تاب نہ تھا جیسا فرانسوا بیروت جانے کے لیے تھا۔

اچانک پرمود نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ سڑک کے کنارے چھوٹی چھوٹی خشک جھاڑیاں سی تھیں اور ان پر خاکی کاغذ کی بہت سی نئی نکور چھوٹی تھیلیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ بہت ساری تھیلیاں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی بھی تھیں۔ کوئی دکاندار تھیلیوں کا گٹھا کار یا بس کی چھت پر رکھے لے جا رہا ہوگا؛ ہوا کے زور سے گٹھا سڑک پر گر پڑا ہوگا اور تھیلیاں اڑ کر اِدھر اُدھر بکھر گئی ہوں گی۔ یہ خاکی رنگ کی خستہ تھیلیاں اس بنجر علاقے کی خودرو جنگلی جھاڑیوں میں اٹکی اتنی ہی عجیب معلوم ہو رہی تھیں جیسے جانداروں سے خالی بے آب و گیاہ سیارے پر ہوں۔

ناصریہ گاؤں سے گزرنے کے کچھ دیر بعد اُر کا زیگورات دکھائی دینے لگا۔ اس سپاٹ زمین پر

افق کے پاس وہ بہت نمایاں تھا۔ سڑک سیدھی اس کی سمت بڑھی چلی جارہی تھی۔ دھیرے دھیرے زیگورات بڑا ہوتا گیا۔ چار ہزار سال پرانی عمارت اب تک مضبوط اور سیدھی کھڑی تھی۔ سڑک کے ایک جانب ایک بہت بڑا فوجی کیمپ پھیلا ہوا تھا۔ ایک دو روسی جیپیں جاتی دکھائی دیں۔

فرانسوا نے گاڑی بالکل زیگورات کے قدموں کے پاس جا کر روکی۔ اتنے قریب سے زیگورات حملہ آور سا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک نہ کوئی پہاڑی تھی نہ کوئی نشیب؛ نہ کوئی پیڑ تھا نہ دریا اور نہ کچھ اور۔ اگر آس پاس کچھ ہوتا تو اس ہیبت ناک عمارت کی موجودگی کا تاثر کسی قدر ہلکا ہو جاتا؛ نگاہ کو کسی قدر سکون میسر آتا۔ لیکن میلوں دور تک پھیلے ہوئے سپاٹ بھورے میدان کے بیچوں بیچ — بیچوں بیچ؟ — صرف اینٹوں اور گارے سے بنائی ہوئی یہ وشال عمارت کھڑی تھی۔

اوپر جانے کے لیے اینٹوں کا جیسا زینہ سامنے کی طرف تھا ویسے ہی زینے داہنی اور بائیں طرف بھی تھے۔ لگتا تھا زینوں اور دیواروں کی مرمت کی گئی ہے۔ زینے کے پاس کھڑے محافظ نے پرمود سے کیمرا نیچے چھوڑ کر جانے کی ہدایت کی۔ فوجی کیمپ نزدیک ہونے کے باعث اوپر کیمرا لے جانا ممنوع تھا۔

عمارت کی چوٹی پر کبھی ایک معبد تھا۔ اس معبد کا دیوتا اردگرد کے سپاٹ میدان میں قائم انسانی بستیوں پر نگاہ رکھتا تھا۔ اب نہ معبد تھا، نہ دیوتا اور نہ اردگرد کی بستیاں۔ اب دیوتا کی جگہ پرمود کھڑا اردگرد کے خالی پن کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے کو وہاں دور ایک طرف فوجی کیمپ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ چوٹی پر ہوا تیز محسوس ہوتی تھی۔

لنچ کے بعد پرمود نے کہا، ''اب اریدو چلتے ہیں۔'' فرانسوا بولا، ''وہاں کوئی نہیں جاتا۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔ وہاں کا زیگورات بالکل کھنڈر ہو چکا ہے۔'' لیکن پرمود کے اصرار پر فرانسوا وہاں جانے کو راضی ہو گیا۔

اریدو سولہ میل اور آگے تھا۔ اُر تک کی سڑک جتنی اچھی تھی ویسی یہ سڑک نہ تھی۔ زمین اور زیادہ بنجر اور ناہموار لگ رہی تھی۔ دور اریدو کا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ اُر جتنا اونچا نہیں تھا۔ اُر تک جانے والی سڑک بالکل سیدھی تھی جبکہ یہاں وہ بل کھاتی چل رہی تھی۔ یہاں بھی فوجی موجودگی تھی۔ ایک جگہ

Scanned with CamScanner

چوکی کے پاس فرانسوا نے گاڑی روکی۔ دو چار سوال پوچھ کر سپاہی نے انھیں آگے جانے دیا۔

ٹیلے کے قریب پہنچ کر فرانسوا نے گاڑی روکی۔ یہاں کوئی نہیں تھا، محافظ تک نہیں۔ سب کچھ سنسان تھا۔ ایک بڑا سا ٹیلہ، اس کے کنارے پر اینٹیں بکھری ہوئی، آس پاس چھوٹے چھوٹے کچھ اور ٹیلے تھے۔ سمیریوں کے اس اہم شہر کا یہی کچھ باقی بچا تھا۔

دونوں ٹیلے پر چڑھ کر اوپر پہنچے۔ بھربھری زمین میں پیر دھنس رہے تھے۔ زگورات کی باقیات بس یہ ٹیلہ ہی تھا؛ زینہ وغیرہ کچھ نہیں۔ ٹیلے کے چاروں طرف اینٹیں بکھری پڑی تھیں۔ بہت سی اینٹوں پر کنائی فارم (cuneiform) حروف کھدے ہوئے تھے۔ فرانسوا ایک اینٹ اٹھا کر غور سے دیکھتے ہوئے بولا، ''ان اینٹوں کو یہاں کیوں ڈال دیا گیا؟ محققوں کو انھیں مطالعے کے لیے ساتھ لے جانا چاہیے تھا۔''

''ان پر کوئی اہم چیز لکھی ہوئی نہیں ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''صرف حساب کتاب کے اعداد درج ہیں۔ محققوں کے کسی کام کے نہیں۔ ایسی ہزاروں اینٹیں دریافت ہوئی ہیں۔''

فرانسوا بولا، ''چلو، ایک آدھ اینٹ لے چلتے ہیں، سووینیر کے طور پر!''

فرانسوا ٹیلے کی ڈھلان پر کوئی اچھی چھوٹی سی اینٹ ڈھونڈنے لگا اور پرمود ٹیلے کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ اریدو سمیریوں کے طاقتور دیوتا اِنکی کا مسکن تھا۔ چالاک، ہوشیار، باعلم، چابکدست منتظم، انکی یہاں سے سب انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی اور تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ کھلے سپاٹ میدان میں ہوا بے قابو ہو کر گرد اڑا رہی تھی۔ گرد بدن پر، کپڑوں پر، عینک کے شیشوں پر جم رہی تھی۔ کچھ دیر بعد فرانسوا ہاتھ میں ایک چھوٹی اینٹ لیے اوپر آیا۔ پرمود نے اس سے کہا، ''یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ اُر تو ٹورسٹوں کے مطلب کی جگہ ہے۔ یہ جگہ زیادہ اصلی معلوم ہوتی ہے۔''

''لیکن یہاں دیکھنے کو کچھ نہیں،'' فرانسوا بولا۔ پھر کہنے لگا، ''دھول بہت اُڑ رہی ہے۔ اب چلیں؟''

پرمود نے کہا، ''میں یہاں کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتا ہوں۔ تم نیچے جا کر تھوڑی دیر گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' فرانسوا اینٹ ہاتھ میں لیے ٹیلہ اترنے لگا۔ اس کا پستہ قد ہیولا چھوٹا ہوتے ہوتے دور چلا گیا۔

Scanned with CamScanner

اردگرد کی خشک بنجر زمین کے 'مرکز' میں ٹوٹی بکھری اینٹوں کے درمیان پرمود بیٹھا رہا۔ ہوا کانوں میں گونج رہی تھی۔ گرد اڑ کر مسلسل اسے لگ رہی تھی: بالوں میں، عینک پر، شیشوں کے پیچھے پلکوں پر، ہونٹوں پر جم رہی تھی، اور ذرا سی حرکت کرنے پر کرکرا پن محسوس ہوتا تھا۔ دور اجاڑ میدان سے آنے والی نامعلوم ہوا تاریخ کی دھول اڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔

کانوں میں گونجتی ہوا اور بدن پر بیٹھتی دھول سے پرمود کا ذہن سُن سا ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے باقی سب کچھ غائب ہوتا گیا۔ ذہن میں صرف ہوا سرسراتی گونجتی رہی اور دھول اڑتی رہی۔ جس مقام پر چار ہزار سال پہلے انگی کا معبد کھڑا ہوگا، وہاں بیٹھے پرمود کے دماغ کو کسی انجانی طاقت نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اسے آئیڈنٹٹی کے بارے میں اپنے خیالات دھندلے سے یاد آئے تو اسے خود پر ہنسی آنے لگی۔ اِس وقت یہاں یہ سب کچھ بے معنی معلوم ہو رہا تھا۔ ہندوستان اور امریکہ کا فاصلہ، انسانوں سے انسانوں کا فاصلہ، اور سب دوسری چیزیں اس چلتی ہوا کی گونج میں اپنے معنی کھو بیٹھی تھیں۔ پرمود کو لگا جیسے وہ ابدیت کے بہاؤ میں بہا چلا جا رہا ہے۔ بدن پر دھول کی تہیں جمتی ہوئی محسوس کرتے ہوئے بھی پرمود کو اس جگہ سے اٹھنے کی خواہش نہ ہوئی۔ مکمل آزادی اور خالص پن کے اس بے انت بہاؤ سے باہر قدم رکھنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

بہت دیر بعد پرمود اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگیں سُن ہو گئی تھیں۔ گھڑی کے ڈائل پر سے ریت کی تہہ صاف کر کے اس نے وقت دیکھا؛ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے وہاں بیٹھا رہا تھا۔ فرانسوا گاڑی میں بیٹھا بیٹھا جھلا رہا ہوگا۔ پرمود پہاڑی اترنے لگا۔

''آ گئے تم؟'' فرانسوا نے کہا۔ ''مراقبہ پورا ہو گیا تمھارا؟''

''آئم سوری۔ تمھیں اتنی دیر راہ دکھائی۔''

''دیٹس آل رائٹ۔ تمھاری موجی طبیعت کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔'' پھر وہ بولا، ''لیکن پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے تم پربت سے لوٹتے ہوئے موسیٰ کی طرح دکھائی دے رہے تھے! کون سا آسمانی پیغام ساتھ لائے ہو؟''

''کیسا آسمانی پیغام!'' پرمود ہنستے ہوئے بولا۔ ''چہرے اور تمام بدن پر جمی دھول لایا ہوں!'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ریت کا ذائقہ محسوس کیا۔

Scanned with CamScanner

فرانسوا نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ شام ہونے کو تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔

فوجی چوکی کے پاس گاڑی پھر رکی۔ حوالدار نے فرانسوا کو چوکی میں بلایا۔ پرمود بھی ساتھ گیا۔ حوالدار نے فرانسوا سے کچھ پوچھا۔ فرانسوا نے پرمود کو بتایا، ''پوچھ رہا ہے ہم اتنی دیر یہاں کیا کرتے رہے؟'' پرمود بولا، ''اس سے کہہ دو، ہم سیر کر رہے تھے، اور کچھ نہیں۔'' لیکن حوالدار اس سے مطمئن نہ ہوا۔ ''اس ویران جگہ میں آپ لوگ کیا سیر کر رہے تھے؟ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' فرانسوا اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔

پھر حوالدار بولا، ''آپ لوگ یہیں بیٹھیے۔'' یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ فرانسوا اور پرمود چپ چاپ بنچ پر بیٹھ گئے۔

حوالدار لوٹا۔ وہ دونوں کو کچھ دور پر واقع کیبن میں لے گیا۔ وہاں ایک افسر تھا۔ دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ افسر نے دونوں کے شناختی کارڈ دیکھے اور انگریزی میں پوچھا کہ وہ کہاں کام کرتے ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔

''آپ کہتے ہیں، پہاڑی پر بیٹھ کر دیکھ رہے تھے — کیا دیکھ رہے تھے؟''

''ایسے ہی، آس پاس کا منظر،'' پرمود نے جواب دیا۔ اسے لگا کہ جواب دینے کی ذمے داری فرانسوا سے زیادہ اس کی ہے۔

''لیکن وہاں دیکھنے کو کیا رکھا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔''

''یہ تو ٹھیک ہے،'' پرمود دھیمی آواز میں بولا۔ ''لیکن اینٹیں وغیرہ تو ہیں... اور مجھے وہ جگہ پسند آئی۔''

''ٹھیک ہے۔ دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ... لیکن ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھ کر دیکھنے کے قابل وہاں کیا چیز ہے؟''

''کچھ خاص نہیں... یہ سچ ہے۔ بس مجھے وہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔''

''بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا؟ اتنی دھول میں؟'' پرمود کے ریت سے اٹے بال، چہرہ، کپڑے دیکھتے ہوئے افسر نے کہا۔

احمقوں کی طرح تھوڑا سا ہنس کر پرمود نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھرائی۔

Scanned with CamScanner

"تو آپ لوگ اس ڈھول میں بس بیٹھے رہے — دو گھنٹے تک؟"

"ہاں،" پرمود نے کہا۔

فرانسوا نے افسر کو سگریٹ پیش کیا۔ اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ فرانسوا سگریٹ جلا کر زور زور سے کش لینے لگا۔

"آپ کے پاس دوربین تو نہیں ہے؟"

"نہیں نہیں، دوربین وغیرہ کچھ نہیں ہے۔"

"گاڑی میں؟"

"نہیں۔ آپ آ کر دیکھ لیجیے۔"

کچھ لمحوں تک افسر میز پر رکھی چیزوں سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے دونوں کے نام پتے درج کیے۔ "ٹھیک ہے، آپ یونیورسٹی کے پروفیسر لوگ ہیں، اس لیے میں آپ کو جانے دے رہا ہوں،" افسر نے کہا۔

باہر آ کر فرانسوا نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور پھر اسے جوتے کے نیچے مسل دیا۔ "مجھے لگ رہا تھا، وہ ہمیں حوالات میں ڈالنے والا ہے!" فرانسوا بولا۔

"کچھ دیر کے لیے تو مجھے بھی یہی محسوس ہوا تھا،" پرمود نے کہا۔

"تمھارے پہاڑی مکاشفے نے تو ہمیں مصیبت میں ڈال دیا تھا!"

پرمود لٹکے ہوئے چہرے کے ساتھ ہنسنے لگا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ "اس جھنجھٹ میں اور دیر ہو گئی،" فرانسوا نے کہا۔

"آئی ایم سوری،" پرمود بولا۔

"نہیں نہیں، یہ قصہ تو ہوتا رہتا ہے۔"

گاڑی کی رفتار پھر تیز ہوئی تو پرمود کو خیال آیا کہ ابدیت کا وہ ٹیلہ تاریخ کے جنگلے سے گھرا ہوا ہے۔ پہاڑی سے اترتے ہی پتا چلتا ہے کہ ہم ایک دم حال کی گرفت میں آ گئے ہیں۔

راستے میں انھیں ایک طرف چائے اور کولڈ ڈرنک کا کھوکھا دکھائی دیا۔ گاڑی روک کر فرانسوا نے کہا، "پیپسی پیئیں؟ آئی تھنک آئی نیڈ اِٹ۔" (I think I need it.)

Scanned with CamScanner

''آئی نیڈ اِٹ ٹو۔'' (.I need it too)

پیپسی پیتے پیتے پرموداچانک زور سے بولا،''سالی کیا مصیبت ہے! تمھیں یاد ہے، جب ہم سمندر کی طرف گئے تھے، وہاں سمندر خاردار تاروں کے پیچھے تھا۔ اب یہاں دوسری طرف آئے ہیں تو یہاں بھی یہی قصہ ہے۔ کیا ہر سمت اسی طرح باڑ لگی ہوئی ہے؟''

''ہمیں اس سے کیا...'' فرانسوا نے کہا۔

فرانسوا نے گاڑی تیز چلائی۔ اردگرد کے علاقے کا گدلا پن تیزی سے کالا پڑتا جارہا تھا۔ جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی خاکی کاغذ کی تھیلیاں جو جاتے وقت نظر آئی تھیں، ایک بار پھر نظروں کے سامنے سے گزریں۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔

5

پرمود نے بڑی محنت سے جولیس سیزر میں سے مکالموں کی کاٹ چھانٹ کی، جہاں ضرورت تھی وہاں زبان کو آسان کیا؛ پھر اس نئے روپ کو ماریا سے اسٹینسل کروایا اور اس کی نقلیں بنوائیں۔ صبری کے ساتھ مل کر ڈرامے کے لیے طلبا کا انتخاب شروع کیا۔ لیکن پھر طالب علموں کا مڈٹرم امتحان آ گیا اور طے ہوا کہ ریہرسل امتحان کے بعد شروع کی جائے۔

ایک دن وہ ماریا کی میز کے سامنے سے گزرا تو وہ بولی،'' ل پرمود، آج کل تمھیں بات کرنے کی فرصت نہیں ہے؟''

پرمود ہنس کر بولا،''میں اس ناٹک کے سلسلے میں ذرا مصروف ہوں۔'' وہ ماریا کی میز سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

اسٹینسل پر ٹائپ کی ہوئی ایک پوری سطر کو ماریا نے سرخ اِنک لگا کر مٹایا تھا، اور اس کی تیز مہک آرہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ماریا کا بہت وقت اس اِنک سے غلطیاں درست کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس کی ٹائپنگ 'پروفیشنل' قسم کی نہیں تھی، یہ بات واضح تھی۔ باتیں کرتے کرتے پرمود نے کہا، ''آج گھر جاتے وقت کار میں لفٹ دے سکتی ہو؟''

ماریا اپنی کرسی پر پیچھے کو ہوئی، کچھ دیر سامنے دیکھ کر سوچتی رہی، پھر پرمود کی طرف دیکھتے

Scanned with CamScanner

ہوے بولی، ''یس، وائے ناٹ۔''

بارش کے دن ماریا پرمود کے فلیٹ پر پہلی بار آئی تھی، اور اس کے بعد دو ایک بار اور۔ لیکن اپنے گھر ہونے والی پارٹی کے بعد وہ پہلی بار آئی۔ پارٹی کے دن وہ بڑی پرجوش تھی، زور زور سے ہنستے ہوے باتیں کر رہی تھی، لیکن آج چپ چپ لگ رہی تھی، رنگت بھی پیلی سی تھی۔ پرمود کو احساس ہوا کہ اس کا موڈ ایک انتہا سے دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔

سگریٹ ہاتھ میں پکڑے ماریا بیٹھی رہی۔ عام طور پر وہ بولتی رہتی تھی اور گفتگو کو جاری رکھتی تھی۔ پرمود کو خود بات چیت آگے بڑھانا مشکل لگتا تھا۔ وہ کچھ بے چین سا ہو کر اٹھا اور جا کر ریفریجریٹر میں سے پیپسی کی دو بوتلیں نکال لایا۔

''اُس دن کی پارٹی اچھی رہی،'' بات آگے بڑھانے کی غرض سے پرمود بولا۔ لیکن فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ یہ بات چھیڑی۔

ماریا نے دھیرے سے ہنس کر بولی، ''مروت میں بات مت کرو، پرمود۔ اُس شام تمھارا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔''

''وہ، بات یہ ہے — اتنے سارے لوگوں میں گھر کر میری حالت عجیب سی ہو جاتی ہے۔ اگر اجنبی لوگ ہوں تو اور بھی زیادہ۔ اکیلے کسی شخص کے ساتھ میرا ٹھیک جمتا ہے۔''

''ہاں، اور وہی شخص بات بھی کرتا رہے!''

پرمود ہنسنے لگا۔ ''زیادہ تر لوگوں کو بات کرنے میں مزہ ہی آتا ہے، میری خوش قسمتی سے۔ اگر میں بات چیت کرنے میں اچھا نہیں ہوں تو کیا کر سکتا ہوں!''

''ہوں، تو تم اپنے اندر محفوظ رہو اور دوسرے لوگ تمھارے سامنے دل کھول کر رکھ دیں!''

''ایسی بات نہیں لیکن —'' پھر کچھ چڑ کر کہنے لگا، ''لیکن تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ میرا مقصد دوسروں سے کوئی فائدہ اٹھانا تو نہیں ہوتا۔''

کرسی سے اٹھتے ہوے ماریا بولی، ''آئی ایم سوری، پرمود۔ تمھیں تکلیف پہنچانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بس آج میں کچھ چڑچڑی ہو رہی ہوں۔'' اس نے پرمود کی میز پر رکھا ہوا ہاتھی دانت کا چھوٹا سا ہاتھی ہاتھ میں اٹھا کر کچھ دیر اسے غور سے دیکھا، پھر کہا، ''مجھے لگتا ہے، ہم ضرورت سے زیادہ

Scanned with CamScanner

قریب ہو گئے ہیں۔"

بعد میں دونوں پلنگ پر خاموشی سے ساتھ ساتھ لیٹے رہے۔ ہوا میں کچھ خنکی سی تھی۔ ماریا نے چادر دونوں پر اوڑھ لی۔ پرموداس کی گردن کی پشت کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ موڑ کر پرمود کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ہاتھ چھوڑ کر بولی، "یو نو، ہم دونوں ایک دوسرے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔" پشت کے بل سیدھی ہو کر وہ چھت کو تکنے لگی۔ پھر بولی، "مجھے ڈر لگتا ہے... کہیں زیادہ اِنوالو نہ ہو جاؤں۔" پرمود جواب میں کچھ نہ بولا تو کہنے لگی، "کچھ بھی ہو، میں اپنی شادی کو قائم رکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے پرمود کی طرف دیکھا۔ "اور تم بھی آج کل کچھ کٹے کٹے رہنے لگے ہو، کیوں، ہے نا؟"

"نہیں تو... لیکن میں بھی سوچ رہا تھا، کہ اس طرح ہم کہاں تک جا سکتے ہیں۔ پتا نہیں کب یہ تعلق قابو سے نکل جائے۔"

"کیسی عجیب بات ہے، ہے نا؟ دو انسان نزدیک آتے ہیں، لیکن صرف اس حد تک کہ ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا لیں۔ دونوں کا باقی وجود، جو انگلیوں سے دور پھیلا ہوتا ہے، الگ الگ رہتا ہے۔ اس وقت ہم دونوں ساتھ ہیں... اور بس۔ ہماری زندگیوں کا باقی حصہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہے گا، ہمیشہ۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے،" پرمود نے کہا۔

"اور اس شہر میں میری زندگی ایسی ہے — جیسے دریا اپنے بہاؤ سے آہستہ آہستہ ریت میں گہرا اترتا جا رہا ہو۔" پھر ہاتھ اٹھا کر بولی، "مجھے ایک سگریٹ دینا۔"

پرمود نے سگریٹ اس کے ہونٹوں میں اٹکایا اور اس کے لائٹر سے سلگایا۔ پھر کچھ یاد کرتا ہوا سا بولا، "اس دن صبری کی بات سن کر مجھے جھٹکا سا لگا کہ اب یہاں کے لوگ غیر ملکی بیویوں کو ملک میں نہیں لا سکیں گے۔"

"سچ ہے،" ماریا نے کہا۔ "نئے قانونوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔"

"یعنی تم اور تمھاری پارٹی کی سہیلیاں اب کسی اضافے کی توقع نہیں کر سکتیں؟ تم لوگوں کو پہلے سے زیادہ اجنبیت محسوس نہیں ہو گی؟"

''ہو سکتا ہے۔''

''اس دن پارٹی میں مجھے خیال آیا کہ تمھارا 'فارن وائیوز' کا گروپ ایسی مخلوق معلوم ہو رہا تھا جو ختم ہونے والی ہو!''

''یس، پرمود، یو سا اِٹ رائٹ!'' (You saw it right.) ماریا زور زور سے ہنستے ہوئے بولی۔ ''ہم واقعی ختم ہوتی ہوئی مخلوق ہیں۔ ہم اسی طرح ایک دوسرے کے گھر پارٹیوں میں جاتی رہیں گی، بوڑھی ہوں گی، ایک دوسرے کو بوڑھی ہوتے دیکھتی رہیں گی۔ ہم — 'فارن وائیوز'! پھر ہم ایک ایک کر کے ختم ہوتی جائیں گی۔ یس، دیٹس ہاؤ اِٹ وِل بی۔'' (That's how it will be.)

''زندگی گزر جاتی ہے، کیسے بھی، کسی کی بھی،'' پرمود بولا، ''کہیں بھی۔''

ماریا کچھ دیر اپنے میں گم سوچتی دکھائی دی۔ پھر بولی، ''پرمود، تمھارا ٹائپ رائٹر کہاں ہے؟ پھر نظر نہیں آیا۔''

''پلنگ کے نیچے ہے،'' پرمود نے کہا۔

''پلنگ کے نیچے!'' ماریا زور سے ہنستے ہوئے بولی۔ ''اچھی جگہ چھپایا تم نے! اسے استعمال بھی کیا یا نہیں؟''

''ابھی نہیں؛ ایسے ہی پڑا ہے۔ لیکچروں اور ناٹک کی مصروفیت میں وقت ہی نہیں ملا۔''

ماریا نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ بجھایا اور پرمود کی طرف گردن گھمائی۔ چادر کے نیچے اس کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی، ''میں دوبارہ یہاں آؤں گی یا نہیں، مجھے شک ہی ہے۔''

پرمود کو ایک دن اچانک احساس ہوا کہ اس نے بہت دنوں سے سنیما نہیں دیکھا ہے۔ سنیما دیکھنے کی ضرورت ذہن میں کہیں گہری اتری ہوئی ہوتی ہے؛ لاشعور یا تحت الشعور کی کوئی بھوک یقیناً اندھیرے میں ان پرچھائیوں کو چلتے پھرتے دیکھنے سے تسکین پاتی ہے۔ دو تین ہفتے کوئی فلم نہ دیکھو تو ذہن کو بے کلی سی محسوس ہوتی ہے۔ جسم میں کسی وٹامن کی کمی کی طرح، کئی بار ہمیں ٹھیک سے پتا نہیں چلتا کہ اس بے کلی کی وجہ کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

پرمود اٹھ کر فرانسوا کے فلیٹ کی طرف چل دیا۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ پرمود کو زیادہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ پرمود کو لگتا تھا کہ وہ کالج سے جلدی ہی چلا جاتا ہے، کیونکہ اس کے زیادہ لیکچر نہیں تھے۔ فرانسوا کی عمارت میں ہندوستانی پاکستانی کھانوں کی مسالے دار خوشبوئیں سونگھتا ہوا پرمود سڑک پر آیا۔ حمید کے پاس جانا بے کار تھا: حمید سنیما نہیں دیکھتا تھا۔

چلتے چلتے پرمود کو خیال آیا، حمید بالکل سنیما نہیں دیکھتا، کمال ہے۔ اس کے تحت الشعور کا تناؤ کیسے کم ہوتا ہوگا؟ لیکن شاید اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہوگا: کیونکہ اس کے تحت الشعور کا فوکس پوری طرح اللہ پر ہے۔ اسی لیے اس کا ذہن ہمیشہ تناؤ میں رہتا ہے۔ اس طرح جینا تو بڑا مشکل ہوتا ہوگا۔ اگر کسی دن یہ تناؤ بڑھ کر ٹوٹ گیا تو؟

پرمود اس علاقے میں پہنچا جہاں سنیما گھر تھے۔ چوک میں کچھ بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ چوک کے بیچ میں لگی ''شیر بابل'' کی سیمنٹ کی بنی بڑی سی شبیہ کا رنگ کھرچ کر اس پر نیا رنگ کرنے کا کام چل رہا تھا۔ میونسپلٹی کی کرین والا ٹرک لایا گیا تھا اور کرین پر بیٹھا ہوا ایک آدمی شیر کا رنگ کھرچ رہا تھا۔ چوک کے گرد فٹ پاتھوں پر کھڑے لوگ اس تقریب کا نظارہ کر رہے تھے۔ پرمود بھی کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ زمین پر چت پڑا ہوا آدمی اور اس پر کھڑا ہوا طاقتور شیر: اس غیر متناسب شبیہ میں ایک عجیب وحشی طاقت محسوس ہوتی تھی۔ اصل ننگی مجسمے کا اثر اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہوگا۔

پرمود چل پڑا اور کچھ دور آگے جا کر اسے عقیل دکھائی دیا۔ وہ بھی کھڑا شیر کی شبیہ کو دیکھ رہا تھا۔ پرمود کو دیکھ کر اس نے ہمیشہ کی طرح زور سے کہا، ''ہیلو بڈی! واٹس اَپ؟'' چوک کے بیچ لگی شبیہ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پرمود بولا، ''یونہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر یہ شیر اچانک دہاڑ اٹھے تو کرین میں بیٹھے اس آدمی کی کیا حالت ہوگی!'' پرمود یہ کہہ کر ہنسا اور عقیل بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ وہ اتنی اونچی آواز میں ہنس رہا تھا کہ آس پاس کھڑے کچھ لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ہنستے ہنستے عقیل نے پرمود کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کا منھ نزدیک آیا تو پرمود کو وسکی کی بو محسوس ہوئی۔

پرمود نے عقیل سے پوچھا، ''سنیما چلتے ہو؟'' عقیل نے کچھ غائب دماغی کے انداز میں جواب دیا، ''ہاں، ٹھیک ہے۔'' چلتے چلتے کہنے لگا، ''میری گاڑی وہاں کھڑی ہے۔ یہ نئی خریدی ہوئی بوتل اس

میں رکھتے چلیں۔'' بوتل کو گاڑی میں رکھتے ہوئے بولا، ''اسکاچ مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ ابھی پرسوں تک چار دینار کی تھی؛ اب پانچ کی ہوگئی۔''

دو سینما گھر پاس پاس واقع تھے۔ وہاں جا کر دیکھا تو ایک میں جاپانی سائنس فکشن فلم چل رہی تھی، دوسرے میں ایک 'اسپاگیٹی ویسٹرن' ۔ اٹالین کاؤبوائے فلم۔ پرمود نے عقیل سے پوچھا، ''کس میں چلیں؟''

عقیل بولا، ''جاپانیوں کے ربر مانسٹرز کے کرتب دیکھنے میں کیا مزہ، کاؤبوائے فلم دیکھتے ہیں۔''

پرمود نے کہا، ''جاپانیوں نے اب انگریزی میں سائنس فکشن فلمیں بنانا بھی شروع کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کا ارادہ اس مارکیٹ پر بھی قبضہ کرنے کا ہے۔ کمال ہیں یہ جاپانی بھی!''

کاؤبوائے فلم میں بھی کچھ زیادہ دم نہ تھا۔ چھوٹی موٹی لو بجٹ فلم تھی۔ عقیل نے کہا، ''یہاں ہمیشہ اسپاگیٹی ویسٹرن ہی لائی جاتی ہیں۔ اصل امریکی کاؤبوائے فلمیں دکھانی چاہئیں۔ اگر جان وین کی کوئی فلم چل رہی ہوتی تو دیکھتے!'' پھر وہ جان وین کی اچھی اچھی فلموں کو یاد کرنے لگا۔ قریب سے کسی نے شش شش کی آواز نکالی تو چپ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد پھر بولنے لگا۔ کہا، ''پرمود، یہ بیکار فلم دیکھنے کے بجائے کیوں نہ میرے گھر چلیں۔ ٹی وی دیکھیں اور گپ شپ کریں۔ شاید ٹی وی پر کوئی دلچسپ چیز آ رہی ہو۔''

تھوڑی بہت ہچکچاہٹ کے بعد پرمود نے کہا، ''ٹھیک ہے۔'' اسے خیال ہوا کہ عقیل اگر اسی طرح بڑبڑ کرتا رہا تو لوگ زیادہ چڑیں گے اور خواہ مخواہ گڑبڑ ہوگی، اس لیے باہر نکل جانا ہی بہتر ہے۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندھیرے میں عقیل کو زینے پر ٹھوکر لگی۔

دونوں باہر کے ہال کی روشنی میں آ گئے۔ سینما گھر سے باہر نکلنے کا دروازہ بند تھا۔ دونوں دروازے کے پاس پہنچے تو دربان عقیل کے پاس آ کر بات کرنے لگا۔ عقیل نے چڑ کر اس سے کچھ کہا۔ پھر پرمود کی طرف مڑ کر بولا، ''کہتا ہے کہ فلم پوری ہونے سے پہلے باہر نہیں جا سکتے۔ آخر تک بیٹھنا پڑے گا!'' پھر دربان سے اونچی آواز میں دوبارہ بحث کرنے لگا۔ اس کے بیچ میں انگریزی میں چلایا، ''آئی وانٹ ٹو گیٹ آؤٹ! آئی جسٹ وانٹ ٹو گیٹ آؤٹ آف ہیئر!'' دربان کو شاید اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی ہوگی۔ عقیل کی آواز سن کر منیجر کے کیبن سے نکل کر ایک آدمی ان کے پاس آیا۔

Scanned with CamScanner

پرمود کو لگا کہ یہ بیکار کی جھک جھک ہے۔ عقیل کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوے بولا، ''جانے دو یار! کیوں دل پر لیتے ہو۔ چلو اندر چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' عقیل نے بات نہ مانی۔ حجت کرتا رہا۔ خیر، آخر پرمود اسے سمجھا بجھا کر اندر لے جانے میں کامیاب ہوا۔

اندر جاتے ہوے عقیل نے پرمود کو بتایا، ''یہ ضابطہ ابھی حال میں نافذ ہوا ہے۔ کچھ عرصے پہلے کربلا میں ایک جگہ بم برآمد ہوا تھا۔ تب سے سکیورٹی کے خیال سے سینما گھر سے لوگوں کے بیچ میں باہر نکلنے پر پابندی لگ گئی ہے۔ انھیں ڈر ہے کہ اندھیرے میں کوئی بم رکھ کر نہ چلا جائے۔''

دونوں دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھے۔ عقیل بڑبڑایا، ''مجھے ڈرنک چاہیے تھا۔ لیکن یہ سالے باہر نہیں جانے دیتے—باسٹرڈز!'' پرمود سے ملاقات ہونے سے پہلے وہ پی رہا تھا، اب اترتے ہوے نشے سے اسے جھنجھلاہٹ ہو رہی ہوگی۔

عقیل سیٹ پر پھیل کر بیٹھ گیا اور سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں، لیکن اس کی کسمساہٹ جاری رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود کو کھینچ کر سیدھا کیا اور کہا، ''پرمود، میں یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ باہر ہال میں جا کر بیٹھتا ہوں۔''

''میں بھی آ کر بیٹھوں تمھارے ساتھ؟'' پرمود نے پوچھا۔

عقیل بولا، ''نہیں نہیں، تم فلم دیکھو۔''

عقیل اٹھا۔ قطار سے باہر نکلتے ہوے اس کا پاؤں کسی کے پاؤں پر پڑا اور اس آدمی نے غصے سے کچھ کہا۔ پرمود کو فلم پر کچھ خاص دھیان نہیں دے پایا۔ فلم ختم ہونے پر باہر آیا تو عقیل ہال میں کاؤچ پر بدن ڈھیلا کیے پھیل کر بیٹھا خالی نظروں سے سامنے تک رہا تھا۔ پرمود کو دیکھ کر جھکتے ہوے انداز میں اٹھا۔ لگتا تھا اس کا نشہ اب تک خاصا اتر چکا ہے۔ اس نے پرمود سے کہا، ''آئی ایم سوری۔ آئی ہیو بین اَ بٹ آف اَنیوسنس۔'' (I've been a bit of a nuisance.)

''او نو!'' پرمود بولا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ عقیل نے پچھلی سیٹ پر رکھے ہوے لفافے کو اٹھا کر اس میں سے بوتل نکالے بغیر ڈھکن کھولا اور وسکی کا ایک گھونٹ لیا۔ پھر اس نے بوتل پرمود کے سامنے کی۔ پرمود نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ ''تو چلو، میرے گھر چلتے ہیں،'' عقیل نے کہا۔

Scanned with CamScanner

عقیل کا دومنزلہ بنگلے جیسا مکان بہت وسیع اور خوبصورت تھا لیکن نظر انداز کیا ہوا لگتا تھا۔ صفائی ستھرائی میں کمی محسوس ہوتی تھی۔ عقیل نے بوتل بیچ کی میز پر رکھ دی اور اندر چلا گیا۔ پرمود نے دیوان خانے پر نظر ڈالی۔ کونے میں ایک چھوٹی میز پر بیٹی اور اس کی بیٹی کا فوٹو رکھا تھا۔ دو گلاس اور برف کے کیوب لیے عقیل باہر آیا۔

بیٹی کے بارے میں بات کرنے سے پرمود بچنا چاہتا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ عقیل اس کے بارے میں بات کرنے کو بے تاب ہے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں، پھر عقیل بولا: ''کیوں نہ میں ساسجز کا ایک ٹن کھول لوں۔ بریڈ کے ساتھ کھالیں گے۔ پھر تمھیں کھانے کی فکر نہیں رہے گی۔''

پرمود نے کہا: ''ٹھیک ہے۔''

باورچی خانے سے واپس آ کر عقیل نے کہا: ''ساسجز اُبالنے کے لیے رکھ دی ہیں۔ پانچ منٹ لگیں گے۔'' وہ بیٹھ گیا، اپنا گلاس بنایا اور کہنے لگا: ''ساسجز سے بڑا آرام رہتا ہے! ویسے مجھے کھانا پکانے کا کچھ پتا نہیں، لیکن اب کچھ سیکھنا پڑے گا۔'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی، پھر پرمود کی طرف دیکھ کر بولا: ''بیٹی نے لکھا ہے کہ وہ یہاں واپس نہیں آنا چاہتی۔''

''اوہ، ریئلی؟'' پرمود نے کہا اور چپ ہو گیا۔

''یہاں رہنا اسے مشکل لگتا ہے،'' عقیل بولا۔ اس کا چہرہ کھنچا ہوا لگتا تھا۔ بہت پہلے یا باورچی خانے میں اسٹوو کے پاس کھڑے رہنے کی وجہ سے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے سامنے رکھے گلاس پر بھی برف کی ٹھنڈک سے اسی طرح کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ پھر اس نے گلاس اٹھایا تو بوندیں نیچے کی طرف بہنے لگیں۔

''لیکن وہ تمھیں تو نہیں چھوڑ رہی ہے نا؟''

''نہیں نہیں، یہ بات نہیں۔ بلکہ وہ تو کہتی ہے کہ اسے اب بھی مجھ سے پہلے کی طرح محبت ہے۔ اسی لیے یہاں واپس نہ آنے کا فیصلہ کرنا اسے اتنا بھاری لگا۔'' عقیل نے اپنا خالی گلاس بھرا اور پرمود کے آدھے خالی گلاس کو بھی بھر دیا۔ ''اس نے لکھا ہے کہ اگر میرے لیے ممکن ہو تو میں امریکہ آ جاؤں، مگر اس کے لیے یہاں لوٹنا مشکل ہے۔''

''تو پھر تم یہاں کی نوکری چھوڑ کر کیوں نہیں چلے جاتے؟ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

Scanned with CamScanner

عقیل عجیب طرح ہنسا۔ ''میں یہاں اٹک گیا ہوں۔ تمھیں معلوم ہے، میں یہاں آیا تھا کہ حکومت کی دی ہوئی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکوں۔ میری مرسڈیز کار، قیمتی فرنیچر وغیرہ بغیر ڈیوٹی کے لانے دیا گیا۔ گھر کے لیے سستی زمین ملی۔ اب میں سب کچھ چھوڑ کر جانا چاہوں تو یہ پورا پیسہ مجھے حکومت کو لوٹانا ہوگا۔ اتنا پیسہ کہاں ہے میرے پاس۔'' پھر ذرا رک کر بولا، ''اور صرف پیسے کا سوال نہیں۔ یہ مجھے نوکری چھوڑ کر جانے بھی دیں، تب نا! آنا آسان ہے، لیکن یہاں سے جانا آسان نہیں۔'' پھر اس نے ایک دم اٹھ کر صوفے کے پیچھے دو چکر لگائے۔ رک کر صوفے کی پشت پر زور سے گھونسا مارا اور بولا، ''مجھے جانا ہے، پرمود، مجھے بیٹی کے پاس واپس جانا ہے! لیکن آدمی جب چاہے اس ملک سے اٹھ کر جا نہیں سکتا۔ یہاں آتے وقت میں نے ان سب باتوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میں اتنا دوراندیش نہیں ہوں۔''

عقیل چپ ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ابھی ابھی بھرا ہوا گلاس میز پر رکھا تھا اور اس میں پڑے ہوئے برف کے کیوب ہلکی آواز پیدا کرتے ہوئے اس میں تیر رہے تھے۔ اس آواز سے عقیل پل بھر کے لیے چونکا، پھر گلاس کی طرف دیکھ کر اپنے آپ ہنسا۔ کچھ دیر گلاس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا، ''یو نو، برف کی اس آواز سے مجھے ایک پرانی بات یاد آئی۔ بیٹی اور میں شکاگو گئے تھے، سخت جاڑے میں۔ صرف ہم دونوں ہی تھے، صالحہ ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ شکاگو کی بھیانک ٹھنڈ! ہم دونوں مشی گن جھیل کے کنارے کھڑے تھے۔ جھیل کی سطح جمی ہوئی تھی؛ لگتا تھا جیسے اس پر چل کر اس پار جایا جا سکتا ہو۔ اچانک جمی ہوئی سطح کے نیچے برف کے تڑخنے کی آواز آئی۔ بیٹی نے کہا، مجھے اس آواز سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے کہا، ڈرو مت، میں ہوں تمھارے ساتھ...''

عقیل چپ ہو کر گلاس کو تکنے لگا۔ پھر ایک دم اٹھ کر بولا، ''ارے میں ساسجز کو تو بھول ہی گیا! زیادہ اُبل گئی ہوں گی اب تک۔''

ساسجز کے سینڈوچ بنا کر دونوں خاموشی کھانے لگے۔ باہر بنگلے کی چار دیواری کے دوسری طرف کوڑے کا ڈرم تھا۔ وہاں سے دو بلیوں کے غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باقی پورے علاقے میں مکمل خاموشی تھی۔

پرمود بے کو اٹھا تو عقیل نے کہا، ''تمھیں گاڑی میں چھوڑ آؤں کیا؟''

Scanned with CamScanner

لمحہ بھر سوچ کر پرمود بولا، ''نہیں، کیوں تکلیف کرتے ہو۔ میں اکیلا چلا جاؤں گا۔''

عقیل کی حرکات غیر متوازن ہو گئی تھیں؛ اب تک وہ بہت پی چکا تھا۔ پرمود کو لگا، بلاوجہ حادثے کا خطرہ لینے سے کیا فائدہ۔ امریکہ میں سفر کے دوران نیو میکسیکو میں گاڑی الٹ گئی تھی، تب سے پرمود کے دل میں حادثے کا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ عقیل نے پورچ کی بتی کا بٹن دبایا۔ بتی نہیں جلی۔ ''ڈیم اِٹ!'' وہ بولا۔ ''بتی چار دن سے خراب ہے۔ نیا بلب لانا روز بھول جاتا ہوں۔''

پرمود باہر نکلا۔ پورچ کے اندھیرے میں پیچھے مڑ کر بولا، ''بائے عقیل!'' عقیل کی پشت پر روشنی پڑنے سے دروازے میں اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عقیل نے کھنکتی ہوئی کھلنڈری آواز میں زور سے کہا، ''سی یو لیٹر، ایلی گیٹر!''

جولیس سیزر کی تیاری شروع ہو گئی۔ سہ پہر چار بجے کلاسیں ختم ہونے کے بعد ایک خالی کلاس روم میں ریہرسل ہونے لگی۔ کلاس روم کا پلیٹ فارم اسٹیج کا کام دیتا۔ پہلے دو تین دن صبری پرمود کے ساتھ رہا۔ پھر کہنے لگا، ''میرا یہاں کوئی خاص کام نہیں۔ پھر میرا نیا گھر بن رہا ہے، مجھے وہاں جانا پڑتا ہے۔ اب تم اکیلے ہی سنبھال لو۔''

جن طالب علموں کو ڈرامے کے لیے چنا گیا تھا وہ اس کے بارے میں خاصے پرجوش تھے۔ ان میں سے کچھ کو انگریزی مکالمے صفائی سے بولنے میں مشکل ہوتی تھی۔ پورشیا اور کیلپر نیا کے کرداروں کے لیے دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے کیلپر نیا کا انگریزی تلفظ صاف تھا۔ وہ عیسائی تھی۔ عیسائی طالب علموں کی انگریزی عموماً اچھی ہوتی تھی۔ ڈرامے کا جو حصہ چنا گیا تھا اس میں سیزر کا رول سب سے اہم تھا۔ اس کے لیے اداکار کا انتخاب زیادہ احتیاط سے کیا۔ شروان نامی ایک ذہین لڑکے کو وہ کردار دیا۔ شروان روانی سے انگریزی بولتا تھا۔ بعض دوسرے ذہین لڑکوں کی طرح وہ بھی ایکسنٹرک طبیعت کا تھا۔ بیشتر خاموش، اپنے آپ میں گم دکھائی دیتا؛ بیچ بیچ میں دو چار دن کلاس سے غائب رہتا۔ حافظہ اچھا تھا؛ اس نے اپنے مکالمے جلد ہی یاد کر لیے۔

ریہرسل شروع ہونے پر پرمود نے پایا کہ ہر کوئی ڈرامائی لہجے میں ہاتھ لہرا کر مکالمے ادا کرنے کا شوقین تھا۔ عام قاصد بھی بادشاہ کے انداز میں بولنے کی کوشش کرتا۔ انھیں سیدھے سادے طریقے

سے مکالمے بولنے پر آمادہ کرنے کے لیے پرمود کو خاصی محنت کرنی پڑی۔ شروان کی آواز بڑی پاٹ دار تھی اور اس کی ادائیگی بھی صاف تھی۔ وہ بڑے رعب دار انداز میں مکالمے بولتا۔ پرمود نے اسے اسی انداز میں بولنے دیا کیونکہ یہ سیزر کے کردار کے لیے مناسب تھا۔

کچھ ہی دنوں میں شروان اور پرمود کی اچھی جان پہچان ہو گئی۔ چہرے کے نقوش اور چال ڈھال کے لحاظ سے وہ پرمود کو زیادہ تر طالب علموں سے الگ محسوس ہوتا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ شروان کرد ہے۔ کرد لوگ عراق کے شمال کے پہاڑی علاقے کے رہنے والے تھے۔ وہ عربوں سے الگ اور ایرانیوں سے زیادہ قریب معلوم ہوتے تھے۔ شمالی عراق کی سرحد سے لگے ہوئے ایرانی اور ترک علاقوں میں بھی کردوں کی آبادی تھی۔ ایک دو سال پہلے عراقی کردوں میں زبردست شورش اٹھی تھی، یہ پرمود کو معلوم تھا۔ لگتا تھا اب وہ ہنگامہ سرد پڑ گیا ہے۔ ''آج کل سب ٹھیک ہے نا تمھارے شمالی علاقے میں؟'' پرمود نے شروان سے پوچھا۔

شروان ہنسا اور بولا: ''ہاں، سب ٹھیک ہے!''

شروان کو عام بول چال میں بھی بڑے بڑے کتابی لفظ استعمال کرنے کی عادت تھی۔ اب اس کے بولنے میں شیکسپیرین انداز بھی آ گیا تھا۔ اس نے سیزر کے کردار کو پوری طرح اپنے اندر سمو لیا تھا اور ہمیشہ اسی شاہانہ لہجے میں بات کرتا تھا۔ پرمود کی طرح ساتھی طالب علم بھی اس کے اس انداز سے محظوظ ہوتے تھے۔ وہ مذاق میں شروان کو سیزر پکارنے لگے۔

ایک دن کالج میں فرانسوا کو روک کر پرمود نے کہا، ''فرانسوا، آج کل تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کالج سے جلدی نکل جاتے ہو اور گھر پر بھی نہیں ملتے۔ میں ایک آدھ دفعہ تمھارے فلیٹ پر گیا تھا۔''

فرانسوا نے کہا، ''اور تم کہاں رہتے ہو؟ میں بھی ایک دو بار تمھارے فلیٹ پر گیا تھا۔''

''میں تو اس ناٹک کی مصروفیت کی وجہ سے شام کو دیر میں پہنچتا ہوں۔ تم کہاں رہتے ہو؟''

''میں فرنچ کیمپ میں جاتا ہوں زیادہ تر۔ ویسے کیمپ دور ہے لیکن وہاں وقت اچھا گزرتا ہے۔ کبھی تم بھی چلو۔''

Scanned with CamScanner

"چلوں گا، لیکن ابھی نہیں۔ ذرا یہ ڈرامے کا سلسلہ پورا ہو جائے۔"

دراصل ڈرامے کا کام پہلے کے کچھ دنوں کے بعد زیادہ وقت نہیں لیتا تھا۔ ریہرسل روز نہیں بلکہ ایک دن چھوڑ کر ہوتی تھی۔ پرمود نے سوچا کہ ڈراما تو خیر ہو ہی جائے گا، اب مجھے اپنے اصل کام پر دھیان دینا چاہیے۔ یعنی "آن آئیڈنٹٹی" والے مضمون کی تیاری شروع کرنی چاہیے۔ اب ٹالنے کے لیے کوئی بہانہ نہیں رہا؛ کچھ کتابیں آ گئی ہیں، ٹائپ رائٹر بھی آ گیا ہے۔ پھر پرمود نے بیٹھ کر سنجیدگی سے دو چار کتابیں پڑھیں اور کچھ سوچ بچار کیا۔ پھر فیصلہ کیا کہ مضمون کے نکات اپنی ابتدائی شکل میں کاغذ پر لے آنے چاہئیں۔ دن میں ایک بار میں زیادہ وقت ملنا مشکل تھا؛ رات کو کھانے کے بعد بیٹھنا ہی بہتر تھا۔ ایک دن پرمود ٹائپ رائٹر پلنگ کے نیچے سے نکال کر باہر کے کمرے کی میز پر لے آیا اور اس میں کاغذ لگا کر کچھ سوچنے لگا۔ کھڑکی کے نیچے سڑک تھی، اس کے باوجود رات کو اس وقت زیادہ تر خاموشی رہتی تھی۔ صرف جب نو بجے سینما کا شو چھوٹتا تو لوگ زور زور سے باتیں کرتے ہوئے گزرتے۔

کرسی پر سیدھا بیٹھ کر پرمود نے تین سطروں پر پھیلا ہوا ایک جملہ ٹائپ کیا۔ پھر رکا۔ اچانک اسے دھیان آیا کہ اس خاموشی میں ٹائپ رائٹر کی آواز بہت اونچی محسوس ہوتی ہے۔ اس آواز سے اس کے ذہن پر دباؤ سا پڑنے لگا۔ اسے لگا کہ سڑک پر گزرتا ہوا کوئی بھی شخص یہ آواز پہچان سکتا ہے — اور اس کا ٹائپ رائٹر غیر قانونی ہے۔ پھر پرمود کو خود پر ہنسی آئی؛ وہ اتنی سی بات کو کیوں اتنا بڑھا رہا ہے؟ بھلا کسی کو اس کے ٹائپ رائٹر سے کیوں دلچسپی ہونے لگی۔ خواہ مخواہ اس بچکانہ خوف کو اپنے اوپر سوار کرنے سے کیا حاصل؟

اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک کر پرمود نے اپنے موضوع پر غور کرنا شروع کیا، لیکن اس کے خیالات شکل نہیں لے پا رہے تھے۔ بہت دیر وہ یونہی بیٹھا رہا۔ کاغذ پر بس وہی ایک جملہ لکھا گیا تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ ٹائپ رائٹر کا ڈر، جسے وہ مضحکہ خیز سمجھ رہا تھا، اب بھی اس کے ذہن سے چمٹا ہوا ہے۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ سکون سے سوچنے پر یہ احساس کتنا بے بنیاد لگتا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ کوئی بے بنیاد احساس بھی، خواہش کے برخلاف، ذہن میں ڈیرا ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بیچ میں کھڑکی کے پاس رک کر اس نے سنسان راستے کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

چوک کے بائیں طرف ملٹری پولیس کے دو سپاہی اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑیاں گھماتے ہوئے مزے سے چلے جا رہے تھے۔

اسے ماریا کی کہی ہوئی بات یاد آئی: سکیورٹی ڈپارٹمنٹ کے پاس ہر ٹائپ رائٹر کے ٹائپ کا نمونہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! ایک کمپنی کے بنائے ہوئے دو ٹائپ رائٹروں کا ٹائپ کیا ایک جیسا نہیں ہوگا؟ لیکن سرسری نگاہ میں جو دو ٹائپ ایک جیسے دکھائی دیتے ہوں، ان میں بھی بہت باریک فرق ہو سکتے ہیں، جنھیں محدب عدسے سے دیکھ کر سائنسی تجزیے سے الگ الگ پہچاننا ممکن ہے۔ میں یہاں 'آئیڈنٹٹی' کے موضوع پر سوچنے بیٹھا ہوں اور یہاں یہ لوگ اس کے بارے میں کہیں زیادہ معلومات رکھتے ہیں — یہ تو ٹائپ رائٹر تک کی آئیڈنٹٹی کا پتا لگا سکتے ہیں۔

میز کے پاس بیٹھ کر پرمود پھر سے اپنے موضوع پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جب بات نہ بنی تو اس نے طے کیا کہ آج اس کا ذہن ٹھکانے پر نہیں ہے: کل پرسوں پھر بیٹھ کر سوچ بچار کرے گا۔ اس نے ٹائپ رائٹر کا ڈھکن لگایا اور اسے ایک بار پھر پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔

شروان دو تین دن ناٹک کی ریہرسل سے غیر حاضر رہا؛ کلاس میں بھی نظر نہیں آیا۔

پھر ایک دن وہ دفتر میں پرمود کے پاس آیا اور کہنے لگا، ''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کہو،'' پرمود بولا۔

کچھ دیر ہچکچانے کے بعد شروان نے کہا، ''کیا میں آپ سے گھر پر آ کر بات کر سکتا ہوں؟''

پرمود نے اس کی طرف دیکھا، لمحہ بھر سوچا اور کہا، ''ٹھیک ہے، آج شام کو آ جاؤ۔'' پھر وہ اسے پتا سمجھانے لگا۔

شروان بولا، ''مجھے معلوم ہے۔ میں نے آپ کو اس بلڈنگ میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

ٹھیک چھ بجے شروان نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس سے دس منٹ پہلے پرمود نے یونہی کھڑکی کے باریک پردے کے پیچھے سے سڑک پر نظر ڈالی تھی تو اسے شروان چوک کے دوسری طرف دکھائی دیا تھا۔ شاید وہ دیے ہوئے وقت سے پہلے آنے کے خیال سے چوک میں گھومتا رہا ہوگا۔

کچھ دیر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ شروان کو پرمود کی کتابوں میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

فرائیڈ کی Interpretation of Dreams دیکھ کر بولا، ''یہ میں نے عربی میں پڑھی ہے۔''

پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شروان نے کہا، ''سیزر کے کردار کے بارے میں میرے ذہن میں کچھ شبہات اٹھنے لگے ہیں۔''

''کیوں؟'' پرمود حوصلہ افزا انداز میں بولا، ''تمھارا کام تو سب سے بہتر ہے! تمھاری وجہ سے ڈرامے میں جان پڑ گئی ہے۔''

''لیکن... لیکن... مجھے اس منظر سے ڈر لگتا ہے،'' شروان دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سیزر کا قتل... وہ سارے سازشی... وہ سب کس طرح اسے گھیر لیتے ہیں، ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے آگے آتے ہیں، چیختے ہیں... اور سیزر کے جسم میں گھسنے والے خنجر... اور سیزر، ڈگمگا کر فرش پر گرتا ہوا...'' شروان خاموش ہو گیا جیسے یہ پورا منظر اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہا ہو۔ پھر بولا، ''اب تک کتنی بار اس منظر کی ریہرسل ہو چکی ہے؟ کم سے کم پانچ چھ بار۔ ہر بار میں خوف سے کانپنے لگتا ہوں... دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے ابھی رک جائے گا... جسم میں گھستے ہوئے خنجر...''

پرمود زور سے ہنس کر کہنے لگا، ''ارے شروان، یہ تو صرف کھیل ہے! تم سیزر نہیں ہو، صرف سیزر کا کردار کر رہے ہو۔ کوئی تمھیں قتل کرنے کی سازش نہیں کر رہا ہے۔''

''لیکن یہ کردار مجھے ہی کیوں دیا گیا؟ اس میں ضرور کوئی بھید ہے کہ اس کردار کے لیے مجھے چنا گیا،'' شروان سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ارے تمھیں اس کردار کے لیے میں نے چنا ہے! تمھاری انگریزی خاص طور پر اچھی ہے، اس لیے۔ اس میں اور کسی کا ہاتھ نہیں ہے۔''

''جب آپ نے مجھے چنا تھا تو مجھے خیال ہوا کہ مسٹر صبری اس پر ضرور اعتراض کریں گے۔ کہیں گے کہ یہ کردار کسی اور کو ملنا چاہیے۔ جب انھوں نے بھی اپ سے اتفاق کیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ سوچا کہ یہ کیسے ہو گیا۔''

''وہ تمھارے خلاف کیوں ہوں گے؟''

''ڈاکٹر پارمود، آپ ان باتوں کو نہیں جانتے،'' وہ دبی آواز میں ساز باز کے لہجے میں بولا۔

''ایک تو میں شمال کا رہنے والا ہوں، گرد۔ کردوں پر ہمیشہ شک کیا جاتا ہے! مسٹر صبری پارٹی میں ہیں؛ ہر طالب علم سے الگ الگ پارٹی میں شامل ہونے کو کہتے ہیں۔ جب مجھ سے کہا تو میں نے کہا، مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ممبر بن کر کیا کروں گا؟ پھر بھی انھوں نے دو تین بار مجھ سے بات کی۔ کہتے تھے، تم جیسے ذہین لڑکوں کی پارٹی کو ضرورت ہے۔ میں نے ہر بار انکار کر دیا۔ تب سے وہ مجھ سے بدگمان ہو گئے ہیں۔ اسی لیے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے ڈرامے میں اتنا اہم کردار نہیں کرنے دیں گے۔''

''مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا...'' پرمود منھ ہی منھ میں بولا۔

''لیکن اب مجھے لگنے لگا ہے کہ انھوں نے مجھے یہ کردار جان بوجھ کر دیا ہے۔ یہ لوگ مجھے ایک طرح کا پیغام دینا چاہتے ہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے!''

''اس پر تو دل نہیں ٹھکتا، شروان،'' پرمود نے زور سے ہنس کر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

لیکن شروان اپنی ہی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بولا، ''سازشیوں کا کردار کرنے والے تقریباً سب لوگ اسٹوڈنٹس یونین کے ہیں، پارٹی کے لوگ ہیں۔ جمال جو کیسکا کا رول کر رہا ہے، کٹر پارٹی والا ہے۔ میرے سینے میں خنجر بھونکتے ہوئے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتا ہے!''

شروان کے چہرے پر خوف اور شک کا ایسا جال سا پھیل گیا تھا کہ پرمود کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا اور کس طرح بات کرے، اگرچہ اپنے دل میں اسے یقین تھا کہ شروان کا خیال بے بنیاد ہے۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے طے کیا کہ شروان کی کہی ہوئی بات کا کھرا کھوٹا کچھ بھی ہو، اپنے ناٹک کے خیال سے شروان کو دلاسا دینا اور اس کے ذہن کو ٹھکانے پر لانا ضروری ہے۔ پرمود نے اونچی، بشاش آواز میں کہا، ''شروان، یہ سب تم نے بلاوجہ اپنے ذہن پر سوار کر لیا ہے۔ تمھارے شکوک سب بے بنیاد ہیں۔ تمھارا ان لوگوں سے جو کچھ بگاڑ ہو سو ہو، لیکن اس کا ناٹک سے کیا لینا دینا؟ کیا وہ اسٹیج پر تمھیں سچ مچ قتل کر ڈالیں گے؟ کیا لغو خیال ہے! تم دل لگا کر اپنا کام کرو۔''

شروان چپ بیٹھا رہا۔ پھر ماحول کو اور پرسکون کرنے کے لیے پرمود نے کہا، ''تم کردوں کے بارے میں مجھے بڑا تجسس ہے۔ ایک لحاظ سے تم لوگ ہم ہندوستانیوں کے نزدیک ہو۔ تمھاری کردی زبان عربی سے زیادہ ہندی سے قریب ہے۔'' پھر وہ دونوں بہت سے ہندی لفظوں کی کردی

Scanned with CamScanner

لفظوں سے مماثلت کی مثالیں تلاش کرتے رہے۔خاص طور پر ہندسے ایک جیسے تھے، مثلاً ہندی کا دو اور کردی کا دُو، جبکہ عربی کا لفظ بالکل الگ ہے۔"ایک طرح سے ہم ایک دوسرے کے دور کے رشتے دار ہیں!" پرمود نے کہا۔شروان ہنسا۔

کچھ دیر بعد شروان کی حالت پرسکون ہونے لگی اور وہ زیادہ آزادی سے بات کرنے لگا۔اس نے پرمود کو اپنے بارے میں بتایا۔اس کے والد نے کردستان کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا اور وہ اب جیل میں تھے۔ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے شروان کی آنکھیں پھر سے خلا میں دیکھنے لگیں۔

"وہ بڑا خوفناک زمانہ تھا۔انھوں نے ابا کو اس قدر ایذائیں دیں —" وہ رکا اور پھر کہنے لگا، "مجھ سے وہ سب یاد کرنا بھی سہا نہیں جاتا۔لیکن یادوں کو کوئی کیسے روک سکتا ہے، کیوں ڈاکٹر؟"

"لیکن تم نے اتنی دور جنوب کے کالج میں کیوں داخلہ لیا؟"

"حکومت جس یونیورسٹی میں بھیجے وہیں جانا پڑتا ہے۔حکومت یہاں کے طلبا کو کہیں اور پڑھنے بھیجتی ہے۔پہلے میں بغداد میں تھا۔وہاں مجھ پر ہمیشہ شک کیا جاتا تھا، میرے والد کے پس منظر کی وجہ سے۔حقیقت یہ ہے کہ میں اس طرح کی چیزوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔یہ میری طبیعت میں ہی نہیں ہے۔والد ضرور تحریک میں تھے، میں نہیں تھا۔مگر پھر بھی مجھ پر شک کیا جاتا تھا! پھر مجھے یہاں بھیج دیا گیا۔زیادہ تر کرد طالب علموں کو دور جنوب میں بھیجا جاتا ہے، تاکہ ہم سے کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔"

"میں نے تو سنا تھا کہ قومی یکجہتی پیدا کرنے کے مقصد سے ایک جگہ کے طلبا کو دوسری جگہ پڑھنے بھیجا جاتا ہے۔"

"کہاں کی قومی یکجہتی! خطرناک طلبا کو نیوٹرلائز کرنے کے لیے یہ طریقہ کارآمد رہتا ہے۔"

کچھ دیر بعد پرمود بولا، "شمال میں تو سب کچھ مختلف ہوگا، ہے نا؟ اونچے پہاڑ، درخت، وادیاں، سبزہ! یہاں جنوب میں تو سب کچھ سپاٹ ہے، میلوں تک کہیں کوئی پہاڑی نہیں۔"

"شمال بے انتہا خوبصورت ہے، ڈاکٹر پارمود!" شروان پرجوش آواز میں بولا۔"پہاڑوں اور وادیوں میں بہت مزہ آتا ہے۔تازہ پھل بے شمار، اور اتنی اچھی ہوا! تازہ کھلی پہاڑی ہوا! یہاں جنوب میں ہوا کتنی خراب ہے۔سمندر کے پاس ہونے کی وجہ سے ہر وقت نمی رہتی ہے۔سیلن اور پسینہ

Scanned with CamScanner

لانے والی پچھمی ہوا۔ کبھی کبھی مجھے جلاوطنی کا احساس ہوتا ہے۔ گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ سوچتا ہوں کب کردی پہاڑوں میں جا کر وہاں کی تازہ ہوا سے اپنا سینہ بھر سکوں گا۔''

''مجھے بھی پہاڑ بہت اچھے لگتے ہیں،'' پرمود نے کہا۔ ''یہاں کے لامحدود سپاٹ پن سے کبھی کبھی عجیب طرح سے قید میں ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ دوڑ دوڑ کر سینہ پھٹ جائے تب بھی کسی ایسے پوائنٹ پر نہیں پہنچ سکتے جہاں کوئی پرسپیکٹو مل سکے۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ سمیریوں نے اس علاقے میں اپنے اونچے زیگورات کیوں بنائے تھے!''

باہر لاؤڈ سپیکر پر اونچی کرخت آواز سنائی دینے لگی۔ کھڑکی کے سامنے چوک کے اُس پار کھلی جگہ میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ کوئی شخص تقریر کر رہا تھا۔ لوہے کی سلاخوں والے جنگلے پر عربی میں لکھے ہوئے رنگین کپڑے کے بینر لگا دیے گئے تھے۔ ''شاید کوئی جلسہ ہو رہا ہے،'' پرمود نے کہا۔

''مصری صدر سادات نے اسرائیل سے مذاکرات شروع کیے ہیں، اس کی مذمت میں مظاہرہ ہو رہا ہے،'' شروان نے کہا۔

باہر سے آتے ہوئے اونچے شور کی وجہ سے بات چیت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر شروان بولا، ''اب میں چلتا ہوں۔''

پرموداس کا بازو پکڑ کر ہنسا اور کہنے لگا، ''لیکن کل ریہرسل میں ضرور آنا۔''

پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے شروان بولا، ''ہاں، آؤں گا۔''

پرمود بہت دیر تک شروان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ شروان کے ذہن کا خوف اور شک بے بنیاد اور لغو ہے۔ اس کے ماضی کے تجربوں — خاص کر اپنے باپ پر ہونے والے تشدد — نے اس کے ذہن پر اثر کیا ہوگا، پرمود نے سوچا۔ اُس دن میرے ذہن میں بھی ٹائپ رائٹر کے سلسلے میں اسی قسم کے شبہات ابھر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے بنیاد اور لغو ہیں، لیکن کیا میں انھیں روک پایا تھا؟

اس کے بعد شروان پابندی سے ریہرسل میں آنے لگا۔ پرمود سیزر کے قتل والے منظر کے سوا باقی تمام منظروں کی ریہرسل کرواتا۔ پھر ایک روز شام کے وقت شروان اس کے گھر آیا۔ اصل بات پر

Scanned with CamScanner

نہ آتے ہوئے وہ پچھلی بار کی طرح اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

''ڈاکٹر پارموو، آپ کے پاس کتنی اچھی اچھی کتابیں ہیں!'' شروان پہلے کی طرح کتابوں پر نظر دوڑاتے ہوئے بولا۔

''تمھیں پڑھنا ہو تو دو ایک کتابیں لے جاؤ،'' پرمود نے کہا۔

کچھ سوچ کر شروان نے کہا، ''مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن آج کل جو حالات ہیں... میری جو ذہنی کیفیت ہے، اس میں مجھ سے ٹھیک طرح پڑھا نہیں جا رہا۔ جب بھی کچھ پڑھنا شروع کرتا ہوں، تو اس کا اپنی زندگی سے کوئی نہ کوئی تعلق نظر آنے لگتا ہے اور میں کتاب بند کر کے اسی بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں کسی بھی قسم کی کتاب اٹھاؤں، کسی نہ کسی طرح اس کا سرا میرے ذہن میں موجود خیالات سے جا ملتا ہے۔ اس لیے میں کوئی بھی کتاب پوری نہیں کر پاتا۔''

شروان کی بات سن کر پرمود کو بمبئی میں اپنے کالج کے دن یاد آ گئے جب شیلجا سے اس کی محبت کا زناٹے دار سلسلہ چل رہا تھا۔ اُن دنوں پرمود کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ کوئی بھی کتاب پڑھتا یا فلم دیکھتا، اس میں اسے اپنی زندگی کی حقیقت سے کوئی نہ کوئی تعلق دکھائی دے جاتا۔ پھر ایک دن شیلجا نے کہا کہ اسے بھی ایسا ہی تجربہ ہو رہا ہے! اُس وقت محبت کے گرداب کی وجہ سے ایسا ہو رہا تھا، اور اب شروان کو موت کے خوف سے یہ تجربہ ہو رہا ہے، پرمود کو یہ بات بڑی عجیب لگی۔

''ہاسٹل میں کچھ پڑھنا بھی چھپ چھپا کر ہوتا ہے،'' شروان نے کہا۔ ''کوئی بھی کتاب لے کر بیٹھوں تو وہ کندھے کے پیچھے سے جھانکنے لگتے ہیں کہ کیا ہے؟ کیا پڑھ رہے ہو؟ جیسے میں کوئی شرانگیز چیز پڑھ رہا ہوں۔'' شروان کی ہنسی ایسی تھی جیسے کانچ ٹوٹنے کی آواز۔ ''رات کو دیر تک جاگنا بھی ممکن نہیں۔ دوسرے لوگ چلانے لگتے ہیں: بتی بند کرو! بتی بند کرو!''

''ہاسٹل میں تو یہ مسئلہ عام طور پر پیش آتا ہے۔ اور سنگل روم ملنا مشکل ہوتا ہے۔''

''ہمارے ہاسٹل میں تو سنگل روم ہیں ہی نہیں۔ ہر کمرے میں چار پلنگ ہیں۔'' پھر کرسی کو پرمود کے پاس کھینچ کر، آگے کو جھک کر بولا، ''اب ایک نئی صورت حال سامنے آ گئی ہے۔'' شروان کچھ لمحے خاموش رہا، جیسے پرمود کو کوئی اہم بات بتانے والا ہو۔ میرے کمرے میں ایک پلنگ خالی ہوا تو وہ جمال کو دے دیا گیا — وہی جو کیسکا کا رول کر رہا ہے! اب اسے آپ کیا محض اتفاق کہیں گے؟''

Scanned with CamScanner

پرمود کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ شروان پھر کہنے لگا، ''جمال ہمیشہ مجھے 'جیل بیرز را!' کہہ کر پکارتا ہے۔ میں نے چڑ کر اس سے کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے، تو وہ اور زیادہ یہی کرنے لگا۔ کبھی کبھی میرے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں اور میں بڑی کوشش سے خود کو سنبھال پاتا ہوں۔'' گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں کی انگلیاں شروان نے سختی سے ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔ ''پرسوں رات میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ جمال رات کو دیر سے آیا۔ پی کے آیا ہوگا۔ وہ اور اس کے دوست ہمیشہ پینے جاتے ہیں۔ جمال آ کر میرے پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں ہلے جلے بغیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ میرا تمام جسم کانپ رہا تھا، میں بڑی مشکل سے خود کو اکڑائے لیٹا رہا۔ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد جمال اپنے پلنگ پر گیا۔ میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔''

آگے کو جھکے جھکے شروان نے گردن اٹھائی اور پرمود کی طرف دیکھا۔ گردن اٹھانے سے بھنویں اوپر کو اٹھ گئی تھیں اور سختی سے بھینچے ہوئے ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ شروان چونک کر اچھلا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بازوؤں کو سینے پر باندھ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ پرمود نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

''یہ رہے تمھارے رسالے — شرما نے پڑھ کر واپس بھجوائے ہیں،'' مکھر جی نے رسالے میز پر رکھ کر کہا۔

''تھینکس!'' پرمود نے کہا۔ ''کیسے ہیں شرما جی؟''

''کوئی خاص بہتری نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں ایک اور آپریشن کریں گے۔ لیکن پہلے آپریشن کی کمزوری تو ختم ہو لے!''

''کل پرسوں میں آپ کے ساتھ ہسپتال چلوں گا انھیں دیکھنے،'' پرمود نے کہا۔ اس نے مکھر جی سے بیٹھنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ کہنے لگا، گھر پر کچھ کام ہے، اور چلا گیا۔

دروازہ بند کر کے پرمود پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ شروان اپنی کرسی پر آگے کو ہو کر اور ٹانگیں اپنے سامنے سیدھی پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بازو سینے پر باندھے خاموش بیٹھا رہا۔ پرمود کو یہ خاموشی عجیب لگ رہی تھی لیکن طے نہ کر پایا کہ کیا بات کرے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ شروان سے یہ کہنا بے فائدہ ہے کہ وہ ان باتوں کو ذہن سے نکال دے۔ یہ کہنے سے شروان کے

Scanned with CamScanner

خیالات اور زیادہ مضبوطی سے اس کے ذہن میں پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتے۔ ٹوکے بغیر اس کی بات سنتے رہنے سے بھی ظاہر ہے یہی نتیجہ نکلتا۔ شروان اپنی سوچوں کے جال میں زیادہ سے زیادہ پھنستا چلا جا رہا تھا اور پرمود کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے اس جال سے نکالنے کی کیا تدبیر کرے۔ اچانک پرمود کو خیال آیا کہ مکڑا اور مکھی دو الگ الگ مخلوقات نہیں بلکہ ایک ہی مخلوق کے دو نام ہیں۔ پھر ایکا ایکی پرمود کو شروان سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس خوف کی وجہ کیا ہو سکتی ہے، یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ اور پریشان ہو گیا۔ خوفزدہ آدمی سے خوف کھانا ایک عجیب بات تھی۔ پرمود اٹھا اور کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ پردے ہٹنے کی سرسراہٹ ہوئی اور پھر سڑک کا شور زیادہ اونچا ہو کر کمرے میں بھر گیا۔

دوبارہ شروان کے پاس بیٹھ کر پرمود نے کہا، ''لیکن شروان، یہ لوگ اگر تمھارے پیچھے پڑے ہوئے بھی ہیں تو اس کا اس ڈرامے سے کیا تعلق؟ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ ڈرامے کی وجہ سے انھوں نے یہ سب شروع کر دیا ہو۔''

شروان ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا، ''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ ڈرامے کو تو وہ صرف چالاکی سے استعمال کر رہے ہیں۔ اصل میں وہ بہت دنوں سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اب معلوم ہوتا ہے انھوں نے اپنا جال کسنا شروع کر دیا ہے۔ یہ بڑے ہوشیار لوگ ہیں، ڈاکٹر پارمود! بڑے سکون سے اپنا کام کر ڈالتے ہیں۔''

پرمود جان گیا کہ شروان کے ذہن کا خوف ڈرامے کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ خوف اس کے ذہن میں بہت دن سے رینگ رہا تھا؛ ڈرامے سے صرف اتنا ہوا کہ وہ خوف سطح پر آ کر اس کے ذہن پر مسلط ہو گیا ہے۔

چار دن بعد شروان ایک بار پھر پرمود کے گھر آیا۔ بیٹھتے ہی کہنے لگا، ''معلوم ہے کل کیا ہوا، ڈاکٹر پارمود؟ کل شام ہاسٹل میں ہم تین چار لڑکوں نے کھانا پکانے کا ارادہ کیا۔ میں بازار سے فروزن چکن لے کر آیا۔ اسے پلاسٹک کے کور سے باہر نکالا۔ مرغی کا پیٹ صاف کر کے اس کی کلیجی، دل وغیرہ پلاسٹک کی چھوٹی سی تھیلی میں رکھ کر اسی میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں، جب میں نے اسے کھولا تو کلیجی اور دل تھا ہی نہیں!''

شروان کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے اس نے پرمود کو کوئی بڑا سنسنی خیز قصہ سنایا ہو۔ پرمود

Scanned with CamScanner

بولا، ''تو اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''ڈاکٹر پارمود، سیزر کے قتل سے پہلے بھی تو ایسا ہی بدشگون سامنے آتا ہے نا۔ مثلاً بھیڑ کا پیٹ چاک کرنے پر اس کا دل غائب ملتا ہے — انتہائی منحوس بات! — اور اب میں چکن خرید کر لایا ہوں تو اس کا دل اور کلیجی غائب!''

پل بھر کے لیے پرمود کو لگا کہ شروان مذاق کر رہا ہے۔ وہ کچھ دیر شروان کے چہرے کو تکتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس پر ہنسے یا روئے۔ پھر زور سے ہنستے ہوئے بولا، ''شروان، تم سیزر کے معاملے کو حد سے آگے لے جا رہے ہو۔ اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔''

شروان کا چہرہ اتر گیا۔ ''ڈاکٹر، مجھے اپنی جان کے لالے پڑے ہیں، اور آپ کو یہ مذاق معلوم ہوتا ہے!'' شروان چوٹ کھائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ کم از کم آپ مجھے سمجھتے ہیں، اسی لیے میں آپ کے پاس آتا ہوں۔''

پرمود نے جلدی سے کہا، ''ایسی بات نہیں، شروان۔ میں تمھاری کیفیت کا تصور کر سکتا ہوں۔ لیکن تم نے اس واقعے کا جو مطلب نکالا ہے وہ میرے دل کو نہیں لگتا، بس اتنی سی بات ہے۔ اس چکن کے پیکٹ میں دل کلیجی وغیرہ ڈالنا بھول گئے ہوں گے، اور کیا؟ اس طرح کے سینکڑوں چکن فیکٹری میں پروسس کیے جاتے ہیں؛ ایک آدھ پیکٹ میں ایسی چوک کبھی بھی ہو سکتی ہے۔''

''لیکن میرے ہی خریدے ہوئے پیکٹ میں کیوں؟'' شروان نے کہا۔ ''میرے ہی لائے ہوئے چکن کا دل غائب! کیا اسے صرف اتفاق کہا جائے گا؟''

پرمود کو احساس ہوا کہ اس موضوع پر زیادہ بحث کرنا بیکار ہے۔

اس کے بعد شروان چار پانچ بار پرمود کے گھر آیا۔ ہر بار کسی تازہ واقعے، کسی نئے اشارے کا ذکر کرتا اور اس سے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خوف اور شک کے دائروں کو دیر تک کھولتا رہتا۔ پرمود کا کام دراصل صرف سننا تھا۔ اسے خیال ہوا کہ وہ پردیسی ہے، 'آؤٹ سائیڈر' ہے، اس لیے شروان اس کے پاس آتا ہے۔ اسے کوئی اور شخص ایسا نہیں ملتا جس سے وہ کھل کر بات کر سکے۔ اور کسی پر اسے بھروسا نہیں ہے۔ شروان ایک طرح سے اس پر انحصار کرنے لگا ہے، اس خیال سے پرمود کو پریشانی سی ہوئی۔

Scanned with CamScanner

پرمود کو دو چار دن ماریا دفتر میں دکھائی نہ دی۔ پلاسٹک کے غلاف کے نیچے اس کا بڑا سا ٹائپ رائٹر جیسے پڑا سو رہا تھا۔ پرمود نے سوچا کہیں ماریا بیمار نہ ہو۔ پھر اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ماریا نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور اب نہیں آیا کرے گی۔ پرمود بہت دیر تک اس خبر کے بارے میں سوچتا رہا۔

کیا اسے ماریا کو فون کر کے اس کے گھر جا کر ملنا چاہیے؟ اس نے سوچا۔ لیکن بات آج کل پر ٹلتی گئی۔ انھی دنوں برٹش کاؤنسل کی طرف سے ایک گروپ ڈراما کھیلنے آنے والا تھا۔ اسے شیکسپیئر کے دو ڈراموں — ایک المیہ اور ایک طربیہ — میکبتھ اور ٹو ئلفتھ نائٹ — میں سے ایک ایک ایکٹ پیش کرنا تھا۔ ناٹک میں کام کرنے والے لڑکے لڑکیوں کے لیے اس گروپ کا کام دیکھنا مفید ہوگا، اس خیال سے پرمود اور صبری نے ان سب کو اُس دن آنے کی ہدایت کر دی۔ وہ سب بڑے شوق سے آئے۔ صرف شروان نہیں پہنچا۔ صورت حال یہ بنی کہ باقی سب موجود ہیں اور ہیرو غائب۔ سب طلبا نے اس پر ناگواری ظاہر کی؛ اس قسم کے تبصرے ہوئے کہ شروان کو ڈراموں سے دلچسپی نہیں، وغیرہ۔ صبری نے بھی تیوری چڑھا کر کہا کہ اس شروان کی خبر لینی پڑے گی۔

پرمود نے کہا، ''مگر اس کا کام تو بہت اچھا جا رہا ہے۔ اگر وہ اس شو میں نہیں آ سکا تو کیا فرق پڑتا ہے۔''

صبری چپ رہا۔

کھیل شروع ہونے سے کچھ پہلے پرمود کو تماشائیوں میں ماریا کی جھلک دکھائی دی۔ نزار اس کے ساتھ نہیں تھا لیکن ایک عورت ساتھ تھی جسے پرمود نے اُس شام پارٹی میں دیکھا تھا۔ کچھ کوشش سے پرمود کو اس کا نام یاد آ گیا: مارگریٹ۔ ابھی وہ بھیڑ میں ماریا کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ ہال میں اندھیرا ہو گیا اور پردہ اٹھ گیا۔ پہلی پیشکش میکبتھ کی تھی؛ وقفے کے بعد ٹو ئلفتھ نائٹ کی۔ گروپ میں صرف دو اداکار اور دو اداکارائیں تھیں۔ اس لیے ہر ایک کو باری باری کئی رول کرنے پڑ رہے تھے۔ وہ چابکدستی سے لباس تبدیل کر کے نئے کردار میں سامنے آ جاتے۔ یہ سب نہایت صفائی سے انجام دیا جا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

وقفے میں پرمود ہال کے باہر کی لابی میں آیا۔ کالج کے ناٹک میں کام کرنے والے طالب علموں نے اسے گھیر لیا اور وقفے سے پہلے پوری ہونے والی پیشکش پر بات کرنے لگے۔ پرمود کو محسوس ہوا کہ اس گفتگو میں اس کا حصہ لینا ضروری ہے، لیکن بیچ بیچ میں سر گھما کر ماریا کو تلاش کرتا رہا۔ وہ اسے بھیڑ میں مارگریٹ کے ساتھ اسنیک بار کی طرف جاتی نظر آئی۔ چند منٹ بعد طالب علموں کے گھیرے سے باہر نکل کر پرمود نے اسنیک بار کا رخ کیا۔

ہیلو ہائے کے بعد وہ تینوں کھڑے باتیں کرنے لگے۔ ڈرامے پر تبصرہ ہوا۔ مارگریٹ کو کچھ خاص دلچسپی معلوم نہ ہوتی تھی۔ وہ پیپسی پیتی رہی۔ پھر گھنٹی بجی اور ارد گرد کھڑے لوگوں کی بھیڑ ہال کے دروازے کی طرف سرکنے لگی۔ مارگریٹ نے ماریا کی طرف دیکھا۔ پرمود ماریا کو بڑے جوش سے اس ڈرامے کے بارے میں بتا رہا تھا جسے کالج کے طلبا پیش کرنے والے تھے۔ ماریا نے مارگریٹ سے کہا، ''تم اندر چلو، میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔''

پھر ایک منٹ دونوں چپ کھڑے رہے۔ پرمود نے بچا ہوا پیپسی کولا گلاس میں انڈیلا۔ وہ گلاس میں پھوٹتے ہوئے بلبلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر ماریا کی طرف دیکھ کر سوالیہ لہجے میں کہنے لگا، ''تم نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی؟''

''ہاں، چھوڑ دی۔ بوریت ہونے لگی تھی۔''

ماریا اتنا کہہ کر رک گئی تو پرمود بولا، ''نزار کے کہنے پر چھوڑی؟''

ماریا ہنسی۔ ''ارے نہیں! خود چھوڑی۔ اکتا گئی تھی۔'' اس نے اپنا گلاس رکھ دیا۔ ''اس پتھر جیسے ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھے رہنا مجھے پاگل پن معلوم ہونے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں جو کچھ کرنا چاہتی تھی اس سے اس کام کا کوئی تعلق نہیں۔''

''تم سچ مچ رومینٹک ہو!'' پرمود نے کہا۔

''شاید!'' ماریا ہنس کر بولی۔ ''ہم سبھی اندر سے رومینٹک ہوتے ہیں، کھلے یا ڈھکے چھپے!''

کچھ دیر رک کر پرمود نے کہا، ''کہیں تم نے میری وجہ سے تو ملازمت کو خیر باد نہیں کہہ دیا؟''

ماریا پل بھر رک کر بولی، ''کسی حد تک یہ بات بھی ہوگی۔ لیکن صرف یہی نہیں۔'' وہ درست لفظ تلاش کرتی ہوئی سی لگی۔ ''کہا نا، میں بالکل بور ہو چکی تھی۔'' وہ پھر رکی، اور اس کے لفظوں کا ساتھ

Scanned with CamScanner

دیتے ہوئے اس کا چہرہ بھی تھکن کا تاثر دینے لگا۔ پھر ایک منٹ بعد کہنے لگی، ''دراصل اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہے۔ اچانک دماغ میں لہری اٹھتی ہے کہ گھر سے باہر نکل کر کچھ کروں، خود کو کسی چیز میں مشغول کرلوں۔ تب میں ایسا کوئی بھی کام کرنے لگتی ہوں۔ یہ جوش زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مہینے رہتا ہے۔ پھر میری دلچسپی اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ پانچ چھ مہینے کے لیے پھر گھر بیٹھ جاتی ہوں — بچوں اور گھر کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہوں۔ پھر کہیں باہر جانے آنے کو جی بھی نہیں کرتا، بس گھر میں بیٹھے رہنا چاہتی ہوں۔ دراصل آج اس پروگرام میں آنے کا بھی میرا ارادہ نہیں تھا، مارگریٹ کو کمپنی چاہیے تھی اس لیے آ گئی۔''

پرمود نے اردگرد نظر دوڑائی۔ سب سنسان ہو چکا تھا۔ اندر کھیل شروع ہو چکا تھا۔ پھر ماریا مڑی، دونوں اندر گئے۔ اندھیری راہداری میں چلتے ہوئے انھوں نے دیکھا، ٹو ئلفتھ نائٹ کی پیشکش شروع ہو چکی تھی۔ میلوولیو وہ محبت نامہ پڑھ رہا تھا جو ماریا نے اسے اولیویا بن کر لکھا تھا، اور وہ اسے سچا سمجھ کر نہایت پرجوش ہوا اٹھا تھا۔ تماشائی اس کے مورکھ پن پر ہنس رہے تھے۔ اندھیرے میں ہنسنے والوں کے درمیان سے گزر کر پرمود اپنی سیٹ کی طرف جانے لگا۔

برٹش کاؤنسل کے کھیل کے اگلے دن شام کے وقت شروان پرمود کے گھر آیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ زینے پر دوڑتا ہوا چڑھا ہوگا۔ دروازے سے اندر آ کر کچھ دیر کچھ کہے بغیر کھڑا رہا۔ پھر اسی طرح خاموشی سے کمرے کے دوسرے گوشے میں کھڑکی کے پاس جا کر نیچے سڑک پر جھانکنے لگا۔ چار پانچ منٹ بعد مڑ کر کرسی پر آ بیٹھا، اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ اس تمام وقت پرمود خاموشی سے شروان کے بولنے کی راہ دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے کہ برٹش کاؤنسل کے شو میں کیوں نہیں آیا، لیکن پھر سوچا کہ یہ پوچھنا بیکار ہوگا۔

پھر شروان ایک دم گردن اٹھا کر اور آنکھیں کھول کر بولا، ''وہ آدمی میرا پیچھا کر رہا تھا! آخر میں نے اسے چکما دے دیا۔ تھوڑا سا پانی دیں گے، ڈاکٹر پارمود؟''

پرمود اندر جا کر ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آیا۔

گلاس خالی کر کے ہاتھ کی پشت سے منھ پونچھتے ہوئے شروان نے کہا، ''پچھلے کئی دن سے مجھے

Scanned with CamScanner

احساس ہورہا تھا کہ کوئی میرا پیچھا کررہا ہے!'' وہ کرسی سے اٹھ کر پرمود کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''ڈاکٹر پارمود، میرا آپ سے آ کر بات کرنا خطرناک ہے۔ میرا پیچھا کرنے والا شخص دروازے کے باہر کان لگا کر ہماری باتیں سن سکتا ہے۔ پچھلی بار جب میں آپ کے گھر سے باہر نکلا، تو اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص تیزی سے زینے سے نیچے اتر کر گیا ہے۔'' پھر وہ مڑ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''یہاں بات کرنا خطرناک ہے ڈاکٹر پارمود، بہت خطرناک ہے!'' اس نے پرمود کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''اب کیا کیا جائے؟'' وہ دوبارہ کرسی سے اٹھا، لیکن غیریقینی پن سے پھر بیٹھ گیا۔ ''ایسا کریں ڈاکٹر پارمود — کہیں باہر مل لیا کریں؟ باغ میں، سڑک پر، یا دریا کے کنارے؟ خالی سنسان جگہ پر ٹہلتے ہوئے ہماری باتیں کوئی نہیں سن سکے گا اور ہم بغیر کسی خطرے کے بات کرسکیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

شروان کے الفاظ پر غور کرنے کی پرمود کی طاقت اب تک خاصی زائل ہو چکی تھی۔ اس نے باہر ملنے کی تجویز مان لی۔ شروان کی موجودگی میں پرمود کی کیفیت کسی حد تک کسی ہپناٹائزڈ آدمی جیسی ہونے لگی تھی، لیکن اس کے جانے کے بعد اسے خیال آیا کہ اس نے یہ کیا نئی مصیبت مول لے لی ہے۔ اب کیا اس کے ساتھ سنسان گلیوں میں چکر کاٹنے پڑیں گے؟ اس کو ایک بار جھٹک ہی کیوں نہ دیا جائے؟

اور آخر یہ سب کہاں تک چلے گا؟ جس جال نے شروان کے دماغ کو جکڑ لیا ہے وہ اسی طرح کستا چلا جائے گا۔ میں اسے کہاں تک سہارا دے سکوں گا؟ ہمدردی سے اس کی بات سننا تو ٹھیک ہے، لیکن گہرائی میں اترتے ہوئے کسی دن کوئی مشکل صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔

پرمود کمرے میں تیز قدموں سے اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں الٹ سلٹ قدم مارتے اور بار بار واپس مڑتے ہوئے اس کے ذہن میں اٹک جانے کا احساس اور شدید ہو گیا۔ بیچ میں میز کے پاس سے ٹھوکر لگی تو وہ تھوڑا سا لڑکھڑا گیا۔ ایک لحاظ سے — گو کچھ دوسرے انداز سے، اس کی حالت بھی شروان کی سی ہو گئی تھی۔

شروان کا معاملہ اصل میں پیرانویا کے مرض کا ہے۔ اسے سائیکیاٹرسٹ کے پاس جانا چاہیے۔ وہ ایک طرح سے شروان کے سائیکیاٹرسٹ ہی کا کردار کر رہا ہے، لیکن وہ اسے کہاں تک سنبھال پائے گا۔ اسے پروفیشنل علاج کی ضرورت ہے۔ کیا اسے شروان سے سائیکیاٹرسٹ کے پاس

Scanned with CamScanner

جانے کے لیے کہنا چاہیے؟ لیکن یہ اتنا سادہ معاملہ نہیں۔ اگر اس نے وہاں جا کر یہ سب کچھ کہا تو سائیکیاٹرسٹ اس کا علاج کرنے کے بجائے اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ آخر کار اس کے ذہن پر چھائے ہوئے ڈر اور شک درست ثابت ہو جائیں گے؛ اس کا بڑا خراب نتیجہ نکل سکتا ہے۔ لہٰذا اسے شروان کو جہاں تک ہو سکے خود ہی سنبھالنا ہوگا۔

پھر پرمود کو خیال آیا، آس پاس شروان جیسے کتنے لوگ ہوں گے۔ حکومت اپنا آہنی پنجہ اٹھائے رہتی ہے اور اس کے بھاری سائے تلے لوگوں کے ذہنوں میں ڈر اور شک ابھرتے رہتے ہیں؛ ان کے ذہنوں پر پیرانویا کا گھیرا تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ شاید سب کی کیفیت شروان جیسی شدید نہیں ہوتی ہوگی، لیکن ڈر اور شک کی یہ کیفیت تھوڑی بہت شاید سب کو محسوس ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے ذہن میں بھیانک طوفان کا بیج چھپا ہوا ہے۔

اور یہاں کی حکومت باقی حکومتوں سے کچھ ایسی مختلف بھی نہیں ہے۔ پرمود کو امریکہ میں ہاسٹل میں گزارے ہوئے اپنے دن یاد آئے؛ ہاسٹل میں بہت سے ملکوں کے طالب علم تھے۔ ڈائننگ ہال میں ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ افریقہ، ایشیا کے الگ الگ خطوں، لاطینی امریکہ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے طلبا۔ تقریباً ہر ملک میں کسی نہ کسی طرح کی حکم شاہی تھی — دائیں بازو کی یا بائیں بازو کی — یا کوئی پرانی فرسودہ راج شاہی۔ کسی نہ کسی لیبل کے پیچھے حکومت کا آہنی پنجہ ہر ملک میں اٹھا ہوا ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے ملکوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں وردی پر فیتے اور تمغے سجائے بندوق شاہوں کی گرفت میں ہوتی ہیں۔ حکومت کے بڑے سے پنجے میں آ جانے والا فرد ہر قسم کے ڈر اور شک کے تسلط ہی میں جیتا ہے۔ اور جن کو ہم عموماً 'لوگ' کہتے ہیں وہ اسی طرح کے افراد ہوتے ہیں۔ شروان جیسے افراد ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد ایک دن پرمود دفتر میں بیٹھا تھا کہ صبری اس کی میز کے پاس آیا۔ کچھ دیر جولیس سیزر کے بارے میں بات چیت کے بعد صبری نے دبی ہوئی آواز میں کہا، ''یہ جو شروان ہے، اس کا برتاؤ آج کل عجیب سے عجیب ہوتا جا رہا ہے، ہے نا؟''

''ہاں، اس کا سبھاؤ ہے تھوڑا عجیب سا،'' پرمود بولا۔ ''ذہین لوگ کئی بار ایسے ہوتے ہیں۔''

''کم از کم تمھارے ساتھ اس کی اچھی بنتی ہے،'' صبری نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"ہاں، سچ ہے۔ اگر اس کے مزاج کا خیال رکھ کر بات کی جائے تو اس کا برتاؤ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ اور پھر اسے ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ ہمارے درمیان کسی نہ کسی موضوع پر بات ہوتی رہتی ہے۔"

"تم سے اس نے کوئی خاص بات کی ہے کیا۔" یہ کہہ کر صبری تھوڑا سا رکا، "یعنی حکومت کے بارے میں، پارٹی کے بارے میں؟"

"حکومت کے بارے میں؟ نہیں بابا! اسے تو لگتا ہے سیاست سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ اور مجھے بھی اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے اس موضوع پر ہماری کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔"

"اچھا؟" یہ کہہ کر صبری چلا گیا۔

اگلے ہفتے میں پرمود دو بار شروان کے ساتھ بھٹکتا پھرا۔ شروان اسے ویران انجانی گلیوں میں لے جاتا؛ اس کے نتیجے میں پرمود کو شہر کے اجنبی علاقوں کا علم ہوا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے بہت دیر تک چلتے رہتے۔ زیادہ تر شروان ہی بولتا رہتا؛ پرمود فقط بیچ بیچ میں تھوڑی بہت بات کرتا اور باقی وقت سنتا رہتا۔ شروان باتوں کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد مڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا۔

ایک بار وہ دونوں دریا کے کنارے چلتے چلتے سمندر کی طرف جا نکلے۔ تھک جانے کی وجہ سے منڈیر پر بیٹھ گئے۔ سڑک پر جاتی ہوئی گاڑیوں کے سوا آس پاس سناٹا تھا۔ ایک موٹر بوٹ بھک بھک کرتی ہوئی نیچے کی طرف آ کر شہر کی سمت مڑ گئی۔ شط العرب کی لہروں کے دوسری طرف گھاس سے ڈھکا ہوا ساحل بالکل سنسان تھا۔

"ان دنوں میرے ذہن میں بار بار خیال آتا ہے کہ کسی دن اٹھ کر اس ملک سے چل دوں،" شروان بولا۔

"کہاں جاؤ گے؟" پرمود نے پوچھا، "اور کیسے؟"

"اُس طرف!" شروان نے سامنے کی طرف ہاتھ لہرا کر کہا۔ "بس کشتی سے دریا پار کرنے کی بات ہے! ذرا سی دیر میں ایران کی زمین پر ہوں گا۔ اتنی لمبی سنسان سرحد سے ہو کر ایران میں داخل ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔"

Scanned with CamScanner

''اور اس کے بعد؟''

''مجھے فارسی آتی ہے؛ کچھ زیادہ دقت نہیں ہوگی۔ اسی طرح کے راستوں سے کوہ زگروس سے گزر کر شمال مشرق کی طرف جا سکتے ہیں۔ وہاں پہاڑوں میں میرے رشتے دار ہیں۔۔۔ بے شک، ایران میں بھی ہم لوگوں کی حالت کچھ خاص مختلف نہیں ہے!''

''ارے، پھر تمھاری پڑھائی کا کیا ہوگا؟ کیا اسے ادھورا چھوڑ دو گے؟ ایک بار تم پہاڑوں میں جا پڑے تو تمھارا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ تم جیسے ذہین طالب علم کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

''پڑھائی سے بھی کیا حاصل ہے؟ اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد بھی کیا ضمانت ہے کہ کسی اچھے کریئر تک پہنچ سکوں گا؟ کیا آپ کو معلوم ہے، ڈاکٹر پارمود، یہاں ایک شخص ہے جس نے عربی زبان میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور وہ پرائمری اسکول میں پڑھا رہا ہے! وجہ کیا ہے؟ پارٹی اس سے خفا ہے کیونکہ اس کا رجحان کمیونسٹوں کی طرف ہے۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ آج کل پارٹی اپنی گرفت کچھ زیادہ سخت کرتی جا رہی ہے؟''

''اور کیا! اب دیکھیے نا، کالج کے لیکچرر لوگ پہلے بھی زیادہ تر پارٹی ممبر ہوتے تھے، لیکن سب نہیں۔ اب تو ہر پروفیسر کو زبردستی ممبر بنایا جاتا ہے، دھمکی دی جاتی ہے کہ ممبر بنو ورنہ نوکری چھوڑو۔ اور ایک بار اس سبب سے نوکری چھوڑ دی تو پھر ظاہر ہے کہیں اور کوئی اچھی نوکری ملنا ممکن نہیں۔''

دونوں چپ چاپ بیٹھے کچھ دیر دوسری طرف کے پرسکون، غیر آباد ساحل کی طرف تکتے رہے۔

اس کے کچھ دن بعد دونوں چلتے چلتے ایک پرانے قبرستان کے پاس پہنچے۔ پرمود نے اونچے پھاٹک پر پتھر پر کندہ انگریزی عبارت پڑھی؛ یہاں پہلی جنگِ عظیم میں مارے گئے ہندوستانی فوجی دفن تھے۔ پھاٹک پر پرانا موٹا سا تالا پڑا تھا؛ لگتا تھا بہت دنوں سے کھولا نہیں گیا۔ اس قبرستان میں حاضری دینے آئے گا بھی کون۔ آہنی سلاخوں والے پھاٹک سے ٹیک لگا کر پرمود اندر دیکھتا رہا۔ ایک طرف بڑی سی صلیب لگی تھی جس کے پیچھے چھوٹی چھوٹی صلیبوں والی انگریز افسروں کی قبریں؛ دوسری طرف ہندو مسلم سپاہیوں کی قبریں۔ قبرستان کی دیکھ بھال کرنے والا ضرور کوئی رہا ہوگا، کیونکہ لان کی گھاس سلیقے سے کٹی ہوئی لگ رہی تھی۔ ہر طرف سکون چھایا ہوا تھا؛ برسوں سے چھایا ہوا سکون جس کے دوران ایک اور جنگِ عظیم بھی ہو چکی تھی۔ کون ہوں گے یہ ہندوستانی، جو اتنی دور کے ساحل پر آ

کر سور ہے ہیں؟ پرمود نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کسی تیسرے ملک کے بادشاہ کے لیے لڑتے لڑتے مارے جانے والے۔

دونوں پھاٹک کے پاس بنے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ شروان اپنے ہاسٹل کے ان ساتھیوں کے کچھ نئے قصے سنانے لگا جو اسٹوڈنٹس یونین میں تھے۔ وہ ہر بار کی طرح اپنے ذہن میں پھیلتے ہوئے شک کا جال بننے لگا۔ سنتے سنتے پرمود کے ذہن میں ایک خیال چکر کاٹتا رہا۔ اسے چاہیے کہ شروان کو اس کی ذہنی کیفیت صاف لفظوں میں بتا دے۔ اس حقیقت پسندانہ بیان سے شاید اس کے ذہن پر خوف کی جکڑ کچھ ڈھیلی پڑ جائے اور اس کے ذہن کی دنیا کسی قدر نارمل ہو جائے۔ ظاہر ہے، یہ کام بڑی احتیاط اور سلیقے سے کرنے کا تھا، ورنہ اس کی حالت اور بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

شروان کی بات پوری ہونے پر پرمود نے اس سے کہا، ''دیکھو شروان، تم ہمیشہ مجھ سے دوسروں کی باتوں کا ذکر کرتے ہو اور ان کے ارادوں کا تجزیہ کرتے رہتے ہو۔ لیکن کیا تم نے کبھی اپنے ذہن میں قائم تصورات کے بارے میں معروضی طریقے سے سوچا ہے؟''

شروان نے سوالیہ نگاہوں سے پرمود کی طرف دیکھا۔

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارا ذہن کبھی کبھی بھٹک جاتا ہے؛ خود ہمارے اپنے بنائے ہوئے تصورات میں الجھ جاتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ تمھارے ذہن کے تمام خیالات بے بنیاد یا غلط ہیں۔ بے شک، ان میں کچھ معنی ہوں گے۔ پھر بھی شاید تمھارا ذہن ان میں اپنی طرف سے بہت کچھ جوڑ لیتا ہو۔''

''لیکن ڈاکٹر—''

''میری بات سن لو! ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ ہمارا ذہن ایسا کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا اپنا ذہن ہوتا ہے! لیکن ذہن کی ایسی ابنارملٹی بہت سے لوگوں کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بہت دفعہ ہمارے ذہن میں موجود ڈر اور شک خود ہمارے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کیفیت کو پیرانویا کہتے ہیں—''

''ہاں ہاں، پیرانویا— میں نے تھوڑا بہت پڑھا ہے اس کے بارے میں!''

''تو تمھارے ذہن کے شکوک پر مجھے تھوڑا سا پیرانویا کا شائبہ ہوتا ہے۔''

''ڈاکٹر!'' شروان ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا، ''میں آپ کو جو کچھ بتا رہا ہوں، کیا وہ صرف میرے ذہن کا کھیل ہے؟ میں بڑی احتیاط سے ہر چیز کا مشاہدہ کرتا ہوں، اس کے معنی نکالتا ہوں — صرف کہانیاں نہیں گھڑتا! یہ محض پیرانویا نہیں ہے، ڈاکٹر۔'' شروان نے پرمود کے سامنے ایک چکر لگایا۔ پرمود ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے، کہ شروان نے اس کے سامنے رک کر کہا، ''اور ڈاکٹر، آپ کا خیال ہے میں پیرانویا میں مبتلا ہوں، لیکن آپ نے کبھی اس حکومت کے بارے میں سوچا ہے جس کے متعلق میرے ذہن میں یہ شکوک اٹھ رہے ہیں؟ اس حکومت کے پیرانویا کے بارے میں؟ پیرانویا مجھے نہیں، ڈاکٹر، اس حکومت کو ہو گیا ہے! ڈر اور شک کا جال حکومت کے دماغ کو جکڑے ہوئے ہے۔ تبھی وہ بلاوجہ مجھ جیسے آدمی کا تعاقب کرنے لگتی ہے۔'' شروان نے پرمود کے سامنے ایک اور چکر لگایا۔ پھر رک کر بولا، ''ڈاکٹر پارمود، آپ تو ابھی چند دن ہوئے یہاں آئے ہیں، آپ تصور نہیں کر سکتے کہ حکومت کا یہ پیرانویا کس طرح بڑھتا جا رہا ہے۔ ہماری یونیورسٹی ہی کو لیجیے — دو چار سال پہلے تک لڑکے لڑکیوں کو کوئی بھی کپڑے پہن کر آنے کی اجازت تھی، پھر یہ یونیفارم کی پابندی لگ گئی۔ اسکول کے بچوں کی طرح یونیفارم پہنا دیا — تاکہ اس طرح ہمارے ذہنوں کو کنٹرول کرنے کا ایک اور طریقہ مل جائے۔ ابھی پچھلے سال تک یونیورسٹی کے گیٹ پر چوکی نہیں تھی؛ کوئی بھی آ جا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے یہ چوکی بٹھا دی گئی۔ لوہے کی رکاوٹ لگا دی گئی۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہر طرف بڑھتی جا رہی ہیں۔ حکومت ہر چیز پر نگاہ رکھنے، ہر چیز پر اپنی گرفت اور مضبوط کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ حکومت کو ہر وقت شک، ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی اس کو ختم کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ اس طرح حکومت کا یہ مہیب پیرانویا بڑھتا جاتا ہے، ڈاکٹر، اور آپ کہتے ہیں کہ میں پیرانویا میں مبتلا ہوں!'' شروان نے پرمود کے سامنے ایک اور چکر لگایا اور پھر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں واپس چل پڑے۔ چلتے چلتے پرمود نے پیچھے مڑ کر ان ہندوستانی سپاہیوں کی قبروں پر ایک بار پھر نظر ڈالی۔

اس رات پرمود پلنگ پر لیٹ کر شروان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اسے لگا کہ شروان جو کچھ کہتا ہے وہ سچ ہے۔ صرف اسی ملک میں نہیں بلکہ بہت سے چھوٹے بڑے ملکوں میں یہی صورت حال ہوگی

Scanned with CamScanner

— حکومتیں اپنے قائم رہنے کی فکر اور پریشانی میں مبتلا رہتی ہیں؛ اسی شک کے باعث وہ ہر فرد پر نگاہ رکھنے، ہر فرد پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ اس طرح اِدھر حکومت کا پیرانویا بڑھتا جاتا ہے اور اُدھر اس فرد کے ذہن میں ڈر اور شک پھلتا پھولتا رہتا ہے۔ حکومت اور فرد کے پیرانویا کا یہ شر انگیز چکر اسی طرح بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ چھت پر نظر جمائے جمائے پرمود کو، احساس ہوا کہ یہ سب بے حد بھیانک ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اسے نیند نے آلیا۔

اگلی جمعرات کو ناٹک کی آخری ریہرسل تھی اور سنیچر کی شام کو اسے کھیلا جانا تھا۔ جمعرات کی صبح پرمود جلدی اٹھ بیٹھا۔ کلاس آٹھ بجے تھی۔ جاڑا جوں جوں قریب آ رہا تھا ہوا بدل رہی تھی، موسم کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ کہر چھا جاتی اور ہوا ٹھنڈی لگنے لگتی۔ پھر بھی اس میں نمی موجود تھی۔ کوٹ پہن کر باہر نکلو تو پسینہ آتا تھا؛ کوٹ اتار دو تو اچانک نم، سرد ہوا بدن کو چھوتی تھی۔ بڑا عجیب موسم۔

کھڑکی کھول کر پرمود نے موسم کا اندازہ کرنے کے لیے باہر جھانکا تو کہرا چھایا ہوا تھا۔ سڑک کے اُس پار بھی کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ چوک میں کھڑا ہتھوڑا اٹھائے ہوئے مزدور کا مجسمہ دھندلا اور کالا نظر آ رہا تھا۔ کہرے کی دنیا میں تیرتا دکھائی دیتا یہ مجسمہ بھوت کی طرح، کسی انجانی دنیا سے اتری ہوئی ڈراؤنی مخلوق معلوم ہو رہا تھا۔

نم کہرے میں سے گزر کر پرمود بس میں سوار ہوا۔ اس کے پہنچتے ہی پہلا گھنٹہ بجا۔ وہ لپکتا ہوا کلاس میں چلا گیا۔ کلاس سے باہر نکلا تو اسے ڈرامے میں حصہ لینے والے طالب علم صبری کے گرد گھیرا ڈالے دکھائی دیے۔ پرمود صبری کی میز کے پاس گیا۔ وہ صبری سے عربی میں بات کر رہے تھے۔ پرمود کو دیکھ کر ایک لڑکے نے کہا، ”سر، شروان غائب ہو گیا ہے!“

سب لوگ پرمود کی طرف مڑے۔ اسے معلوم ہوا کہ شروان دو دن سے غائب ہے۔ کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔

اب ڈرامے کا کیا ہو؟ سیزر کے بغیر تو ڈراما کھیلا نہیں جا سکتا تھا۔ اور دو دن میں کسی اور کو ریہرسل کرا کے سیزر بنانا بھی امکان سے باہر تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ڈرامے کا معاملہ ٹھپ ہو چکا ہے۔

سارے طالب علم شروان کو کوس رہے تھے کہ اس نے سب کچھ خاک میں ملا دیا، سب کی محنت پر پانی پھیر دیا اور ڈپارٹمنٹ اور کالج کا نام خراب کر دیا۔ ”مجھے شروع ہی سے اس پر بھروسا نہیں تھا،“

Scanned with CamScanner

صبری پرمود کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اس کے لچھن ٹھیک نہیں تھے۔ میں نے تمھارے اصرار پر اسے ڈرامے میں شامل کیا، اور دیکھو کیا انجام ہوا!''

پرمود نے کوئی جواب نہیں دیا۔

6

شروان کے غائب ہونے کے بعد پرمود نے کالج کے معمول کے کام کے سوا اور کسی چیز میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ اس کی اپنی سرگرمیاں بہت محدود ہو کر رہ گئیں۔ ماریا سے اب ملاقات نہ ہوتی تھی۔ فرانسوا فرنچ کیمپ میں اپنے فرانسیسی دوستوں کے ساتھ مشغول رہتا تھا، اس لیے اس سے بھی ملنا جلنا کم ہو گیا تھا۔ حمید نہ معلوم کہاں مصروف تھا، پرمود کو بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیا تھا۔ شرما ہسپتال میں پڑا تھا؛ مکھرجی شام کو خالی وقت میں زیادہ تر شرما کے پاس جا کر بیٹھتا تھا، اس لیے ان دونوں کا آنا جانا بھی بند تھا۔ پرمود آئیڈینٹٹی کے موضوع پر اپنے مضمون کی تیاری کے لیے مطالعہ کرتا اور نوٹس لیتا رہتا؛ لیکن اس سلسلے میں بھی اس میں کچھ خاص جوش پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ شروان کے معاملے نے اس کے ذہن پر افسردگی طاری کر دی تھی۔

کبھی کبھی شام کے وقت وہ ٹہلتا ہوا دریا کنارے جا نکلتا۔ وہاں کنارے پر واقع ہوٹل میں بیٹھ جاتا۔ ہوٹل دریا کے پاٹ کے بالکل نزدیک تھا اور اس کا دروازہ پانی کی طرف کھلتا تھا۔ دروازے کے پاس کی میز پر بیٹھ کر دریا کو دیکھتے رہنا اچھا لگتا تھا۔ شہر کو پیچھے چھوڑ کر افق میں غائب ہوتے ہوئے دریا پر نظر جمائے جمائے، آدمی کا ذہن بھی اس کے پانی کے ساتھ بہتا بہتا دور نکل جاتا ہے۔ پرمود کو لگتا کہ ہر شہر کے پاس دریا، جھیل، سمندر یا کم از کم کوئی پہاڑی ضرور ہونی چاہیے؛ اس سے آدمی کی زندگی کو ایک طرح کا تناظر مل جاتا ہے۔ اس بات کا شعوری یا غیر شعوری احساس کہ ہماری زندگیوں کے کنارے پر دریا بہتا ہوا سمندر کی طرف جا رہا ہے، ہمیں جینے میں مدد دیتا ہے؛ پہاڑی پر چڑھ کر ہم شہر پر اونچائی سے نظر ڈال سکتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی چیز میسر نہ ہو تو شہر میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ بلومنگٹن میں رہتے ہوئے پرمود اسی وجہ سے ناگواری محسوس کرتا تھا۔ مڈویسٹ میں واقع شہر؛ سمندر کا تو کیا ذکر، اس کے آس پاس تو کوئی جھیل، ندی یا پہاڑی تک نہ تھی۔ کبھی کبھی بہت گھٹن ہوتی؛ محسوس ہوتا کہ تناظر کہیں

گم ہو گیا ہے۔ تب پرمود ایک مخصوص سڑک سے ہو کر ایک پل پر جا کھڑا ہوتا۔ پل کے نیچے سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ دراصل اس علاقے میں مسافر گاڑیوں کا آنا جانا مدتوں سے بند تھا؛ بس کبھی کبھار کوئی مال گاڑی ہی گزرتی دکھائی دے جاتی۔ آس پاس اگی ہوئی جھاڑیوں کے باعث وہ ریلوے لائن متروک سی معلوم ہوتی تھی۔ پل کی اونچائی سے ریل بہت دور تک چھوٹی ہوتی ہوئی دکھائی دیتی رہتی۔ پرمود پل کی ریلنگ پر جھک کر اسے دیکھتا رہتا۔

شط العرب کے کنارے بیٹھے بیٹھے وقت اچھا گزر جاتا۔ دریا میں چھوٹی چھوٹی موٹر بوٹ لوگوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر لے جاتی رہتیں؛ ان کے انجنوں کا شور اٹھتا اور دھیما ہوتا رہتا۔ بہاؤ کے وسط میں بڑے جہاز لنگر ڈالے کھڑے ہوتے۔ کوئی جہاز کئی کئی دن اپنی جگہ کھڑا دکھائی دیتا رہتا؛ پھر کسی دن اچانک غائب ہو جاتا۔ شاذ و نادر ہی کوئی جہاز بیچ بیچ اوپر یا نیچے کی طرف جاتا نظر آتا تھا۔ ہاتھی جیسی دھیمی رفتار سے دریا کے بیچ حرکت کرتا جہاز کا بڑا سا پیٹا بڑا شاہانہ معلوم ہوتا۔ اچانک جہاز کا بھونپو بھاری، گہری آواز میں بج اٹھتا۔ جب کبھی ایسا جہاز گزر رہا ہوتا، دریا پار کرنے والی کشتیاں کنارے پر اپنی لگا میں کھینچے انتظار کرتی رہتی۔ بڑے جہاز کے گزر جانے کے بعد دیر تک دریا کے پانی کی اونچی لہریں ہوٹل کی ریلنگ سے ٹکراتی رہتیں۔ کبھی کبھی درمیانہ جسامت کی بادبانی کشتیاں دریا میں کھڑی دکھائی دیتیں۔ یہ کشتیاں دریا کے گہرے وسطی حصے کے بجائے کنارے کے قریب لنگر ڈالے رہتیں۔ یہ ہندوستان سے آئے ہوئے بیشتر کاٹھیاواڑی لوگوں کی کشتیاں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے تجارتی سامان لا کر اتارنے کے بعد کھجور وغیرہ لاد کر لوٹتی تھیں۔ ان دنوں کھجور کی نئی فصل ہونے کی وجہ سے اس قسم کی بہت سی کشتیاں آئی ہوئی تھیں۔ کنارے کے پاس لنگر انداز ہونے کے باعث ان پر ہونے والی سرگرمیاں صاف دکھائی دیتیں۔ کالے کاٹھیاواڑی لوگ عرشے پر کپڑے دھوتے سکھاتے، چھوٹے موٹے کام کرتے، یا بیڑی سلگا کر گپیں مارتے بیٹھے نظر آتے۔

ایک بار پرمود کو ایک لڑکا نہاتا دکھائی دیا۔ اس نے کشتی کے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر بدن پر صابن ملا اور پھر وہاں سے دریا کے پانی میں چھلانگ لگا دی، اور دو ڈبکیاں لگا کر پھر کشتی پر چڑھ گیا۔ نہانے کا یہ طریقہ پرمود کو بڑا دلچسپ لگا۔ اس قسم کی چھوٹی سی کشتی میں زندگی گزارنا بڑا انوکھا ہوتا ہوگا، اس نے سوچا۔

دریا کنارے کی اس کھلی جگہ میں بہت سے ہوٹلوں نے باہر کرسیاں میزیں لگا رکھی تھیں جو خاص 'بیٹھنے' ہی کے لیے تھیں۔ یہاں چائے اور کولڈ ڈرنک کے سوا کچھ نہ ملتا تھا۔ کچھ کھانا ہوتو دوسرے کسی ریستوران نما ہوٹل میں جانا ہوتا۔ صرف 'بیٹھنے' کی غرض سے بنائے گئے ان ہوٹلوں میں لوگ شطرنج، ڈومینو یا پانسہ کھیلنے کے لیے آتے تھے۔ کھیلنے کا سامان معمولی سے کرائے پر مل جاتا: اسے لے کر وہ گھنٹوں بیٹھے کھیل سکتے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ چائے یا پیپسی منگواتے، سگریٹ پھونکتے، اور آتے جاتے شناساؤں سے دعا سلام کرتے۔ وہاں بیٹھ بساط پر مہروں کی کھٹ کھٹ، پانسہ پھینکنے کی آواز، کھلاڑیوں کا جوش سے ہنسنا اور چیخنا سننے میں مزہ آتا تھا۔ دل بہلانے والا ماحول تھا۔

ایک بار پرمود بیٹھا پیپسی پی رہا تھا کہ ڈومینو کھیلنے والوں میں سے ایک شخص اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ پرمود کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنی گھنی مونچھوں کے نیچے سے ہنس کر کہنے لگا، ''ہیلو پروفیسر، مجھے پہچانا نہیں؟''

پرمود نے ہونٹوں پر زبان پھرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ پینتالیس پچاس کی عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ بال زیادہ تر اڑ چکے تھے۔ اپنا گنجاپن چھپانے کے لیے اس نے اس طرف کے بالوں کو لمبا کر کے دوسری طرف تک جمانے کی کوشش کی تھی۔ تیل چپڑ کر جمائے ہوئے بال اس کی چندیا کو چھپانے میں تو کیا کامیاب ہوتے، اس پر کچھ کچھ دور کالی پٹیاں سی جمی دکھائی دے رہی تھیں۔ پرمود کو یقین تھا کہ اس نے اس آدمی کو کہیں دیکھ رکھا ہے۔ لیکن کہاں، یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر آخر وہی بولا، ''اس دن آپ بینک میں میرے پاس آئے تھے نا!''

''ارے ہاں ہاں، برابر!'' پرمود نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ہیں! ایسا ہے کہ ایک جگہ کے آدمی کو دوسری جگہ دیکھیں تو دماغ میں ایک دم سلسلہ نہیں جڑتا۔ بیٹھیے، بیٹھیے!''

وہ شخص سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کرسی کا ایک ہتھا ڈھیلا ہونے کی وجہ سے ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر اسے ایک طرف سرکایا اور دوسری میز سے ایک اور کرسی کھینچ لایا۔

''لیکن آپ کا نام مجھے معلوم نہیں،'' پرمود بولا۔

''نام تو ہشام ہے، لیکن لوگ مجھے ابو فرید کہتے ہیں، یعنی فرید کا باپ۔''

''ہاں ہاں، اتنا تو میں بھی سمجھ لیتا ہوں۔''

''پھر اُس دن آپ کا کام ہو گیا تھا؟'' ابوفرید نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ آپ کے کہنے پر اس کلرک نے جھٹ پٹ کام کر دیا تھا۔ آپ چائے پئیں گے یا پیپسی؟''

''کچھ نہیں۔ ابھی چائے پی ہے،'' اس نے پرمود کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے آپ یہاں باقاعدگی سے آتے ہیں۔ میں نے دو چار بار آپ کو دیکھا ہے!''

''اکثر آتا ہوں۔ اچھا لگتا ہے یہاں!'' پرمود ہاتھ سے اردگرد اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دریا کا کنارا، کشتیاں اور موٹر بوٹ، اور آس پاس کھیل میں مشغول لوگ! سکون سے بیٹھنے میں لطف آتا ہے۔''

''آپ شطرنج وغیرہ نہیں کھیلتے؟''

''نہیں، مجھے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اور شطرنج تو ذہن کو آرام دینے کے بجائے سر میں درد کر دیتی ہے!''

دونوں خاصی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اٹھتے وقت ابوفرید نے پرمود کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور پتا وغیرہ سمجھایا۔

ابوفرید کی فرید کے علاوہ سلوئی نام کی ایک بیٹی بھی تھی۔ فرید پرمود ہی کے کالج میں تیسرے سال میں پڑھتا تھا؛ سلوئی ایجوکیشن کالج کے پہلے سال میں۔ ان دونوں کی ماں اصل میں ہندوستان کی رہنے والی تھی۔ پرمود نے پوچھا کہ ہندوستان میں کس جگہ کی، تو ابوفرید نے بتایا: ''لکھنؤ کی۔ بہت سال پہلے اس کے والد کا یہاں کاروبار تھا۔ پھر وہ ہندوستان لوٹ گئے۔ اب ان کے خاندان سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں۔'' بچوں کی ماں ان دونوں کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی اور ابوفرید نے دوسری شادی کیے بغیر ان کی پرورش کی تھی۔

''آپ ان دونوں کو ہندوستان نہیں لے گئے؟'' پرمود نے ابوفرید سے پوچھا۔

''بابا ہمیں بھلا کیوں لے جانے لگے!'' ابوفرید کے کچھ کہنے سے پہلے سلوئی بول اٹھی۔ ''ہم اتنے سال سے کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان ہو کر آتے ہیں۔ لیکن بابا کا بس ایک جواب ہوتا ہے: 'دیکھتے ہیں، دیکھتے ہیں، اس سال نہیں اگلے سال...' میں نے تو اب کہنا ہی چھوڑ دیا ہے!

''ہندوستان خوبصورت جگہ ہے، ہے نا؟'' سلوئی نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

پرمود کو اس کے سوال پر ہنسی آ گئی۔ ''ہے تو،'' اس نے کہا۔ ''کہہ سکتے ہیں خوبصورت!''

''مجھے ہندی فلمیں بہت پسند ہیں،'' سلوئی نے بتایا۔ لگتا تھا کہ دونوں بچوں میں وہی باتونی اور فارورڈ قسم کی ہے۔ فرید ملنسار مگر کم گو طبیعت کا تھا؛ کبھی کبھی مسکراتا اور ایک آدھ بات کہہ دیتا۔ ''شہر میں زنجیر فلم چل رہی ہے۔ آپ نے دیکھی؟'' سلوئی نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے نہیں دیکھی،'' پرمود نے کہا۔ ''میں ہندی فلمیں نہیں دیکھتا۔ مجھے اچھی نہیں لگتیں۔''

''ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی آپ کو ہندی فلمیں پسند نہیں؟ واللہ!'' سلوئی حیران ہو کر بولی۔

''بہت لمبی ہوتی ہیں۔ تین گھنٹے کی فلم دیکھنے میں بوریت ہوتی ہے۔''

''ہندی فلمیں پسند نہیں تو آپ کے پاس فلمی گانے بھی نہیں ہوں گے! میرا خیال تھا آپ سے گانوں کی کیسٹیں مل جائیں گی۔''

''ہیں میرے پاس ہندی گانوں کی دو چار کیسٹیں،'' پرمود نے کہا۔ ''فلمیں اچھی نہیں لگتیں مگر گانے اچھے لگتے ہیں مجھے۔ ٹھیک ہوتے ہیں سننے میں۔''

''واہ! بابا، آپ ان کے پاس سے کبھی کیسٹیں لے آئیے نا! ہم انھیں ٹیپ کر لیں گے۔'' پھر فرید کی طرف دوبارہ مڑ کر بولی، ''فرید کو بھی ہندی گانے بہت اچھے لگتے ہیں۔ دو تین گانے تو اسے آتے بھی ہیں۔ فرید، تم کوئی گانا سناؤ نا!''

''تم سناؤ نا،'' فرید نے اس سے کہا۔ ''تمھیں بھی تو آتے ہیں!''

''شی! میں نہیں گا سکتی! تم اچھا گاتے ہو۔''

پھر فرید نے کسی پرانے مقبول گانے کے دو بول گا کر سنائے۔

''واہ، زبردست! ہو بہو ریکارڈ جیسا گایا ہے تم نے!''

''لیکن ہمیں اس گانے کا مطلب نہیں آتا،'' سلوئی نے کہا۔ ''اب آپ ہمیں بتائیے!''

''مطلب؟ اچھا، بتاتا ہوں،'' پرمود نے کہا۔ ''پہلی سطر کا مطلب: میں تمھارے لیے دن رات تڑپا رہتا ہوں ... ''

Scanned with CamScanner

''واللہ، فرید!'' سلویٰ نے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر فرید سے کہا اور زور سے ہنسی۔

ابوفرید نے عربی میں سلویٰ سے کچھ کہا۔ پھر پرمود سے کہنے لگا،''چلیے پروفیسر، یہ بچے تو آپ کو یونہی تنگ کرتے رہیں گے۔ چل کر باہر باغ میں بیٹھتے ہیں۔''

اس کے بعد ابوفرید کئی بار پرمود سے ملا۔ اگر بینک میں بھیڑ ہوتی تو فوراً سامنے آ کر پرمود کا کام کر دیتا، پرمود کو شاپنگ وغیرہ کرنی ہوتی تو اپنی کار میں لے جاتا۔ پرمود کو محسوس ہونے لگا کہ یہ آدمی ضرورت سے زیادہ تپاک دکھا رہا ہے۔ اس کی وجہ وہ نہیں سمجھ پایا۔ لوگ پردیسیوں کے ساتھ کبھی کبھی زیادہ اچھا برتاؤ کرتے ہیں؛ لیکن ابوفرید کا طرزِ عمل اس سے بڑھ کر تھا۔ پرمود ہندوستانی تھا اور ابوفرید کی بیوی بھی ہندوستان کی تھی، کیا وہ اس لیے اتنی الفت سے پیش آ رہا تھا؟ لیکن یہ سبب اسے پوری طرح مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔ اگر کہا جائے کہ وہ اپنے لڑکے کو امتحان میں پاس کرانے کے لیے یہ سب کر رہا تھا، تو فرید تو پرمود کی کلاس میں تھا نہیں۔ ابوفرید کے غیر معمولی طور پر دوستانہ برتاؤ کی گتھی وہ نہیں سلجھا پایا۔ لیکن اس کو یہ خیال تھا کہ وہ ضرور سوچ سمجھ کر اس کے ساتھ دوستی بڑھا رہا ہے اور اس سے کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

فلیٹ ملنے کے بعد کچھ عرصے تک پرمود گھر میں کھانا پکانے کے معاملے میں پرجوش رہا۔ پکا کر فرج میں رکھا ہوا کھانا دو تین دن چل جاتا۔ لیکن دو تین ہفتے اس معمول پر کاربند رہنے کے بعد اسے گھر میں کھانا پکانے سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ پھر وہ ہر روز کسی نہ کسی ہوٹل میں جا کر کھانے لگا۔ کچھ دن ایسا کرنے کے بعد وہ اس سے بھی بیزاری محسوس کرنے لگا۔ پھر دوبارہ گھر میں کھانا پکانا شروع کر دیا! اس کا کھانے کا سلسلہ اسی طرح الٹ پلٹ انداز میں چلتا رہا۔

ایک دن پرمود اپنے روز کے ہوٹل میں گیا اور کونے کی ایک میز پر اسے حمید بیٹھا دکھائی دیا۔ پرمود اس کے پاس گیا۔''کیا بات ہے حمید؟ کہاں ہو آج کل؟ بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیے۔''

''واہ! میں نے آپ کو کتنی بار اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی، مگر آپ ایک بار بھی نہیں آئے!'' حمید بولا۔

''سچ ہے، میں نہیں آ سکا۔ آج کل آج کل کرتا رہ گیا۔''

Scanned with CamScanner

حمید کے سامنے بیئر کی آدھی خالی کی ہوئی بوتل رکھی تھی۔گلاس تھا۔کچھ لمحے پرمود دیکھتا رہا۔

''ارے حمید،تم نے بھی یہ شروع کر دی!'' پرمود نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔''مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا!''

حمید زور سے ہنسا۔''ہاں، کردی شروع!'' میز پر رکھے گلاس سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا،''ایسا ہوتا ہے۔لوگ بدلتے ہیں... بدلنا پڑتا ہے۔''

''سچ ہے... سچ ہے...'' حمید کے گلاس کی طرف خالی الذہن نظروں سے دیکھتے ہوئے پرمود نے منہ ہی منہ میں کہا۔پھر حمید کی طرف دیکھ کر ذرا اونچی آواز میں بولا،''پھر بھی،کمال ہو گیا!''

ایک بار پھر ہنس کر حمید نے بیئر کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔اسے بیچ بیچ پیتے ہوئے پرمود حیران ہو کر دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا،''بیوی یہاں نہیں ہے،کیا اس غم میں پینی شروع کر دی؟''

''ارے نہیں،ایسی بات نہیں،'' حمید ہوٹل کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔پھر اس نے دروازے پر کسی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔پرمود نے مڑ کر اُدھر دیکھا۔ایک نوعمر لڑکا اندر آ رہا تھا۔وہ میز کے پاس پہنچا۔حمید شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

''یہ جواد ہے،'' حمید نے تعارف کرایا۔

کھانا کھاتے ہوئے پرمود نے نوٹ کیا کہ حمید کی داڑھی بھی بدلی ہوئی ہے۔پہلے کی ناتراشیدہ داڑھی کی جگہ اب وہ صفائی سے ترشی ہوئی لگ رہی تھی؛ کاٹ چھانٹ کے بعد وہ خوبصورت اور سلیقے کی معلوم ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد پرمود نے حمید سے کہا،''میرے فلیٹ پر چلتے ہو؟''

''اس وقت نہیں،'' حمید بولا۔''میں جواد کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہا ہوں—''

''فلم دیکھنے!'' پرمود زور سے کہہ اٹھا۔''یعنی تم نے فلم دیکھنا بھی شروع کر دیا؟''

''کیا کرتا!'' حمید بولا۔''پردیس میں رہتے ہوئے بوریت ہوتی ہے۔فلم دیکھنے میں وقت اچھا گزر جاتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک،'' پرمود نے کہا۔''پردیس میں وقت گزارنے کے مشغلوں کی ضرورت ہوتی ہی ہے،خاص کر اگر آدمی اکیلا رہ رہا ہو۔اچھا ہوا کہ تم نے بڑی عقلمندی سے یہ سب ٹھیک کر لیا۔''

Scanned with CamScanner

حمید سے رخصت ہو کر لوٹتے ہوئے پرمود حمید کے بارے میں سوچنے لگا۔ حمید میں حیران کن تبدیلی آئی تھی، جیسے اس کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ پھر بھی یہ تبدیلی ناممکن قسم کی نہیں لگ رہی تھی۔ پرمود نے نئے نئے امریکہ آئے ہوئے ہندوستانی لڑکوں کو دیکھا تھا کہ دو ایک مہینے میں بالکل بدل جاتے تھے۔ پردیس کے مختلف ماحول میں آ کر آدمی میں کمال تبدیلی آ جاتی ہے۔ کنبے کے معمول کے سماجی تانے بانے سے باہر آ کر آدمی کی اپنی شخصیت سر نکالتی ہے۔

انھی دنوں پرمود کو جواین کا خط ملا۔ ''کیا وہاں اب تک اکتاہٹ شروع نہیں ہوئی؟ جلدی لوٹنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔ لکھا تھا کہ ایک امریکی آئل کمپنی میں ملازم اس کے والد کا عارضی تقرر تہران میں ہو گیا ہے۔ ''اگر ایران جانا ہو تو ان سے ملنا؛ انھیں کمپنی کی طرف سے بڑا بنگلہ ملا ہے، تم ان کے پاس ٹھہر بھی سکتے ہو۔''

بلومنگٹن سے اجیت چودھری کا بھی خط آیا۔ ''عراق میں کیسا چل رہا ہے؟'' قسم کے سوالوں کے بعد اس نے لکھا تھا: ''سینڈی نامی ایک لڑکی کے ساتھ میرا معاملہ بیٹھ گیا ہے۔ اگلی گرمیوں میں شادی کرنے کا سوچا ہے۔'' پرمود نے ہنس کر خود سے کہا، جھٹ پٹ کام دکھا دیا پٹھے نے!

•

دریا کنارے کے ہوٹل میں شام کے وقت پرمود دل بہلانے کو ابوفرید کے ساتھ شطرنج کھیلنے بیٹھا۔ ابوفرید کاؤنٹر سے شطرنج کی بساط اور مہرے لے آیا۔ ابوفرید بڑی احتیاط سے کھیل رہا تھا۔ ادھر پرمود کوئی مہرہ آگے بڑھاتا، اُدھر وہ اسے روکنے کے لیے اپنی چال چلتا۔ اس کا طریقہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مہرے ایک دوسرے کے سامنے لا کر ایک طرح کا بیلنس آف پاور پیدا کیا جائے۔ ایسی بازی بہت لمبی اور دماغ کو تھکانے والی ہوتی ہے۔ پھر پرمود نے تیزی سے مہرے بدلنے شروع کیے۔ اس کے فیل کے آگے بڑھتے ہی پرمود اپنا فیل بچانے کے بجائے اس کے فیل کو پیٹ دیتا۔ پیادے سے پیادہ، گھوڑے سے گھوڑا اور فیل سے فیل لڑا کر پرمود نے بساط کو جلد ہی خالی کر دیا۔ ابوفرید جھنجھلا کر بولا، ''یہ کیا کھیل ہوا تمھارا! یہ تو قتلِ عام ہے۔ اس میں مزہ نہیں۔ حریف کے مہرے پیٹنے کے بجائے اپنے مہرے بچا کر رکھنے اور تدبیر سوچنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ اس میں زیادہ ذہانت بھی درکار ہوتی ہے۔''

Scanned with CamScanner

پرمود ہنس کر بولا، ''میں نے یہ کھیل ایک امریکی دوست سے سیکھا تھا۔ جس اعلیٰ تہذیب یافتہ کھیل کی تم بات کر رہے ہو وہ میں نہیں کھیل سکتا۔ میرا کھیل جدید ہے، جیٹ ایج کا!''

پرمود کی تکنیک کی وجہ سے بازی ظاہر ہے جلدی ختم ہو گئی۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ ہوتے ہوتے ابوفرید کی ملازمت کی بات چھڑ گئی۔ ''کیا تمھیں بینک کی ملازمت پسند ہے؟'' پرمود نے اس سے پوچھا۔

''اصل میں اس نوکری سے میں تنگ آ چکا ہوں،'' ابوفرید نے کہا۔

''لیکن تنخواہ تو اچھی ہو گی،'' پرمود بولا۔

''ہاں، اچھی ہے۔ لیکن صرف تنخواہ کا سوال نہیں ہے۔'' کچھ رک کر، سگریٹ سلگا کر، ابوفرید نے کہا۔ ''دراصل مجھے بزنس کرنے کی خواہش تھی۔ ہمارا خاندان شروع سے کاروبار میں رہا ہے۔ والد کا اچھا بزنس تھا۔ لیکن میں اس نوکری میں آ گیا اور پندرہ بیس سال سے اسی میں ہوں۔''

''پھر تم نوکری چھوڑ کر کاروبار کیوں نہیں شروع کر دیتے؟''

''نوکری چھوڑ کر؟'' ابوفرید زور سے ہنسا۔ ''اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو پھر اور کیا چاہیے تھا!''

''کیا مطلب؟ استعفیٰ نہیں دے سکتے؟''

ابوفرید نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں دے سکتا... کوئی بھی نہیں دے سکتا۔''

''کیا کوئی نوکری نہیں چھوڑ سکتا؟ یعنی ایک بار نوکری میں آ کر ساری زندگی وہیں گزارنی پڑے گی؟ کیا کہہ رہے ہو!''

''یہاں ساری سرکاری نوکریوں کا یہی معاملہ ہے — اور ظاہر ہے زیادہ تر نوکریاں سرکاری ہی ہیں۔ استعفیٰ دے بھی دیں تو شاذ و نادر ہی منظور ہوتا ہے۔''

''یعنی تمھیں ریٹائرمنٹ تک یونہی پڑے رہنا ہو گا!''

ابوفرید نے کوئی جواب نہ دیا، بس سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے دریا کو تکتا رہا۔ پرمود نے بھی کچھ نہیں کہا۔ پھر ابوفرید کہنے لگا، ''لیکن ایک دن میں اس سے چھٹکارا پا لوں گا۔''

''وہ کیسے؟''

''ایک دن الوداع کہہ دوں گا۔'' ابوفرید پرمود کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ پرمود نے سوالیہ نظروں

Scanned with CamScanner

۔ اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا پلان تیار ہے،'' ابوفرید بولا۔ ''ویسے میرے پاس ورثے میں ملا ہوا پیسہ بہت ہے۔ سوال ہے تو صرف اسے ملک سے باہر لے جانے کا! میں تھوڑا تھوڑا کرکے، کچھ اِس کے ہاتھ، کچھ اُس کے ہاتھ، باہر بھجواتا تو رہا ہوں۔ ظاہر ہے یہ کام دھیرے دھیرے ہی ہوگا۔ اس میں خطرہ بھی ہے۔ ایک بار سارا پیسہ باہر پہنچ جائے تو پھر چھٹی لے کر باہر چلا جاؤں گا، ہمیشہ کے لیے — ظاہر ہے، دونوں بچوں کو لے کر جاؤں گا۔''

''بڑا جوکھم کا پلان ہے تمھارا،'' پرمود نے کہا۔

چار دن بعد سلوئی کے لیے ہندی گانوں کی کیسٹیں لے کر پرمود ابوفرید کے گھر گیا۔ سلوئی نے دو تین بار اسے یاد دلایا تھا، لیکن پرمود کی کیسٹیں شرما کے پاس تھیں۔ شرما کے ہسپتال جانے کے بعد سے وہ اسی کے گھر رکھی تھیں۔ اس نے مکھرجی کے ذریعے انھیں واپس منگوایا تھا۔

ابوفرید گھر پر نہیں تھا۔ سلوئی اور فرید تھے۔ اب تک پرمود کی ان دونوں سے خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ کیسٹیں دیکھ کر سلوئی بہت خوش ہوئی۔ اس نے ایک کیسٹ پلیئر میں لگائی۔ پھر ہر گانے کا مطلب بتانے پر اصرار کرنے لگی۔ بیچ میں اس نے اچانک پرمود سے کہا، ''مجھے ہندوستان کے بارے میں بتائیے نا!''

پرمود ہنسا۔ وہ ہر بار اسی طرح اصرار کرتی تھی۔ ''لیکن کیا بتاؤں؟'' اس نے کہا۔ ''پورے ملک کے بارے میں اس طرح کیا بتایا جا سکتا ہے! تمھیں کس چیز کے بارے میں معلوم کرنا ہے، وہ تو کہو۔''

لیکن سلوئی کو کسی مخصوص چیز کے بارے میں 'معلومات' نہیں چاہیے تھی، ہندوستان کے تصور میں اسے کشش محسوس ہوتی تھی۔ ''ہندوستان خوبصورت ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو تم پہلے بھی ایک دو بار پوچھ چکی ہو۔''

''خوبصورت پہاڑ، برف، ہرے بھرے پٹھار* ...''

''اچھا اچھا، تم کشمیر کی بات کر رہی ہو، ہے نا؟''

''ہاں ہاں، کاشمیر! وہی جو ہر ہندی فلم میں دکھایا جاتا ہے...''

''دیکھو، تم ہندی فلموں پر ہندوستان کا تصور کرنے کی کوشش مت کرو۔ ہندوستان کشمیر نہیں

---

* پٹھار: سطح مرتفع۔ plateau۔

ہے!... ہندی فلمیں دیکھ کر تم ہندوستان کے بارے میں ایسا رومانی تصور قائم کروگی تو سچ مچ وہاں جانے پر تمھیں بڑا صدمہ ہوگا۔"

فرید نے پرمود سے کہا، "میں ایک بار لائبریری سے ہندوستان کے بارے میں دو کتابیں لایا تھا۔ سلوئی نے پڑھیں ہی نہیں!"

سلوئی زور سے ہنسی۔ "کتابیں پڑھنے سے مجھے بوریت ہوتی ہے،" وہ بولی۔ "بے کار کی خشک معلومات اور اعداد و شمار کو کون پڑھے!"

"پھر تو بہت مشکل ہے،" پرمود نے کہا۔

"لیکن میں نے وہ پڑھی ہے، آپ کے ٹیگور کی گیتا نجلی۔ عربی میں پڑھی ہے۔ بڑی خوبصورت کتاب ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ آپ نے تو پڑھی ہی ہوگی۔"

"بہت سال پہلے پڑھی تھی۔ مجھے اس سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔"

"کمال ہے!" سلوئی جان بوجھ کر کچھ ڈرامائی انداز میں بولی۔ "آپ کو ہندی فلمیں پسند نہیں، ٹیگور پسند نہیں، پھر آپ کو کیا پسند ہے؟"

پرمود صرف ہنس کر رہ گیا۔ پھر جب فرید کسی کام سے اندر گیا تو سلوئی کے چہرے پر نظر جما کر اس نے پوچھا، "کل دوپہر میں کھانا کھانے میرا مس ہوٹل جا رہا ہوں۔ تم چلوگی؟"

پرمود نے بہت سوچ کر لنچ کے لیے پوچھا تھا۔ جانتا تھا کہ شام کو ملنے کی دعوت پر مثبت جواب ملنے کی امید کم ہی ہے۔

پرمود کے سوال پر سلوئی یکدم سنجیدہ ہو گئی۔ کچھ دیر خاموشی سے اپنے سامنے تکتی رہی۔ پھر پرمود کی طرف دیکھے بغیر بولی، "ممکن نہیں ہے۔" کچھ رک کر کہنے لگی، "شہر میں کہیں بھی آپ کے ساتھ آنا جانا میرے لیے ممکن نہیں۔"

یہ جواب پرمود کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ منٹ بھر دونوں خاموش رہے۔ پھر پرمود نے کہا، "تو پھر میرے گھر آ جاؤ۔ وہاں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوگا۔"

کچھ لمحے سوچ کر پرمود کی طرف دیکھتے ہوئے سلوئی نے کہا، "نہیں، وہ بھی ممکن نہیں۔ وہ تو اور زیادہ مشکل ہے۔"

Scanned with CamScanner

آخری کوشش کے طور پر پرمود نے کہا، ''تو چلو کسی دن شہر سے باہر چلتے ہیں، پکنک پر۔ وہاں کسی کے دیکھنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے؟''

''وہ بھی مشکل لگتا ہے...''

''کیا تم میرے ساتھ چلنا نہیں چاہتیں، سلوئی؟''

''ایسی بات نہیں، لیکن—''

''دیکھو، تھوڑا بہت خطرہ تو مول لینا ہی ہوگا۔''

کچھ رک کر سلوئی بولی، ''جائیں گے کیسے؟''

''ہاں، یہ تو ایک سوال ہے،'' پرمود کچھ سوچتے ہوئے بولا، ''ٹیکسی سے— نہیں، ٹیکسی سے نہیں، کار سے جاسکتے ہیں۔ کسی کی کار حاصل کرنی ہوگی...''

''مجھے بدھ کی صبح آپ کے کالج آنا ہے۔ اس وقت آکر آپ سے ملوں گی،'' سلوئی نے کہا۔

اس بات چیت کے اگلے دن پرمود کالج میں فرانسوا سے ملا۔ پہلے فرانسوا کی میز پرمود ہی کے کمرے میں تھی؛ لیکن بعد میں وہ دوسری منزل پر دفتر کے کمرے میں منتقل ہوگیا، اس لیے اب کالج میں ان کی زیادہ ملاقات نہیں ہوتی تھی۔

''مجھے تم سے ایک کام ہے،'' پرمود نے فرانسوا سے کہا۔

''کہو،'' فرانسوا ہونٹوں سے سگریٹ نکالے بغیر بولا۔

''ایک دن کے لیے اپنی کار دے سکتے ہو؟''

''ٹھیک ہے، اس میں کیا مشکل ہے۔ کوئی خاص کام ہے کیا؟''

''پاس ہی کہیں پکنک پر جانے کا سوچ رہا ہوں، ایک لڑکی کے ساتھ۔''

''اوہو... ایسی بات ہے!'' فرانسوا آنکھ مار کر بولا۔ ''پھر تو ضرور... ضرور!'' پرمود ہنسنے لگا۔ ''لیکن ذرا سنبھال کے،'' فرانسوا نے کہا۔ ''یہاں ایسی چیزوں میں احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے،'' پرمود نے کہا۔

''لیکن لائسنس وغیرہ؟'' فرانسوا نے پوچھا۔

''میرے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس ہے۔ چھ مہینے چلے گا،'' پرمود نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"پھر ٹھیک ہے۔"

پرمود کا ارادہ ولدلی علاقے کی طرف جانے کا تھا۔ وہاں جانے کا راستہ فرانسوا نے اسے سمجھا دیا تھا۔

سنیچر کی صبح نو بجے پرمود فرانسوا کی گاڑی لے کر التحریر چوک کے پاس کھڑا ہو گیا۔ سنیچر چھٹی کا دن نہیں تھا لیکن اس روز پرمود کا کوئی پیریڈ نہیں تھا۔ آٹھ بجے کالج میں چہرہ دکھا کر وہ گاڑی لے کر نکل آیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد سلوئی تیز تیز چلتی ہوئی پہنچی۔ پہلے تو پرمود اسے پہچان ہی نہ سکا؛ اس نے برقع اور منھ پر نقاب پہن رکھی تھی۔ ویسے یہاں کا برقع منھ نہیں ڈھانکتا تھا۔ اس کے علاوہ، پرمود نے اس سے پہلے سلوئی کو برقع پہنے نہیں دیکھا تھا۔ پرمود کے داہنے ہاتھ کا دروازہ کھولتے ہی وہ اندر آ بیٹھی اور بولی، "چلیے جلدی!"

تھوڑی ہی دیر میں پرمود نے گاڑی شہر سے باہر نکال لی۔ جاڑا شروع ہو چکا تھا اس لیے ہوا میں خاصی ٹھنڈ اور تازگی تھی۔ آسمان بادلوں سے خالی اور روشن تھا۔ بارش سے گرد بیٹھ گئی تھی اس لیے آسمان صاف اور دھلا دھلایا لگ رہا تھا۔

پرمود کو ایک بات کی فکر تھی: شہر کے باہر جانے والے راستے پر فوجی چوکی تھی؛ باہر نکلنے والی سب گاڑیوں کو وہاں رکنا پڑتا تھا۔ سپاہی کبھی کبھی سامان کی تلاشی لیتے، لیکن زیادہ تر شناختی کارڈ دیکھ کر جانے دیتے تھے، کبھی کبھار تو کارڈ بھی نہیں دیکھتے تھے۔ پرمود کو فکر یہ تھی کہ اگر انھوں نے سلوئی کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی تو بڑی کوفت ہوگی۔ وہ ابھی اسی سوچ میں تھا کہ اتنے میں چوکی آ گئی۔ پرمود نے گاڑی آہستہ کر کے روک لی۔ اس کے آگے دو گاڑیاں تھیں۔ منٹ بھر میں اس کی گاڑی چوکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بیرٹ پہنے ہوئے فوجی کا سر کھڑکی میں نمودار ہوا۔ پرمود نے اپنا یونیورسٹی کا شناختی کارڈ اس کے سامنے کیا۔ سپاہی نے کارڈ کو دیکھا، پھر پوچھا، "کہاں جانا ہے؟"، سلوئی کی طرف ایک نگاہ ڈالی، اور کارڈ لوٹا کر آگے جانے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کو زور سے اسٹارٹ کر کے پرمود نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی نے دوبارہ رفتار پکڑی تو پرمود نے سلوئی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا اور سلوئی بھی مسکرائی۔ اس وقت تک وہ برقعے کو اتار کر لپیٹ چکی تھی۔ وہ نارنجی، پیلے اور سفید پھولوں کے ڈیزائن

Scanned with CamScanner

والا لباس پہنے تھی۔ بھنویں چنی ہوئی تھیں۔ پرمود چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے گلے میں پہنا ہوا سونے کا نیکلس اوپر کو اٹھایا اور کہا، ''یہ دیکھا؟'' اسے پرمود کے سامنے کر کے بولی، ''یہ میری ماں کا ہے! ہندوستان سے لایا ہوا! خالص سونے کا ہے۔ ہمارے یہاں خالص سونے کے گہنے نہیں بنائے جاتے۔''

''تمھیں گہنے پہننا پسند ہے؟''

''کبھی کبھی پہننا اچھا لگتا ہے،'' سلویٰ ناک چڑھا کر بولی۔ اس نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ اوپر کر لیا۔ ''کتنے عرصے بعد شہر کے باہر نکلی ہوں میں،'' اس نے دونوں ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا سے کتنی بار کہا کہ کسی جمعے کو پکنک پر چلیں، لیکن انھیں دوستوں سے باتیں کرنا زیادہ پسند ہے۔ اور فرید فٹ بال کھیلنے میں مگن رہتا ہے۔''

''میں خود بھی بہت دنوں کے بعد شہر سے نکلا ہوں۔ اس سے پہلے ایک بار اُر گیا تھا، یہ جس کی گاڑی ہے اُس کے ساتھ۔''

''اچھی گاڑی ہے، چھوٹی سی۔''

''تمھارے بابا کی گاڑی تو کافی بڑی ہے۔''

''چھوٹی گاڑی میں سکڑ کر بیٹھنے میں مزہ آتا ہے... فرینڈلی لگتا ہے۔ بڑی گاڑی میں بیٹھ کر اپنا آپ غیر اہم اور اوپرا لگنے لگتا ہے!''

''لیکن بڑی گاڑی میں ایسے اسٹائل سے سفر کر سکتے ہیں!'' زن سے اوورٹیک کر کے نکلنے والی مرسڈیز کی طرف اشارہ کر کے پرمود بولا۔ سلویٰ ہنسی۔

داہنے ہاتھ پر شط العرب کا بہاؤ سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بیچ بیچ میں پانی دکھائی دیتا تھا۔ سڑک اور دریا کے درمیان کھیت اور کچے مکان تھے۔ ہریالی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف مٹی کے رنگ کا ویرانہ تھا۔ کہیں کہیں اینٹوں کی بھٹیاں اور ان میں سے نکلتا ہوا دھواں نظر آتا؛ کبھی بھٹی کے دہانے کے پاس ٹرک کو الٹے رخ کھڑا کیے اینٹیں بھرنے والے مزدور دکھائی دیتے۔ پھر گاڑی دجلہ کے پل پر سے گزری اور القرنا گاؤں آیا، جہاں دجلہ اور فرات مل کر شط العرب بناتے ہیں اور پھر بصرہ سے آگے خلیج میں جا گرتے ہیں۔ قُرنا کے گزرنے کے منٹ بھر بعد پرمود نے سڑک چھوڑ کر

Scanned with CamScanner

گاڑی کو داہنے ہاتھ گھمایا۔ اب تنگ کچا راستہ شروع ہوا۔ گاڑی کے پیچھے دھول اڑنے لگی۔ راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے گاڑی آہستہ چلانی پڑ رہی تھی۔ اس راستے پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکا دکا گاڑی یا دیہاتیوں سے بھری پیلے یا نیلے رنگ کی منی بس سامنے سے دھول اڑاتی آتی۔ سامنے سے گاڑی آتے دیکھ کر پرمود ایک طرف کا اور سلوئی دوسری طرف کا شیشہ چڑھاتی؛ اس کے گزرنے کے بعد شیشے پھر نیچے کیے جاتے۔ سپاٹ میدان میں مٹی بھر کر یہ راستہ بنایا گیا لگتا تھا۔ راستہ اونچائی پر تھا اور اس کے دونوں طرف گھاس بھرا سپاٹ میدان پھیلا تھا۔ تھوڑی دیر میں گھاس کے بجائے آدھے سوکھے ہوئے دلدلی نرسلوں کا جنگل دکھائی دینے لگا اور اس کے بعد ہرے بھرے پودوں سے بھری دلدلی زمین شروع ہو گئی۔ گاڑی دلدلی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔

اب ہوا میں خوشگوار گیلا پن آ گیا تھا؛ ہر طرف دلدلی نرسلوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ پرمود کو محسوس ہوا کہ وہ کسی اجنبی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور یہ دنیا آگے میلوں تک پھیلتی چلی گئی تھی؛ ان دونوں نے صرف اس کے ایک کونے میں قدم رکھا تھا۔

''وہ دیکھیے!'' سلوئی نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ راستے کے کنارے پانی میں تین چار بھینسیں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ پرمود پہلی بار اس ملک میں بھینسیں دیکھ رہا تھا۔ بھینسوں کے بدن پر لمبے موٹے بال تھے جن کی وجہ سے وہ جنگلی دکھائی دے رہی تھیں۔ زیادہ تر وقت پانی میں گزارنے سے ان کے بدن بالوں سے ڈھک گئے ہوں گے۔

راستے میں کہیں کہیں اونٹ کے کوہان کی طرح اٹھا ہوا پل آتا تھا۔ اس کے نیچے سے نہر بہتی تھی۔ پل کا خم اتنا اونچا بنایا گیا تھا کہ کشتیاں اس کے نیچے سے گزر سکیں۔ بیچ میں دو ایک جگہ راستے کے کنارے دلدلی زمین میں مٹی بھر کر اس پر نرسلوں کی جھونپڑیاں بنائی گئی تھیں۔ بہت آگے بڑھنے کے بعد بائیں ہاتھ پر چبیش گاؤں کے مکان دکھائی دینے لگے۔ پھر منی بس کا اڈا آیا۔ یہاں راستے کے کنارے سوکھے نرسلوں کی بنی چٹائیوں کے ڈھیر تھے، اور چٹائیاں ایک چھوٹے ٹرک پر بار کی جا رہی تھیں۔ کچا راستہ بس کے اڈے کے برابر سے نکل کر آگے دور کے گاؤں کی طرف جاتا تھا، لیکن پرمود نے اسے چھوڑ کر گاڑی چبیش گاؤں کی طرف موڑ لی۔ گاؤں چھوٹا سا لگ رہا تھا۔ منٹ بھر میں گاڑی کو دوبارہ بائیں طرف موڑ کر وہ ندی کی طرف جانے والی سڑک پر آ گیا۔ بائیں ہاتھ پر کچھ دیہاتی قسم کی

Scanned with CamScanner

دکانیں تھیں، جن میں پیاز آلو، برتن، پلاسٹک کے کھلونے وغیرہ بک رہے تھے۔ سڑک کے داہنے ہاتھ پر بند تھا جس کے پار پانی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ نہ تو کوئی ندی تھی نہ جھیل، فقط دلدل میں سے پھوٹ نکلنے والا ایک بہاؤ تھا۔ اس کے پار نرسلوں کے جھنڈ پھیلے تھے اور ان کے بیچ بیچ میں کھلا پانی، اس لیے اس کا کوئی دوسرا کنارا نہ تھا۔

بند کے نزدیک پہنچ کر پرمود نے گاڑی روک لی۔ بہت دیر گاڑی میں بیٹھنے اور ناہموار راستے پر سفر کرنے کے بعد باہر نکلنا دونوں کو اچھا لگا۔ پرمود نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اپنا تنکوں کا ہیٹ اٹھایا اور مذاق میں سلویٰ کے سر پر رکھ دیا۔

''یہ کیا؟'' سلویٰ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

بند سے سٹی ہوئی دو تین موٹر بوٹ کھڑی تھیں۔ پرمود نے ان میں سے ایک کرائے پر ٹھہرا لی۔ موٹر بوٹ پرانی اور ٹوٹی پھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ شط العرب پر سیر کرانے والی موٹر بوٹ زیادہ اچھی حالت میں ہوتی تھیں۔ ''معلوم ہوتا ہے بصرہ میں جو موٹر بوٹ گھس گھسا کر پرانی ہو جاتی ہے اسے یہاں پھینک دیا جاتا ہے،'' پرمود نے سلویٰ سے کہا۔

کشتی والے نے کشتی اسٹارٹ کی۔ وہ پھٹ پھٹ کرتی، بہاؤ کی مخالف سمت میں پانی کو کاٹتی ہوئی چلنے لگی۔ پانی پر تیرنے والا ایک بڑا سا پنچھی پر پھڑپھڑا کر کشتی سے دور ہو گیا۔ بہاؤ کے داہنی طرف نرسلوں کا جھنڈ تھا۔ ایک دن منٹ بعد بائیں ہاتھ پر بھی زمین اور سڑک ختم ہو گئی اور پانی اور نرسلوں کا راج شروع ہو گیا۔ خشکی ختم ہوتے ہی پانی میں ایک جدید عمارت سیمنٹ کے کھمبوں پر کھڑی تھی۔ اس کے ایک پہلو میں کشتی سے آنے والے لوگوں کے لیے پانی تک اترتی ہوئی سیڑھیاں بنی تھیں۔ عمارت پر ہسپتال جیسا بورڈ لگا تھا لیکن وہ بالکل ویران معلوم ہوتی تھی۔ دلدلوں میں دور اندر رہنے والوں کے لیے یہ ہسپتال بنایا گیا ہوگا۔ وہ اب تک استعمال میں آیا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بہاؤ تنگ ہو گیا۔ دونوں طرف نرسلوں کا جنگل اور بیچ میں سڑک جیسی تنگ پانی کی پٹی۔ اسے ''بہاؤ'' کہنا بھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھا، کیونکہ پانی بہہ نہیں رہا تھا بلکہ اپنی جگہ ساکت تھا۔

''چلو کشتی کی چھت پر چل کر بیٹھیں،'' پرمود نے سلویٰ سے کہا۔ وہ کشتی کے پچھلے حصے سے اوپر چڑھا اور سلویٰ کو چڑھنے میں مدد دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

Scanned with CamScanner

کشتی کی چھت پر بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ شمال سے آتی ٹھنڈی ہوا اور بدن پر پڑتی ہوئی نرم دھوپ۔ نیچے بیٹھے ہوئے دونوں طرف نرسلوں کی اونچی دیواریں دکھائی دیتی تھیں؛ اوپر چھت پر جا کر کھلا کھلا محسوس ہونے لگا اور دور تک کا منظر دکھائی دینے لگا۔ چاروں طرف دور دور تک نرسلوں کا دیس پھیلا ہوا تھا۔

بیچ میں کہیں کہیں بہاؤ کے داہنے اور بائیں طرف پانی کے تنگ راستے پھوٹتے تھے۔ نرسلوں کے جھنڈ میں ایسے پن رستوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تنگ راستے پر ایک پتلی لمبی کشتی میں ایک لڑکی جا رہی تھی۔ وہ کشتی میں کھڑی ایک لمبے بانس سے کشتی کو آگے ٹھیل رہی تھی۔ پانی ہر طرف پھیلا ہونے کے باوجود زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پھر اسی طرح کی ایک کشتی میں ایک آدمی چبیش کی طرف گیا۔ وہ کشتی تازہ کٹے ہوئے نرسلوں سے بھری ہوئی تھی۔ کشتی کی لگر پانی کی سطح سے ذرا سی ہی اوپر تھی۔ پرمود کو حیرت ہوئی کہ اتنی نازک دکھائی دینے والی کشتی میں اتنا بوجھ رکھ کر یہ آدمی پانی سے صرف چند انچ اوپر اسے کتنی تیزی سے کھیتا ہوا لے جا رہا ہے۔

پھر ایک طرف دو چار جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ سوکھے نرسلوں کی بنی یہ جھونپڑیاں ہر طرف پانی سے گھری ہوئی تھیں۔ پانی ان کے بالکل پیروں تک پہنچ رہا تھا۔ ایک چھوٹی جھونپڑی تو پانی میں قریب قریب ڈوبی ہوئی تھی؛ وہ غیر آباد لگ رہی تھی۔ ایک بڑا جھونپڑا غرور سے سر اٹھائے معلوم ہوا؛ دونوں طرف لمبے نرسلوں کے دو مضبوط گٹھوں کے اوپری حصوں کو کمان کی طرح جوڑ کر بنایا ہوا خوبصورت دروازہ، اور اس کے دونوں طرف نرسلوں ہی کے اونچے، سبک ستون۔ جھونپڑیوں میں رہنے والے دو تین بچے پانی کے پاس آ کر کشتی کو دیکھنے لگے۔ جھونپڑیوں کے سامنے کی خالی جگہ میں عورتیں کام کر رہی تھیں۔ وہاں مٹی کے تندور بنے ہوئے تھے؛ کچھ عورتیں وہاں دوپہر کے کھانے کے لیے روٹیاں پکا رہی تھیں۔ ایک جھونپڑی کے سامنے بندھی ہوئی ایک گائے سکون سے چارا چبا رہی تھی۔ ''کمال ہے!'' پرمود بولا۔ ''اتنی سی سوکھی جگہ میں یہ لوگ مویشی بھی پالتے ہیں!''

''نہ پالیں تو انھیں دودھ کہاں سے ملے؟'' سلوئی نے کہا۔

''لیکن اس گائے کے چلنے پھرنے کے لیے جگہ کہاں ہے؟ چاروں طرف تو پانی ہی پانی ہے۔ بیچاری اسی کھونٹے سے بندھی بندھی ساری زندگی گزارے گی۔ کھڑے کھڑے اکتا جائے تو بیٹھ

جائے؛ بیٹھے بیٹھے اکتا جائے تو کھڑی ہو جائے!"

"کم از کم اسے چارا پانے کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکنا نہیں پڑتا: چارا اس کے سامنے ڈال دیا جاتا ہے۔"

پانی کے پاس کھڑے بچوں میں سے ایک ہاتھ ہلا رہا تھا۔ پرمود نے بھی ہاتھ ہلایا۔"پانی کی سطح اونچی ہونے پر یہ جھونپڑیاں ڈوب نہیں جاتیں؟"اس نے سلوئی سے پوچھا۔

"ان مکانوں کی نیو میں نرسل بھرے ہوئے ہیں۔ پانی اونچا ہو جائے تو نیو میں اور نرسل بھر کر انھیں اونچا کر لیتے ہیں، بس!"

"کیسی کیسی جگہوں پر، کیسے کیسے حالات میں لوگ جیتے ہیں، سوچنا مشکل ہے،" پرمود بولا۔

"آدمی بڑی لچکدار مخلوق ہے۔"

"آگے دلدلوں میں ایسی جھونپڑیوں کے گاؤں کے گاؤں آباد ہیں۔"

"بڑی عجیب بات ہے!" کشتی کے برابر سے نکلتی ہوئی جھونپڑوں پر نظر جمائے پرمود بولا۔ "میلوں تک پھیلے ہوئے پانی میں نرسلوں کے بیچ رہنے والے لوگ -- نرسلوں ہی کی طرح لچکدار! الگ ہی دنیا ہے ان کی۔"

جھونپڑیاں دھیرے دھیرے پیچھے رہ گئیں، اونچے نرسلوں کے جھنڈ میں اوجھل ہو گئیں۔ اچانک گردن گھما کر پرمود نے کہا، "تمھیں بتاؤں سلوئی، کیوں نہ ہم بھی اس نرسلوں کی دنیا میں نرسلوں کی جھونپڑی بنا کر رہنے لگیں، اور نرسلوں کی طرح ہوا میں جھوما کریں۔ دلدلوں میں بہت آگے کہیں جھونپڑی بناتے ہیں، جہاں ہمیں کوئی نہ ڈھونڈ سکے۔"

سلوئی گردن اٹھا کر زور سے ہنسی۔"کیا پاگل پن کا خیال ہے!"اس نے داہنے ہاتھ سے بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔"اور اس دلدلی ویرانے میں رہ کر کریں گے کیا؟"

"کیا کریں گے؟ کچھ نہیں! کچھ کرنا ضروری ہے کیا؟"

"ویسے چھپ کر رہنے کے لیے یہ دلدلی علاقہ بہترین ہے! یہاں حکومت کا بھی کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ یہاں میلوں تک پھیلے ہوئے دلدلی جنگل میں پولیس کسی کو کیسے تلاش کر سکتی ہے۔ دلدلوں میں رہنے والے ان لوگوں کی زندگی اپنے ہی ڈھنگ سے رواں رہتی ہے۔ ان کی آپسی دشمنیاں چلتی

Scanned with CamScanner

رہتی ہیں، خون بھی ہوتے رہتے ہیں۔ پولیس کا یہاں بالکل زور نہیں چلتا۔"

"بہت خوب! ہم یہاں رہیں گے اور اپنا حکم چلائیں گے۔ میں دلدل کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ سارے نرسل میرے سامنے جھکیں گے..."

"اچھا خواب ہے یہ! لیکن آپ کے خواب اور حقیقت میں بہت فاصلہ ہے، پرمود۔ دور سے یہ جھونپڑیاں اچھی لگتی ہیں۔ لیکن یہاں رہنے والوں کی زندگی کتنی مشکل ہے، آپ کو اس کا اندازہ ہے؟ ہر وقت اس دلدلی، گیلی جگہ میں رہنا، کھلے میں ہوا اور بارش کا سامنا کرنا، روگ بیماری غریبی برداشت کرنا..."

"سچ ہے... سچ ہے..." پرمود آہستہ سے بولا۔

دونوں ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر اور آنکھیں بند کر کے پرمود کشتی کی ریگزین کی بنی چھت پر لیٹ گیا۔ اوپر چمکتے سورج کی روشنی اس کی بند آنکھوں کے سامنے نارنجی ہو کر بہہ رہی تھی۔ اس کا سر کچھ بھاری سا ہونے لگا۔ کشتی دھیرے دھیرے ڈولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ انجن کی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ وہ ساکت لیٹا رہا۔ اچانک اسے سکون اور سکھ کا احساس ہوا۔ ایسا احساس اسے بہت دنوں سے نہیں ہوا تھا۔ کچھ عرصے سے دھیرے دھیرے اس کے دل پر ایک گھٹا سی چھا گئی تھی۔ صبری، شروان، ابوفرید — ان سب کی کہانیوں کا بوجھ اس کے دل پر پڑنے لگا تھا۔ جکڑے ہوئے ہونے کا ایک دھندلا، غیر واضح احساس اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ بھرتا جا رہا تھا۔ لیکن یہاں اس نرسلوں کے جنگل میں وہ خود کو بہت کھلا اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ نرسلوں کی یہ دنیا اسے جکڑنے والی زنجیروں سے دور واقع تھی۔ یہاں آزادی کی ہوا بہہ رہی تھی اور اس ہوا سے نرسلوں کے جھنڈ خوشی سے ڈول رہے تھے۔

سلوی نے پرمود کا کان پکڑ کر ہلایا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی طرف دیکھا۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہم یہاں جو جھونپڑی بنانے والے ہیں، اس کے بارے میں!"

سلوی ہنسی۔ "بھوک نہیں لگ رہی؟" اس نے کہا۔ "سینڈوچ کے پیکٹ کھولوں؟"

پرمود اٹھ بیٹھا۔ "میرا تو ہوا کھا کر ہی پیٹ بھر گیا ہے! لیکن چلو، کھا لیتے ہیں کچھ۔" سلوی نے

بیگ کھولا، کھانے کی چیزیں باہر نکالیں۔ ایک پیکٹ بنا کر اس نے پرمود کو تھمایا۔ ''یہ نیچے کشتی والے کے لیے ہے،'' اس نے کہا۔

ان کے کھانا کھاتے کھاتے ہی سامنے کا منظر بدل گیا۔ کشتی بہاؤ کے دہانے کے پاس آ پہنچی تھی۔ یہاں بہاؤ ایک بڑی جھیل میں مل جاتا تھا۔ جھیل کے چاروں طرف بھی بلاشبہ پانی اور نرسلوں کے جھنڈ ہی تھے۔ دلدلی علاقے میں جگہ جگہ ایسی چھوٹی بڑی جھیلیں بن گئی تھیں۔ گھڑی پر نظر ڈال کر پرمود نے کہا، ''جھیل میں ایک چکر لگا کر واپس چلتے ہیں۔''

کشتی والے نے کشتی جھیل کے پانی میں ڈالی۔ یہاں پانی گہرا ہونے کی وجہ سے الگ رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ پیچھے تنگ بہاؤ میں سے کشتی آرام سے نکل آئی تھی، دونوں طرف سے نرسلوں کی اونچی دیواروں میں گھرے ہونے کی وجہ سے ہوا پانی سے نہیں ٹکرا رہی تھی؛ لیکن جھیل کے کھلے پانی میں ہوا سے لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کشتی زیادہ ڈول رہی تھی۔ ''نیچے چل کر بیٹھیں؟'' پرمود نے سلوئی سے پوچھا۔

''نہیں، یہیں ٹھیک ہے،'' وہ بولی۔ ''یہاں کھلے میں زیادہ اچھا لگتا ہے۔''

کچھ دیر بعد کشتی کے انجن سے زور کی پھچپھناہٹ بلند ہوئی اور پھر وہ بند ہو گیا۔ پرمود نے سلوئی کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا؟'' وہ بولا۔ پھر چھت سے جھک کر نیچے دیکھا۔ دونوں نیچے اتر آئے۔ کشتی والا انجن کو دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں تھا۔ کشتی کے جنگلے سے ٹیک لگا کر وہ دونوں کشتی والے کی ان کوششوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ انجن، انجن کے پائپ، ہر چیز بہت پرانی معلوم ہوتی تھی۔ ایک جگہ سے پائپ رس رہا تھا۔ اس میں سے بوند بوند ٹپکتے ہوئے تیل کی ایک لکیر کشتی کے پہلو سے نیچے جا رہی تھی۔ ''دیکھو سلوئی،'' پرمود نے کہا، ''ہر جگہ تیل پھیلا ہوا ہے اور یہ صاحبزادے انجن ٹھیک کرتے ہوئے مزے سے سگریٹ پی رہے ہیں۔''

بہت دیر گزر گئی مگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔ کشتی والا اپنی کھٹ پٹ کرتا رہا۔ پرمود اور سلوئی کو جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی۔ چھاؤں میں بے حرکت کھڑے ہونے کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی لگنے لگی۔۔ دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑے تھے۔

''اچھی مصیبت میں پھنس گئے ہم!'' پرمود بولا۔ ''کار یا بس خراب ہو جائے تو نیچے تو اتر سکتے

ہیں، یہاں کیا کریں؟''

''آس پاس کوئی بھی نہیں ہے،'' سلوی نے کہا۔ ''اس نرسلوں کے جنگل میں صرف ہم ہیں!''

کچھ دیر پہلے ایک کشتی دو تین لوگوں کو بٹھائے گزری تھی۔ وہ جھیل پار کر کے اوپر کی طرف گئی تھی۔

''جب تک کشتی آگے بڑھ رہی تھی تب تک اچھا لگ رہا تھا، اس کے رکنے سے کوفت ہونے لگی،'' سلوی بولی۔ دو تین بار اس نے کشتی والے سے پوچھا۔ ہر بار اس نے یہی جواب دیا، ''ابھی ٹھیک ہو جائے گی... ابھی ٹھیک ہو جائے گی...''

''خواہ مخواہ وقت ضائع ہو رہا ہے یہاں،'' پرمود نے کہا۔ ''لوٹنے میں دیر ہو گئی تو بڑی مشکل ہو گی۔''

''یہ دیکھا...'' کشتی کے پچھلے حصے کو دیکھتے ہوئے سلوی نے کہا۔ ''ہوا سے ہماری کشتی دھیرے دھیرے ایک طرف جا رہی ہے۔'' کشتی بہتے بہتے نرسلوں کے ایک جھاڑ کے پاس آ پہنچی تھی۔ کچھ دیر میں نرسلوں سے جا لگی۔ پھر کشتی والے نے ایک لمبی لاٹھی لے کر کشتی کو نرسلوں سے دور ٹھیلا۔ اس کی لاٹھی پانی میں بہت اندر تک گئی تھی۔

''یہاں اس ویران جگہ پھنس کر رہ جانا بڑی کوفت کی بات ہے،'' پرمود نے غصے سے داہنے ہاتھ کی مٹھی بائیں ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا۔

''آپ تو یہاں جھونپڑی ڈال کر رہنے کا سوچ رہے تھے!''

''میں نے ایسے مسئلوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا، یہ بات سچ ہے،'' پرمود نے اعتراف کیا۔

''آپ کو معلوم ہے، اس علاقے میں کبھی کبھی اچانک بڑی تیز ہوا چلتی ہے اور طوفان آ جاتا ہے۔ اگر اس وقت ہم طوفان میں پھنس گئے تو؟''

کچھ دیر وہ دونوں خاموشی سے کشتی والے کی تگ و دو دیکھتے رہے۔ پھر اچانک پھٹ پھٹ کی آواز آئی اور انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ کشتی والا اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرایا۔ پرمود اور سلوی نے سکون کا سانس لیا۔ ''اب اس جھیل میں سیر نہیں کریں گے، سیدھے واپس چلتے ہیں،'' پرمود بولا۔

Scanned with CamScanner

کشتی والے نے کشتی موڑ لی۔ کشتی کے دوبارہ تنگ بہاؤ میں داخل ہونے کے بعد پرمود اور سلوی پھر چھت پر جا بیٹھے۔ اوپر چڑھتے چڑھتے پرمود نے پانی کی طرف دیکھا تو کشتی کے پاس ہی پانی کی سطح کے کچھ نیچے اسے ایک کتے کی لاش تیرتی دکھائی دی۔ اس کی کھال گل کر گر چکی تھی اور اس کا جسم شفاف گلابی معلوم ہو رہا تھا۔ اس میں ایک عجیب قسم کی پاکیزگی آ گئی تھی۔ سلوی نے، جو سیڑھی سے اوپر جا چکی تھی، پرمود کو بیچ میں رکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بھی پانی کی طرف دیکھا۔ کشتی اب تک آگے بڑھ آئی تھی۔

''کیا تھا؟'' سلوی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں،'' پرمود بولا اور اوپر آ گیا۔

جیٹی پر کشتی سے اتر کر گاڑی کا لمبا سفر؛ شہر پہنچتے پہنچتے ساڑھے چار بج گئے۔ پرمود نے سلوی کو ایک مضافاتی چوک میں اتارا اور پھر گاڑی فرانسوا کو لوٹا دی۔

گھر پہنچ کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ شام ہوئی تب اٹھا۔ باہر نکلا۔ سوچا یونیورسٹی کلب میں جا کر ایک بیئر پی کر تھکان دور کی جائے۔

کلب میں پرمود کو کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کا پروفیسر پلّے ملا۔ پہلے اس سے انڈین کلب میں مڈبھیڑ ہوتی تھی۔ ''آج کل انڈین کلب میں دکھائی نہیں دیتے آپ،'' پلّے نے کہا۔

''نہیں، جی نہیں چاہتا،'' پرمود بولا۔

اس نے پلّے کو بتایا کہ آج وہ دلدلی علاقے میں ہو کر آیا ہے۔ پلّے نے کہا کہ وہ کبھی اس طرف نہیں گیا۔

''آں؟ اتنے سال سے یہاں ہیں اور ایک بار بھی وہاں نہیں گئے؟''

''نہیں،'' پلّے بولا۔ ''میں پانی کی طرف نہیں جاتا۔'' جیوتشی نے بتایا ہے کہ مجھے پانی سے خطرہ ہے۔''

باتیں کرتے کرتے پلّے نے کہا، ''کیا آپ نے سنا، ہمارے ڈپارٹمنٹ کے عقیل نے خودکشی کر لی؟''

پرمود ایک دم آگے کو جھک آیا۔ ''خودکشی کر لی؟ عقیل نے؟''

Scanned with CamScanner

''ہاں، کل ہی ہمیں پتا چلا۔ سنا، اس کی بیوی اسے چھوڑ گئی تھی!''

پرمود چند لمحے کچھ نہ بولا۔ پھر اس نے پوچھا، ''کیسے کی؟''

''غالباً نیند کی گولیاں کھا کر۔''

عقیل کا چہرہ پرمود کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس کا چہرہ۔ اس کی پاٹ دار آواز۔ اسے خیال آیا، کتنے دن سے عقیل سے ملنا نہیں ہوا تھا۔ ملنا چاہیے تھا۔ سوچتے سوچتے رہ گیا۔ اور اب تو چلا ہی گیا، پاٹ دار آواز والا عقیل۔ ''سی یو لیٹر، ایلی گیٹر!'' پرمود آہستہ سے خود سے بولا اور اداسی سے ہنسا۔

''آں؟ کیا کہا؟'' پلّے نے پوچھا۔

دوسرے دن صبح پرمود بہت دیر سے جاگا۔ چھٹی کا دن تھا۔ جمعہ۔ اس لیے دیر سے اٹھنا ٹھیک تھا۔ پچھلی رات اسے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ دلدلی علاقے کے سفر کی تصویریں اس کے ذہن میں تیرتی رہیں؛ رہ رہ کر عقیل کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا اور اس کی باتیں یاد آنے لگتیں۔ ایسے عجیب آمیزے میں اس کا ذہن رات دیر تک ہچکولے کھاتا رہا۔ صبح جاگنے کے بعد بھی وہ بہت دیر بستر میں پڑا رہا۔ پھر لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر اس نے ریڈیو چلایا۔ وائس آف امریکہ کے بریک فاسٹ شو کی مسلسل آواز، جو ویسے بہت خوش کن لگتی تھی، آج اسے عجیب معلوم ہوئی۔

نیچے چوک میں ہمیشہ کے بھکاری کی اونچی صدائیں سنائی دینے لگی تھیں: ''الیوم جمعہ... الیوم جمعہ...'' اب تک پرمود کو اس فقرے کا مطلب سمجھ میں آ چکا تھا۔ یہ بھکاری صرف جمعے کے دن آ کر اس چوک میں کھڑا ہوتا تھا۔ شاید الگ الگ دن وہ الگ الگ جگہ بھیک مانگتا ہوگا۔ اس طرف آگے ایک مسجد تھی اور وہ جمعے کے دن نمازیوں سے زیادہ بھیک ملنے کی امید میں یہاں آ کھڑا ہوتا ہوگا۔

مکھرجی نے پرمود کو دوپہر کے کھانے پر بلا رکھا تھا۔ شرما کے ہسپتال جانے کے بعد سے مکھرجی اکیلا تھا؛ کبھی کبھی کسی مہمان کا گھر آنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس لیے اِدھر اس نے پرمود کو ایک آدھ بار چائے پر بلایا تھا۔

دوپہر کو پرمود مکھرجی کے ساتھ شرما کو دیکھنے ہسپتال گیا۔ پہلے کی ایک دو ملاقاتوں میں شرما خوشی سے ہنستا بولتا تھا؛ اس بار وہ کچھ اداس دکھائی دیا۔ خاصا دبلا ہو گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

''ہسپتال میں اسے بہت دن ہو گئے،'' واپسی میں پرمود نے نکھرجی سے کہا۔ ''ابھی اور بہت دن رہنا پڑے گا، ڈاکٹروں کا یہی کہنا ہے نا؟''

''ہاں،'' نکھرجی نے کہا۔ ''کالج کی ٹرم شروع ہونے کے بعد وہ کچھ ہی دن ڈیوٹی پر گیا تھا۔ اس کے بعد سے یہیں ہے۔ سِک لیو کب کی ختم ہو چکی؛ اب وہ بغیر تنخواہ کی چھٹی پر ہے۔''

''یہاں پردیس میں ہسپتال میں پڑے رہنے کے بجائے وہ گھر واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟''

''گھر جا کے کیا کرے گا؟ کیا فرق پڑ جائے گا؟ یہاں نوکری کی جگہ پر رہنا ہی ٹھیک ہے۔ اگر قسمت سے جلدی اچھا ہو گیا تو فوراً جوائن کر سکے گا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے،'' پرمود نے کہا۔

اس دن شام کے وقت پرمود نے پلنگ کے نیچے سے ٹائپ رائٹر نکالا اور باہر کے کمرے میں میز پر لا کر رکھا۔ اس نے بہت دنوں کے بعد ٹائپ رائٹر باہر نکالا تھا۔ بہت عرصے سے اس نے آئیڈنٹٹی کے موضوع پر اپنی تحریر کو چھونے کی کوشش نہیں کی تھی؛ اب اسے اپنا یہ کام پھر سے یاد آیا۔ یہاں آئے ہوئے اسے بہت دن گزر چکے تھے، ٹائپ رائٹر اور کتابیں بھی بہت پہلے پہنچ چکی تھیں، لیکن اب تک اس کا کام ذرا بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ یہ ٹھیک نہیں تھا۔ اس لیے وہ آج خاص طور پر ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھا۔ میز پر بیٹھ کر وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پھر کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگا۔ ذہن میں خیالات جمع نہیں ہو پا رہے تھے۔ پہلے اس نے اپنے ذہن میں جو خاکہ بنایا تھا، اور جس پر اب اسے آگے کام کرنا تھا، اس کی گرہ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ پرمود سوچنے لگا کہ یہ کہیں پہلے والے واقعے کی تکرار تو نہیں! کیا ٹائپ رائٹر استعمال کرنے کے اُسی اعصاب زدہ خوف سے اس کے لیے لکھنا دوبارہ ناممکن ہوا جا رہا تھا؟ اس کا خیال تھا کہ یہ خوف اب تک دور ہو چکا ہوگا۔ اس نے بڑے عزم کے ساتھ اپنے دماغ کو ٹٹولا، لیکن اسے ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہ اس خوف کے باعث نہ لکھ پا رہا ہو۔ کرسی سے اٹھ کر اس نے کمرے میں تیز قدموں سے دو چار چکر لگائے۔

پھر اچانک پرمود کے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ جس خیال کو وہ پروان چڑھانا چاہتا تھا اس میں موجود گرمی اور شدت شاید کمزور پڑ گئی تھی۔ آئیڈنٹٹی کے تصور سے اس کا ذہن اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ اس عرصے کے دوران ایسا غیر شعوری طور پر ہو گیا تھا۔ ایسا ہونے کی کیا وجہ ہے؟ ابھی کل تک جو سوال اس

کے لیے اتنا اہم اور قریبی تھا، آج اس کے بارے میں اس کا لگاؤ اور اُتساہ کیوں ختم ہو گیا تھا؟ پرمود سوچتا رہا۔ اس عرصے میں ہونے والے واقعات اس کے آنکھوں کے آگے سے گزرنے لگے: عقیل، صبری، شروان، ابوفرید — سب کی زندگیوں کی الگ الگ نوعیت کی گھٹن؛ پرمود کو ان سب کا احساس ہوا اور اپنے ساتھ پیش آنے والے چھوٹے موٹے حادثوں کا بھی۔ اس عرصے میں پیش آنے والے تجربات سے اور جو کچھ دیکھا سنا تھا اس سے اس کے ذہن میں قائم تصور بدل سا گیا تھا۔ یہاں لوگوں کے لیے آزادی سے جینے اور اپنی مرضی کا راستہ چننے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ حکومت نے ان کی زندگیاں اپنے قابو میں کر رکھی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے پرمود کے ذہن میں آئیڈنٹٹی کا سوال دھیرے دھیرے غائب ہوتا گیا تھا۔ کیونکہ یہاں کی زندگی کے سیاق وسباق میں بھلا آئیڈنٹٹی جیسے سوالوں کی کیا اہمیت تھی۔ یہ لفظ ہی یہاں بے معنی سا محسوس ہونے لگا تھا۔ خود اپنی آئیڈنٹٹی وضع کرنے کے لیے اتنی ہی آزادی بھی چاہیے ہوتی ہے۔ ورنہ آئیڈنٹٹی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

جوں جوں یہ سب کچھ اس کے ذہن میں سلجھتا گیا، اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ زندگی کو جس زاویے سے دیکھتا آیا ہے اب اس سے الگ زاویے سے دیکھنے لگا ہے۔ آئیڈنٹٹی کو وہ ایک اہم سوال مانتا آیا تھا، لیکن آئیڈنٹٹی سے بھی زیادہ بنیادی ایک اور چیز تھی جس کے بغیر آئیڈنٹٹی وجود تک میں نہیں آسکتی تھی۔ آزادی کی ایک کم از کم خاص مقدار اس کے لیے ضروری تھی۔ اب تک وہ آزادی کی اس مقدار کو ہر ایک کے لیے دستیاب سمجھتا رہا تھا۔ دراصل ایسا سمجھنا درست نہیں تھا۔ یہاں، اس ملک میں اتنی آزادی میسر نہیں تھی۔ دنیا کے بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں لوگوں کو اتنی آزادی میسر نہیں آسکتی۔ ان باتوں کا تو اسے خیال تک نہ آیا تھا۔ آج تک وہ کسی گمان میں تھا اور اسے ادراک نہ ہوا تھا کہ اس کی زندگی کیسی بھربھری زمین پر بنیاد رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ مضطرب کرنے اور ذہن کو کچوکے لگانے والا تھا۔

پرمود نے ٹائپ رائٹر کا ڈھکن لگا کر اسے دوبارہ پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ پھر وہ سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

مارکیٹ میں ایک دن پرمود کو ایک ہندوستانی جہازی ملا۔ کچھ بات چیت ہونے کے بعد پرمود

Scanned with CamScanner

نے اسے اپنا نام بتایا تو وہ ایک دم مراٹھی میں بولا: ''ارے واہ، یعنی آپ کوکن کے رہنے والے ہیں۔ میں بھی وہیں کا ہوں، میرا نام قاضی ہے۔ میرا قصبہ راجاپور ہے، آپ کے وینگرلا کے بالکل پاس!''

پرمود ہنستے ہوئے بولا، ''وینگرلا کس قسم کی جگہ ہے، اس کا مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں۔ میں کبھی وہاں نہیں گیا۔''

پھر بھی کوکنی ہونے کی وجہ سے قاضی کو پرمود سے لگاؤ سا معلوم ہوتا تھا؛ دونوں باتیں کرتے کرتے چلتے رہے۔ اس سے بات کرتے ہوئے پرمود کو احساس ہوا کہ وہ کتنے عرصے کے بعد مراٹھی بول رہا ہے۔

قاضی جہاز پر انجینئر یا ایسا ہی کچھ تھا۔ جہاز جنوبی امریکہ کا چکر لگا کر لوٹ رہا تھا۔ ''بہت سالوں بعد بصرہ آیا ہوں،'' قاضی بولا۔ ''دوسری جنگِ عظیم میں میں فوج میں تھا؛ اس وقت انگریز ہمیں یہاں لائے تھے۔''

''کیا آپ نے یہاں کسی بڑی لڑائی میں حصہ لیا تھا؟''

''نہیں، لڑائی وڑائی تو کچھ نہیں ہوئی، بس یہاں پڑاؤ ڈالا تھا۔''

''یہ شہر بہت مختلف رہا ہوگا اُس زمانے میں؟''

''بالکل، بہت پسماندہ تھا۔ اب تو بہت بدل گیا ہے۔''

''پھر تو آپ کو یہاں بڑی اکتاہٹ ہوئی ہوگی؟''

''نہیں، آرام ہی تھا۔ رنڈیاں اچھی مل جاتی تھیں اُن دنوں۔ تب تک تیل نہیں نکلا تھا، اس لیے یہاں پیسہ نہیں تھا۔ رنڈیاں سستی تھیں۔ میں بھی جوان تھا۔''

شام کے وقت پرمود قاضی کے جہاز پر گیا۔ قاضی نے پرمود کو جہاز کی سیر کرائی۔ جہاز اندر سے بہت وسیع معلوم ہوا۔ شکر کی بوریاں اتارنے کا کام چل رہا تھا۔ پھر قاضی پرمود کو انجن روم میں لے گیا۔ چھوٹے بڑے پائپوں کا بڑا سا جال دور دور پھیلا دکھائی دیا، اور ایک متواتر اونچی گھرگھراہٹ۔ پھر دونوں عرشے پر آ کر ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ عرشے سے نیچے دریا کا پانی بہت دور معلوم ہو رہا تھا۔ پانی میں جہاز کے پاس ایک تنگ سی کشتی میں ایک عورت اوپر جہاز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر دوسری کشتی میں ایک اور عورت تھی۔ کچھ کچھ

دیر میں چیخو چلاتی ہوئی یہ عورتیں جہاز کے اردگرد چکر لگاتی ہوئی اوپر دیکھ رہی تھیں۔ جہاز کے نچلے عرشے پر دو چار آدمی کھڑے تھے؛ عورتیں ان کے پاس پہنچیں تو ان سے چلا کر کچھ کہا۔ ان میں سے ایک شخص نے چلا کر اسے جواب دیا اور زور سے ہنسا۔ باقی سب بھی ہنسنے لگے۔ وہ ویشیائیں تھیں، یہ بات ظاہر تھی۔ جہاز سے گاہک ڈھونڈنے کا ان عورتوں کا طریقہ پرمود کو دلچسپ لگا۔

قاضی پرمود کو اپنے کیبن میں لے گیا۔ اسکاچ کی بوتل نکالی۔ رات کو دیر تک دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ قاضی کا دیا ہوا ڈن ہل کا پیکٹ لے کر لوٹتے وقت تک پرمود کو خاصی چڑھ گئی تھی۔ موٹر بوٹ میں ٹھنڈی ہوا لگ رہی تھی۔ آس پاس کی کشتیوں کی بتیوں کے پانی میں پڑتے ہوئے عکس پرمود کو خواب جیسے لگ رہے تھے۔

خضیر نام کے ایک طالب علم سے پرمود کی دوستی ہو گئی۔ لمبے قد، دبلے بدن اور آگے کو نکلے ہوئے دانتوں والا خضیر کمیونسٹ تھا۔ اس لیے شروان کی طرح اس کی بھی اسٹوڈنٹس یونین کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ لیکن شروان کے برعکس خضیر اعصاب زدہ اور خوف کا شکار نہیں تھا۔ وہ مضبوط مزاج کا تھا؛ اپنی صورت حال کی مشکلات کا اسے اچھی طرح شعور تھا اور مشکلات کا سامنا کر کے ان پر قابو پانے کا عزم بھی تھا۔ حکمران پارٹی کے بارے میں وہ شکایتی لہجے میں بات کرتا، ''ہم کمیونسٹوں کی مدد سے انھوں نے اقتدار پر قبضہ کیا اور اب یہ لوگ ہمیں کانٹوں کی طرح باہر نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ جہاں دیکھو کمیونسٹوں پر تشدد کیا جا رہا ہے۔''

ایک بار پرمود کلاس میں پڑھا رہا تھا کہ اسٹوڈنٹس یونین کا ایک لڑکا ایک رقعہ لے کر آیا؛ خضیر کو یونین کے دفتر میں بلایا گیا ہے۔ خضیر اس لڑکے کے ساتھ گیا تو پھر کلاس میں لوٹا ہی نہیں۔ دوسرے دن راہداری میں خضیر دکھائی دیا تو پرمود نے مذاق میں اس سے کہا، ''کیوں خضیر، کل تم کلاس سے گئے تو واپس ہی نہیں آئے۔ کلاس سے بھاگنے کا بہانہ مل گیا!''

پرمود کو ایک طرف لے جا کر دھیمی آواز میں خضیر نے کہا، ''میں آپ کو بتاتا ہوں کیا ہوا، ڈاکٹر۔ یونین کے لوگ مجھے عمارت کی چھت پر لے گئے۔ وہاں میرے گلے میں پھندا ڈالا اور تھوڑا کس دیا۔ کہا، 'اس کاغذ پر دستخط کرو کہ کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔' میں نے انکار کیا۔

مجھے معلوم تھا وہ مجھے مارنے والے نہیں، صرف مجھے دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا، 'تم دستخط نہیں کرو گے تو ہم تمھارے جگہ تمھارے باپ پر تشدد کریں گے۔' پھر میں نے کاغذ پر دستخط کر دیے۔ اس سب میں اتنی دیر لگ گئی کہ آپ کا پیریڈ ختم ہو گیا، ڈاکٹر۔ جب میں کلاس میں واپس آیا تو کمرہ خالی تھا۔ صرف میری کتابیں میرے ڈیسک پر پڑی تھیں۔''

پرمود نے سوچا، یہ بالکل الگ دنیا ہے: اس دنیا میں ہنسی مذاق کرنا عجیب اور بھونڈی بات ہے۔

ایک دن مکھر جی پرمود کے گھر بیٹھا تھا کہ پرمود نے کہا، ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہاں کی حکومت سوشلسٹ ہے، روسیوں کی اتحادی ہے، پھر بھی کمیونسٹوں سے اتنی دشمنی رکھتی ہے! اور دوسری طرف امریکیوں کو بھی گالیاں دیتے ہیں!''

''ارے، تیسری دنیا کی حکومتوں کا یہی چلتا ہے۔ آئیڈیالوجی کو یونہی ایک طرف ڈال دیا جاتا ہے۔''

''سچ ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''میڈیکل کالج میں کیمرون نام کا ایک شخص ہے۔ اس کا بتایا ہوا ایک قصہ مجھے یاد ہے۔ کیمرون کچھ عرصے ترکی میں پڑھاتا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ انقرہ سے آنے اور جانے والی بسوں کی تلاشی لی جاتی تھی؛ شہر سے پراپیگنڈا کے لیے گاؤں جانے والے بائیں بازو کے انقلابی کارکنوں کی تلاش ہوتی تھی؛ اور گاؤں سے شہر آنے والے دائیں بازو کے مذہبی شدت پسندوں کو پکڑا جاتا تھا۔''

''تیسری دنیا کی زیادہ تر حکومتیں پہلی اور دوسری دنیا دونوں سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ انھیں بائیں بازو سے بھی خطرہ رہتا ہے اور دائیں بازو سے بھی۔''

''لیکن وہ اپنا الگ راستہ کیوں نہیں ڈھونڈ لیتیں؟''

''یہی تو تیسری دنیا کا المیہ ہے۔ اصلی تیسری دنیا کا کوئی وجود ہی نہیں! نام نہاد تیسری دنیا دراصل صرف پہلی اور دوسری دنیا کے تناؤ کا مقام ہے — دونوں کے بیچ میں پھنسا ہوا۔ حقیقت میں پہلی دنیا کی آزادی کی آنچ اور دوسری دنیا کی مساوات اور انصاف کی آرزو، ان دونوں کو ملا کر ایک خوبصورت تیسری دنیا بن سکتی ہے — ایک اصلی تیسری دنیا!''

''لیکن یہ خواب کی تیسری دنیا حقیقت میں کیسے بنے گی، مسٹر مکھر جی؟'' پرمود نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''دونوں دنیاؤں کی بہتر چیزوں کو ملانے کی جو تجویز آپ دے رہے ہیں، کیا کسی نے اس کی عملی مثال پیش کی ہے؟''

''وہ شاہ کلید تو اب تک کسی کو نہیں ملی ہے، یہ سچ ہے۔ لیکن کیا ہمیں کوشش نہیں کرتے رہنا چاہیے؟''

''ہوں...'' پرمود نے غیر یقینی سے انداز میں ہونکارا ابھرا۔

مکھر جی اور پرمود کی اس طرح کی باتیں دو چار بار ہوئیں۔ گھر میں شرما کا ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے مکھر جی پرمود کے گھر آ نکلتا۔ اس بنگالی بابو کو بحث مباحثے کا بڑا شوق تھا۔ پرمود بنیادی طور پر سننے والے کا کردار ادا کرتا تھا، جو مکھر جی کے حساب سے درست ہی تھا۔ ایک دن دونوں جب اس طرح بیٹھے باتیں کر رہے تھے، خضیر پرمود کے گھر آ گیا۔ مکھر جی اور پرمود سمیری اور بابلی تاریخ کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔ پرمود نے کہا، ''مکھر جی صاحب، میں نے آپ سے یہاں کی تاریخ کے بارے میں دو چار کتابیں پڑھنے کے لیے لی تھیں، لیکن انھیں اب تک پڑھا نہیں۔ صرف الٹ پلٹ کر دیکھا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے تم جیسے جوان آدمی کو ایسی کتابوں کے مقابلے میں دوسری چیزوں سے زیادہ دلچسپی ہے،'' مکھر جی نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

اُر کے زیگورات اور مقبروں کے بارے میں بات کرتے کرتے مکھر جی نے کہا، ''تمھیں معلوم ہے اُر کے بادشاہوں کی قبریں کہاں بنی ہوئی ملی تھیں — کوڑے کے ڈھیر پر! ہاں، وُولی نے اُر پر اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وُولی کھدائی کرتا رہا لیکن کوڑے کی پرتیں ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں۔ سمیری شاہی خاندان کی وہ قبریں اتنی قدیم تھیں، لیکن کوڑا اُن سے بھی پرانا تھا۔ بات یہ تھی کہ سمیری لوگ شہر کی دیوار کے دوسری طرف کوڑا پھینکتے تھے۔ اس طرح کوڑے کے ڈھیر بڑھتے گئے۔ صدیوں پرانے کوڑے کے ڈھیر!''

''ہاہاہا!'' پرمود ہنسا۔ اتنے زور سے وہ کبھی کبھار ہی ہنستا تھا۔ ''یہ گریٹ ہے، مکھر جی صاحب! یعنی آپ کی پوری تاریخ کس پر کھڑی ہے — کوڑے کے ڈھیر پر! تاریخ کی تہہ میں کیا ہے: کوڑے کی پرتیں! سو مچ فار ہسٹری، مسٹر مکھر جی! (So much for history!)''

Scanned with CamScanner

نظیر بھی اپنے آگے کو نکلے ہوے دانت دکھاتے ہوے ہنسا۔

''ایسا مت کہیے،'' ٹھکر جی تھوڑا سا ہنس کر سنجیدہ ہوتے ہوے بولا۔ ''تاریخ میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اگر آپ غور سے پڑھیں تو تاریخ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں — سبق حاصل کر سکتے ہیں۔''

''ہاں، تاریخ یقیناً دلچسپ موضوع ہے، مجھے اس سے انکار نہیں،'' پرمود نے کہا۔ ''لیکن سمیری اور بابلی تہذیبیں بہت پراچین ہیں، ہے نا؟ آج کے عراق سے ان کا کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔''

''بالکل غلط!'' ٹھکر جی نے بڑے جوش سے کہا۔ ''اس کے برعکس، اگر آپ آج کے عراق کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو سمیری اور بابلی تاریخ کا مطالعہ لازماً کرنا پڑے گا۔ ایک سامنے کی مثال دیتا ہوں: کیا آپ جانتے ہیں، مصر کے اسرائیل کے ساتھ مفاہمت کا سلسلہ شروع کرنے پر عراق بہت برہم ہے؛ مصر اور عراق کے درمیان بڑا تناؤ آ گیا ہے۔ اصل میں اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ صدیوں سے نیل کی وادی اور دجلہ وفرات کی وادی میں قائم تہذیبوں کا آپس میں ٹکراؤ جاری ہے۔ یہ اسی کی جدید اور تازہ ترین شکل ہے!'' جب پرمود کچھ نہ بولا تو ٹھکر جی بحث جیتنے کے عزم کے ساتھ آگے کہنے لگا، ''پرسوں تم مجھ سے یہاں کی حکم شاہی کے بارے میں بات کر رہے تھے، ہے نا؟ اس خطے کی قدیم تاریخ میں جھانک کر دیکھیں تو کیا نظر آئے گا؟ سمیری باشندوں کی تہذیب بالکل ایسی ہی تھی — سب کی زندگیاں سرکار کے ہاتھوں میں! پرائیویٹ انٹرپرائز کی قریب قریب کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ یہاں کی موجودہ سرکار خود کو سوشلسٹ کہلاتی ہے۔ سمیریوں کے نظام کو بیان کرنے کے لیے بھی ایک مصنف نے یہی لفظ سوشلزم استعمال کیا ہے!''

ٹھکر جی نے فاتحانہ انداز سے پرمود کی طرف دیکھا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی، ''آپ کو ایک اور دلچسپ مثال دیتا ہوں۔ ان کردوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ شمال کے ان باشندوں میں سے کچھ کو سرکار نے جان بوجھ کر ان کی مخالفت توڑنے کے لیے یہاں جنوب میں آباد کر رکھا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ٹھیک یہی طریقہ ہمیں صدیوں پہلے کی تاریخ میں دکھائی دیتا ہے۔ تگلاتھ پلیسر (Tiglathpileser) نام کے آشوری بادشاہ نے بھی یہی اسٹریٹجی اختیار کی تھی۔ اس نے مختلف ملکوں کے لوگوں کی مزاحمت کو توڑنے کے لیے انھیں ہزاروں کی تعداد میں اپنی جگہ سے نقل مکانی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ تاریخ کا یہی معاملہ ہے۔ کہتے بھی تو ہیں کہ تاریخ خود کو

Scanned with CamScanner

دہراتی ہے۔ ارے، صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن انسانی سماج کی اصل ذرا بھی نہیں بدلتی۔''

پرمود سر ہلاتے ہوئے بولا، ''مکھرجی، آپ کا تاریخ کا مطالعہ بہت ہے، اس لیے آپ اس طرح کی ٹھیک ٹھیک مثالیں دے سکتے ہیں۔''

مکھرجی خوش ہو کر ہنسا۔ پھر وہ اٹھا اور شیلف سے ایک کتاب نکالی۔ ''ایک اور دلچسپ مثال دیتا ہوں،'' کتاب کے پنّے الٹتے ہوئے اس نے کہا۔ ''سمیریوں کے خدا بھی اسی نمونے کے تھے۔ آن، انلیل، انکی — یہ سب کٹھور حکم شاہ ہی تھے۔ یہ دیکھیے، اس کتاب کے مصنف نے انکی کے حضور گزاری جانے والی ایک دعا کا ترجمہ دیا ہے۔ اس کی ایک سطر میں اسے خداؤں کا بگ برادر قرار دیا گیا ہے۔ ترجمے میں بگ برادر کی اصطلاح کو واوین میں لکھا ہے۔ جیسے ہم لوگ آج کل روسیوں کو کہتے ہیں، اسی طرح اس نے انکی کو بگ برادر کا لقب دیا ہے!''

پرمود نے کتاب مکھرجی کے ہاتھ سے لے کر اسے پڑھتے ہوئے کہا، ''مزے دار بات ہے! اس ترجمہ کار کو شاید اس کا احساس نہ ہو، لیکن اس نے انکی کے بارے میں جو لفظ استعمال کیے ہیں وہ یہاں کے آج کے حکمرانوں پر بھی ٹھیک بیٹھتے ہیں!''

خضیر جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، آگے کو جھک کر مکھرجی سے کہنے لگا، ''معاف کیجیے پروفیسر، لیکن آپ کا نظریہ مجھے قبول نہیں۔ تاریخ ایک ہی دائرے میں چکر نہیں لگایا کرتی۔ تاریخ آگے بھی بڑھتی ہے۔ ہمیں تو اس پرانی تاریخ سے چھٹکارا پانا ہے! ہمیں اس ملک میں تبدیلی لانی ہے۔ ہم آپ کی اس نہ بدلنے والی تاریخ کی قید میں نہیں رہ سکتے۔''

پرمود خضیر کی طرف مڑ کر بولا، ''لیکن خضیر، تم کمیونسٹوں کو یہاں کا اقتدار چاہیے؛ مگر موجودہ حکومت کو ہٹا کر تم لوگ آ جاؤ تب کیا فرق پڑ جائے گا؟ تم بھی لوگوں پر موسل ہی گھماؤ گے۔ تم بھی انھیں کچھ زیادہ آزادی تو دینے سے رہے۔''

''اس کا انحصار اس پر ہے کہ آزادی کس کے لیے اور کس بات کی۔''

پرمود نے نام لیے بغیر صبری، عقیل، ابوفرید کے بارے میں خضیر کو بتایا۔ خضیر بھڑک کر بولا، ''ایسے لوگوں کی آزادی کی کس کو پروا ہے! — غیر ملکی عورت سے بیاہ کرنے کی آزادی، یہ کتنے لوگوں کو چاہیے ہوگی؟ کس طرح کے، کس طبقے کے لوگوں کو؟ اور اسی طرح کسی مالدار شخص کو یہاں فری انٹرپرائز

کے پردے میں عوام کا استحصال کرنے کی آزادی نہ ملے تو اس کا غم کیوں کیا جائے؟ ایسے لوگوں کو آزادی ملنی ہی نہیں چاہیے۔"

"ایک لحاظ سے تمھاری بات ٹھیک ہے،" پرمود نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمھارے خیالات خطرناک لگتے ہیں۔ آزادی کی بعض شکلیں چاہے اتنی اہم یا قابلِ دفاع نہ ہوں، لیکن اس طرح دھیرے دھیرے عام لوگوں کی چھوٹی چھوٹی آزادیاں بھی کچلی جاتی ہیں۔"

کچھ دن بعد رات آٹھ نو بجے کے قریب خضیر پرمود کے گھر آیا۔ اس وقت اسے دیکھ کر پرمود کو حیرت ہوئی۔ "کوئی خاص کام ہے کیا؟" پرمود نے پوچھا۔ لیکن خضیر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے میں لگا رہا۔ پھر بولا، "ڈاکٹر، کیا میں آپ کا ٹائپ رائٹر یہاں بیٹھ کر استعمال کر سکتا ہوں؟"

پرمود کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے خضیر کو کبھی نہیں بتایا تھا کہ اس کے پاس ٹائپ رائٹر ہے۔ خضیر نے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ "تمھیں کس نے بتایا کہ میرے پاس ٹائپ رائٹر ہے؟" پرمود نے پوچھا۔

خضیر کوئی وضاحت کیے بغیر صرف مسکرا دیا۔ تہ کیے ہوئے دو کاغذ جیب سے نکال کر بولا، "بس ذرا یہ رپورٹ ٹائپ کرنی ہے۔" اس نے کاغذ پرمود کے سامنے کر دیے۔ پرمود ان کاغذوں کو تکتا رہا۔

"انگریزی میں لکھی ہوئی یہ رپورٹ ملک کے باہر بھیجی جائے گی،" خضیر بولا۔ "ہاتھ سے لکھنے سے بہتر ہے ٹائپ کر کے بھیجی جائے۔ یہاں انگریزی ٹائپ رائٹر بہت مشکل سے ملتا ہے، اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

پرمود خاموشی سے خضیر کے ہاتھوں میں دبے کاغذوں کو دیکھتا رہا۔ پرمود کو چپ دیکھ کر خضیر نے کہا، "گھبرایئے مت، ڈاکٹر۔ اس میں آپ کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بہت سے ٹائپ رائٹروں کا ٹائپ ایک جیسا ہوتا ہے۔" پھر کچھ رک کر بولا، "اور پھر آپ کا ٹائپ رائٹر تو رجسٹر کیا ہوا بھی نہیں ہے۔"

پرمود نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ خضیر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

پرمود خاموشی سے اٹھا اور اندر جا کر پلنگ کے نیچے سے ٹائپ رائٹر نکال کر لے آیا۔ خضیر کو میز

Scanned with CamScanner

پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ''تھینک یو، ڈاکٹر،'' خضیر بولا۔

خضیر دو انگلیوں سے ٹائپ کرنے لگا۔ دو صفحے ٹائپ کرنے میں اسے بہت دیر لگی۔ پرمود ایک طرف بیٹھا کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کام پورا کر کے خضیر اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیکن تم نے تو لکھ کر دیا تھا نا کہ کمیونسٹ پارٹی کے کام میں حصہ نہیں لو گے؟''

''لکھ کر دینا پڑا تھا،'' خضیر نے کہا۔ ''لیکن میں نے کام چھوڑا نہیں۔''

''لیکن اس میں خطرہ نہیں ہے کیا؟ ان کو پتا چل گیا تو تمھارے لیے مشکل ہو جائے گی۔''

''کیا کیا جائے؟ یہ خطرہ لینے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ ٹائپ رائٹر واپس رکھ دوں؟''

''نہیں، میں رکھ دوں گا۔''

''تھینک یو ویری مچ ڈاکٹر'' کہہ کر خضیر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد پرمود کو بہت دیر تک بے چینی محسوس ہوتی رہی۔

ایک دن پرمود فرسٹ ایر کی کلاس کو پڑھا تھا کہ اسسٹنٹ ڈین دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ حال ہی میں اوپر سے ایک فرمان آیا تھا کہ لڑکوں کو لمبے بال رکھنے کی اجازت نہیں ہے، اور جن لڑکوں کے بال لمبے تھے ان کے بال کاٹنے کی مہم جاری تھی۔ اسسٹنٹ ڈین ہر روز کلاسوں میں جا کر معائنہ کرتا تھا۔

کلاس میں کوئی دس پندرہ طالب علم تھے۔ ایک لڑکے کے کانوں کے اوپر آئے ہوئے بالوں کو دیکھ کر اسسٹنٹ ڈین نے اس کا نام لکھ لیا اور دوسرے دن بال کٹوا کر آنے کی ہدایت کی۔ پھر پوری کلاس پر ایک غائر نظر ڈال کر پرمود کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کلاس سے باہر نکل گیا۔ بلیک کی نظم ''لندن'' کا جو بند اسسٹنٹ ڈین کے آنے سے پہلے پڑھایا جا رہا تھا اسے پرمود نے پھر سے پڑھا:

In every cry of every man,
In every infant's cry of fear;
In every voice, in every ban,
The mind-forg'd manacles I hear.

یہ سطریں پڑھ کر پرمود نے طالب علموں کی طرف دیکھا۔ وہ بے تاثر چہرے لیے خاموشی سے

Scanned with CamScanner

اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے پرمود چپ کھڑا رہ گیا۔ اس کا جی چاہا ان سب سے چیخ کر کہے: ارے بلیک یہ تم سے ہی کہہ رہا ہے! تم سمجھتے کیوں نہیں؟ تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟ لیکن پرمود نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ وہ اپنی معمول کی، ٹھہری ہوئی آواز میں نظم کے استعاروں، اس کی تکنیک اور تکرار کے زوردار استعمال پر تبصرہ کرتا رہا۔

کلاس سے لوٹتے وقت پرمود سوچنے لگا کہ اسسٹنٹ ڈین بالوں کے معائنے کا یہ سلسلہ کب تک چلائے گا؟ کٹے ہوئے بال پھر بڑھ آئیں گے اور اسے بار بار معائنہ کرنا پڑے گا۔ کبھی نہ کبھی تو یہ سلسلہ کمزور پڑ ہی جائے گا۔ آخر میں فتح بالوں کی ہی ہوگی۔

دلدلی علاقے میں پہلی بار جانے کے بعد جلد ہی اس نے وہاں کے ایک اور سفر کا بندوبست کر لیا، اور اگلے چند ہفتوں میں دو ایک بار اور۔ ہر بار اسے کار کے لیے فرانسوا کو تکلیف دینی پڑتی تھی، لیکن فرانسوا نے کبھی شکایت نہ کی۔ اس معاملے کو خفیہ رکھنا بھی ضروری تھا۔ پرمود کو معلوم تھا کہ اگر ابوفرید کو بھنک پڑ گئی تو سلوئی اور اس کے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ پھر بھی اس نے کچھ زیادہ فکر نہ کی۔ سلوئی سے اس کی قربت بڑھتی گئی۔ اس کے آگے کیا ہوگا، اس بارے میں سوچنے کو وہ ٹالتا گیا۔ اپنی موجودہ صورت حال اور ذہنی کیفیت میں اس کا رویہ غیرذمے داری کی حد کو چھونے والی بے احتیاطی کا ہو گیا تھا۔

پرمود کو اصل کشش دلدلی علاقے کے ماحول میں محسوس ہوتی تھی۔ شہر کی زندگی میں ایک طرح کا مبہم، ان دیکھا دباؤ اسے مسلسل محسوس ہوتا رہتا تھا؛ اسے لگتا تھا سب لوگوں کو ان دیکھی زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے۔ کوئی آواز اٹھنے کا بھی سوال نہیں تھا کیونکہ چیخنے چلانے کی آزادی ہی نہیں تھی۔ شہر کے اس ماحول سے دور، ہوا پر ڈولتے ہوئے نرسلوں کے پھیلے ہوئے جنگل میں جا کر، موٹربوٹ کی ست لے میں جھومنے سے پرمود کا ذہن اور بدن دونوں کو تسکین کا احساس ہوتا۔ شہر کی روزمرہ کی زندگی میں پرمود کو اس احساس کی ہُوک لگی رہتی تھی۔

دلدل کی طرف جانے والا راستہ پرمود کے لیے مانوس ہو گیا۔ چبیش کے کشتی والے سے اس کی دوستی ہو گئی۔ دوسری بار جب سلوئی اور وہ وہاں پہنچے تو اس کشتی والے نے انھیں آواز دے کر بلایا۔

Scanned with CamScanner

سلوئی نے اس سے کہا، ''نہیں بابا، تمھاری کشتی کا انجن ٹھیک نہیں ہے۔ پچھلی بار کی طرح پھر بند ہو گیا تو؟ ہم کوئی دوسری کشتی کر لیتے ہیں۔''

کشتی والے نے کہا، ''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا! میں نے انجن ٹھیک کر لیا ہے: اب بند نہیں ہوگا۔ آپ لوگوں کو میری ہی کشتی میں جانا ہوگا۔''

پھر ہر بار دونوں اسی کی کشتی میں جانے لگے۔

ایک دفعہ پرمود نے گاڑی چیش پر روکنے کے بجائے آگے بڑھالی۔ راستے میں ایک چھوٹا گاؤں آیا۔ وہاں اس کی نظر راستے پر جاتی ہوئی دو تین عورتوں پر پڑی۔ وہ یہاں کی عورتوں سے الگ دکھائی دے رہی تھیں؛ ان کے شوخ لال پیلے رنگوں والے لباس یہاں کے عام لباسوں سے مختلف تھے۔ پرمود ان کی طرف دیکھتا رہا؛ وہ عورتیں بھی رک کر گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''یہ گرد عورتیں ہیں،'' سلوئی نے کہا۔ یہ ان لوگوں میں سے تھیں جنھیں حکومت نے زبردستی لا کر یہاں جنوب میں بسا دیا تھا۔ ان کے چہرے پر چھائے ہوئے شک اور تکلیف کے تاثر اور ان کے کپڑوں کے شوخ رنگوں سے پرمود پر یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ یہاں کی رہنے والی نہیں ہیں۔ وہ یہاں اوپری سی لگ رہی تھیں۔

ایک اور دفعہ نرسلوں کے جنگل میں واقع ایک بستی میں پرمود اور سلوئی کو ایک بوڑھا سفید فام شخص دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک مقامی آدمی تھا۔ پرمود کو تجسس ہوا کہ یہ پردیسی بوڑھا یہاں کیا کر رہا ہے۔ موٹر بوٹ سے اتر کر پرمود نے اس سے بات کی۔ بوڑھا انگریز تھا، عمر کوئی اُناسی سال۔ دلدلی علاقے میں پائے جانے والے ایک خاص پرندے کے انڈوں کی تلاش میں انگلینڈ سے یہاں آیا تھا۔ اس نے اس پرندے کا لاطینی نام بتایا جو پرمود کو پوری طرح سمجھ میں نہ آیا۔ وہ یہ انڈے برٹش میوزیم کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے میوزیم کی طرف سے نہیں بھیجا گیا تھا؛ وہ اس مہم پر خود اپنے خرچ پر نکلا تھا۔ پچھلے چھ سات دن وہ ان نرسل کے جنگلوں میں انڈے ڈھونڈتا پھرتا رہا تھا۔

''تو پھر ملے انڈے؟'' پرمود نے پوچھا۔

''اب تک صرف دو انڈے ملے ہیں،'' بوڑھے نے کہا۔ ''لیکن وہ اتنے رنگین اور دلکش نہیں ہیں جیسی مجھے توقع تھی۔ مجھے کچھ مایوسی سی ہوئی ہے۔ ابھی دو چار دن یہاں گھوم پھر کر دیکھوں گا کہ اور انڈے ملتے ہیں یا نہیں۔''

پرمود اور سلوئی کو الوداع کہہ کر بوڑھا اپنے مددگار کے ساتھ ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر زسلوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ سلوئی پرمود سے بولی، "آفرین ہے اس پر! اناسی سال کا بوڑھا، اپنے پیسے خرچ کر کے اتنی دور آ کر دلدلی جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اور وہ بھی کس لیے؟ کسی پرندے کے دو چار انڈوں کی خاطر!"

"یہ انگریز بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں،" پرمود نے کہا۔

دلدلی علاقے کے سرے پر پانی اور زمین کے بیچ کوئی یقینی سرحد نہیں تھی۔ آج سوکھا دکھائی دینے والا حصہ کچھ دن بعد پانی میں ڈوب جاتا، اور پانی میں ڈوبا ہوا حصہ خشک ہو جاتا۔ پورا علاقہ سپاٹ ہونے کی وجہ سے پانی کی سطح ذرا سی اونچی ہونے پر زمین زیرِ آب آ جاتی۔ ایسے بدلاؤ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل ہوتے رہتے۔ شہر کے اردگرد کے علاقے میں بہت گھومنے پھرنے کے بعد پرمود کو احساس ہوا کہ یہ بدلاؤ صرف دلدلی علاقے ہی میں نہیں بلکہ ملک کے اس پورے جنوبی حصے میں ہوتے رہتے ہیں۔ ہر طرف سوکھی سپاٹ خیالی زمین دکھائی دیتی، اور بیچ بیچ میں کیچڑ کی سی دلدلی زمین کے قطعے آ جاتے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان علاقوں میں خشکی اور تری کی حتمی تقسیم خدا نے کبھی نہیں کی تھی؛ قدرت کے آغاز سے ایک طرح کا ابہام اس خطے کے نصیب میں آ گیا تھا۔ یہ ابہام ایک اور طریقے سے بھی خود کو ظاہر کرتا تھا۔ دریا کے متوازی راستے سے سمندر کی سمت میں جاتے ہوئے بہت سے دلدلی قطعے نظر آتے تھے۔ ان میں سے بعض دلدلی قطعوں کی سطح پر نمک کی سفید تہہ جمی دکھائی دیتی۔ کچھ جگہوں پر کھاری پانی تھا اور کچھ جگہوں پر میٹھا۔ لیکن میٹھا پانی کہاں ہے اور کھاری پانی کہاں، یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میٹھے اور کھاری پانی کا ایک عجیب آمیزہ سا بن گیا تھا۔ خشکی اور تری کو، میٹھے اور کھاری پانی کو جدا کرنے والی سرحدیں کہیں واضح نہیں تھیں۔ اس خطے پر، جہاں انسانی تہذیب کا جنم ہوا تھا، ایک قدیم انتشار، نراج اور غیر یقینی پن کا سایہ تھا۔ یہیں، انتشار اور غیر یقینی پن کی اسی سرزمین میں، انسان نے اپنی پہلی تہذیب تعمیر کی تھی۔ اس علاقے کے سروپ کے بارے میں سوچتے سوچتے پرمود کو وہ جاندار یاد آئے جنھیں اس نے دریا کے دہانے کے پاس کیچڑ میں لوٹتے دیکھا تھا — چھپکلیوں کی طرح رینگنے، مچھلی کی طرح تیرنے، مینڈکوں کی طرح اچھلنے، اور کیچڑ میں دھنس کر بیٹھنے والے جاندار — قدیم، مبہم جاندار جو اس ابہام بھری سرزمین کے بادشاہ کہلانے کے لائق تھے۔

Scanned with CamScanner

ایک بار دلدلی علاقے سے لوٹتے ہوئے پرمود نے قُرنا گاؤں میں سے ہو کر گاڑی دجلہ اور فرات کے سنگم کی سمت موڑ لی۔ وہ اور سلوئی گاڑی سے باہر نکل کر بند پر بیٹھ گئے اور پانی کی طرف دیکھتے رہے؛ ایک طرف سے آتا ہوا دجلہ کا پانی، دوسری طرف سے آتا ہوا فرات کا پانی، اور پھر ان دونوں کے ملنے سے بننے والا شط العرب کا دھارا جو دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا۔ کشتی میں بیٹھا ایک مچھیرا پانی میں جال ڈال رہا تھا۔ اُس پار خالی ویران زمین تھی۔ اِس طرف کے کنارے پر، جہاں دونوں بیٹھے تھے، پیچھے راستہ تھا جس کے دوسری طرف گارے کے کچے مکان بنے تھے۔

اصل میں یہی دریا بصرہ شہر کے پاس سے گزر کر آگے جاتا تھا، لیکن وہاں کے برعکس یہاں پانی بہت پر اچین معلوم ہوتا تھا۔ خیالوں میں گم، پانی کی طرف دیکھتے ہوئے، پرمود کو محسوس ہوا کہ اس علاقے کے بارے میں اس کے ذہن میں ایک طرح کی بے اطمینانی سی گھر کرتی جا رہی ہے۔ اس بے اطمینانی کا بالکل ٹھیک سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہ کہ یہاں پہاڑ اور گھاٹیاں نہیں ہیں؟ نہیں، یہ بات نہیں۔ وہ اس جستجو میں اپنے ذہن کو کریدتا رہا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دو چار چکر لگائے، مٹی کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ٹھوکر ماری۔ پھر اچانک اس کے دھیان میں آیا: یہاں ایک چیز غائب ہے — پتھر! اس پورے ملک میں، دوا میں ڈالنے تک کے لیے پتھر نہیں تھے۔ چاروں طرف صرف یا تو سوکھی زمین تھی یا گیلی زمین، دھول یا کیچڑ۔ ''پتھروں کے دیس'' میں جنم لینے والا شخص بے پتھر کے دیس میں آ پہنچا تھا۔* وہ سلوئی کی طرف مڑ کر کہنے لگا، ''دیکھو سلوئی، تمھارے اس دیس میں پتھر ہی نہیں ہیں! صرف مٹی، مٹی اور مٹی!''

''پتھر؟ پتھروں میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' سلوئی بولی۔

''واہ! یہ کیا کہتی ہو۔ پتھر ہی تو ایک حسین چیز ہے۔ پتھر کو دیکھ کر سکون محسوس ہوتا ہے: پتھر ڈھارس بندھاتا ہے۔ پتھر ٹھوس اور مضبوط ہوتا ہے — بالکل پتھر کی طرح! یہ نہ ہو تو بس بھربھری مٹی رہ جاتی ہے، جس کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔''

''پتھر بھی رفتہ رفتہ مٹی ہو جاتا ہے۔ آخر میں مٹی ہی بچتی ہے!''

''ہوگی، ہوگی... یہ سچ ہے کہ آخر میں مٹی ہی بچتی ہے۔ لیکن پھر بھی ذہن کو پتھر کی طلب ہوتی

---

* بیسویں صدی کے اوائل کی ایک مراٹھی نظم کی طرف اشارہ ہے، جس میں مہاراشٹر کو ''پتھروں کا دیس'' کہا گیا ہے۔

ہے، ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت اگر یہاں ایک آدھ اچھا ٹھوس پتھر ہوتا تو میں اسے پیار سے ایک ٹھوکر لگاتا — چاہے میرے پیر میں چوٹ ہی کیوں نہ لگتی۔"

پرمود نے ٹھوکر مار کر مٹی کے ایک ٹیلے کو بکھیر دیا: وہ ریزہ ریزہ ہو کر ہر طرف پھیل گیا۔

اچانک پرمود کے ذہن میں آیا: یہاں پتھر نہیں ہیں، کیا اسی لیے تو انسانوں نے یہاں پتھر جیسا سخت نظام قائم نہیں کیا ہوگا؟ اس بھربھری سرزمین میں جسے پانی کبھی بھی کیچڑ میں بدل ڈالتا ہے، انسان کو پتھر جیسی سخت کوئی چیز بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ اسے مکھرجی کی کہی ہوئی بات یاد آئی: قدیم میسری باشندوں نے بھی ایسی ہی سخت گیر حکومت قائم کی تھی جیسی آج یہاں قائم ہے۔ اس سرزمین میں جہاں انسانی تہذیب کا جنم ہوا، ایسا ہونا ایک طرح سے ناگزیر تھا۔ انسان اس دشوار علاقے میں کیسے جیتے ہوں گے؟ خشکی اور تری کا الجھاؤ، میٹھے اور کھاری پانی کا الجھاؤ — اس غیر یقینی، ناقابلِ اعتبار حالت سے وہ چکرا گئے ہوں گے، سکتے میں آ گئے ہوں گے۔ اس ابہام، اس قدیم انتشار پر قابو پانے کی کوشش میں انسان نے یہاں پتھر جیسا سخت، سفاک اور جامد نظام قائم کیا ہوگا۔ انتہائی درجے کے انتشار کا سامنا کرتے ہوئے انسان نے انتہائی درجے کا منضبط نظام تشکیل دیا۔

یہ ایک انوکھا خیال تھا۔ اگر یہاں کے حالات اس لحاظ سے ناگزیر ٹھہرے، تو پھر آزادی کے بارے میں اسے جو کرید لگی ہوئی تھی، اس کا کیا مطلب ہوا؟

ایک دن ابوفرید نے پرمود سے پوچھا، "بیچ سال کی چھٹیوں میں کیا آپ ہندوستان جائیں گے؟"

"کچھ ٹھیک نہیں،" پرمود بولا۔

"یہیں رہیں گے؟"

"نہیں، کہیں نہ کہیں تو یقیناً جاؤں گا۔"

"ملک ہی میں کسی جگہ یا ملک سے باہر؟"

"باہر۔ کچھ دن یہاں سے باہر گزارنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا، بہت خوب!" ابوفرید نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جانے سے پہلے ملاقات تو ہوگی ہی!"

"ہاں، کیوں نہیں۔ کچھ منگوانا ہے؟"

''نہیں، یہ بات نہیں۔۔۔ آپ کے جانے سے پہلے بات کریں گے۔''

پرمود ابو فرید کے غیر ضروری دوستانہ برتاؤ کے بارے میں پھر سے سوچنے لگا۔ ابو فرید اس سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے ذہن میں اس پرانے شک نے پھر سر اٹھایا۔ کیا وہ اس کے ذریعے اپنا کچھ پیسہ باہر بھجوانا چاہتا ہے؟ ایسی ہی بات ہوگی۔

بمبئی سے والد کا خط آیا: اب تک تم نے وہاں نوکری میں قدم اچھی طرح جما لیے ہوں گے؛ ہمیں خوشی ہے کہ امریکہ کے مقابلے میں اب تم یہاں سے قریب ہو؛ ہم دونوں کا خیال ہے کہ اب تمھیں یہاں آ کر شادی کر لینی چاہیے؛ دِنکر سے تمھارے لیے لڑکی ڈھونڈنے کو کہا ہے؛ ہماری ایسی کوئی شرط نہیں کہ تم اپنی ذات ہی میں شادی کرو؛ اپنے آنے کی تاریخ سے جلد مطلع کرنا۔

•

وہ دونوں ہمیشہ کی طرح موٹر بوٹ کی چھت پر بیٹھے تھے کہ سلوئی نے کہا، ''اب فائنل امتحان قریب آ رہے ہیں۔ جلد ہی ہمیں یہاں آنا بند کرنا ہوگا۔''

''ہاں، کالج میں میرا کام بھی بڑھ گیا ہے۔ اس طرح پورا خالی دن مشکل سے ملتا ہے۔''

''ٹرم کے بعد چھٹیوں میں آپ ہندوستان جائیں گے؟''

''کہہ نہیں سکتا۔ ابھی کچھ طے نہیں کیا۔ اور تم؟''

''میں یہیں رہوں گی۔ شاید کچھ دن کے لیے بغداد جاؤں، اپنے چچا کے گھر۔''

''چھٹیوں میں ہمارا ملنا نہیں ہوگا۔''

''اگر آپ یہیں رہیں تو ہمارے گھر آ سکتے ہیں۔''

''نہیں، چھٹیوں میں میں یہاں تو یقیناً نہیں رہوں گا۔ ہندوستان نہیں گیا تو کہیں اور جاؤں گا۔ چھٹیوں کے دن مجھے اس ملک سے باہر گزارنے ہیں؛ کہیں کھلے ماحول میں۔''

''غالباً اب ہم چھٹیوں کے بعد ہی یہاں آ سکیں گے۔ کون جانے چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے آنا ہو کہ نہ ہو۔''

''دیکھتے ہیں۔''

''لیکن اس طرح ہم کب تک یہاں آ جا سکتے ہیں؟'' سلوئی پرمود کے چہرے کی طرف دیکھتے

Scanned with CamScanner

ہوے بولی۔

''مجھے معلوم نہیں،'' پرمود نے سلوئی کی طرف نہ دیکھتے ہوے کہا۔

''آپ سے ایک بات میں نے اب تک نہیں پوچھی۔ کیا آپ اگلے سال یہاں ہوں گے؟''

پرمود نے کچھ رک کر کہا، ''مجھے معلوم نہیں۔ میں نے اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔''

سلوئی نے اپنے بازو گھٹنوں کے گرد باندھ کر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ لی۔ پھر سر اٹھا کر بولی، ''یعنی آپ ایسے ہی چلے جائیں گے کیا؟''

پرمود خاموشی سے اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ آسمان میں بہت اوپر ایک پرندہ آہستہ آہستہ چکر کاٹ رہا تھا۔

سلوئی نے اپنا ماتھا گھٹنوں کے گرد لپٹے ہوے ہاتھوں پر رکھ لیا۔ اس کے لمبے بال اس کے بازوؤں پر بکھر گئے۔ بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ''معلوم ہے، پرمود؟'' وہ داہنے ہاتھ کو لہرا کر بولی، ''ہماری یہ نرسلوں کی دنیا ختم ہونے والی ہے۔''

پرمود نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ دلدلیں فرات کا پانی پھیلنے سے وجود میں آئی ہیں نا؟ اب حکومت نے فرات پر بند باندھنے کا منصوبہ بنایا ہے۔''

''یہاں کی کھلی ہوا کی حکومت کو برداشت نہیں! وہ یہاں بھی اپنی رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہتی ہوگی۔''

''جب یہ دلدلی علاقہ ختم ہو جائے گا تو ہم کہاں جایا کریں گے؟''

''ایسا ہونے میں بہت وقت لگے گا۔ تب تک ہمیں یہاں آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔''

''کیوں؟ تب ہم کہاں ہوں گے؟''

''کون جانے!'' پرمود نے کہا۔ اس نے یونہی آسمان کی طرف دیکھا۔ جو پرندہ کچھ دیر پہلے آسمان پر چکر کاٹ رہا تھا، اسے ڈھونڈنے لگا۔ پرندہ کہیں نظر نہ آیا۔ جس وقت اس کا دھیان کہیں اور تھا، تب وہ نیچے اتر آیا ہوگا یا اڑ کر دور چلا گیا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

آج ہوا رکی ہوئی تھی۔ کشتی کے آگے بڑھنے کی وجہ سے ہلکا سا جھونکا آتا تھا، بس۔ نرسلوں کے جنگل ساکت کھڑے تھے۔ بہاؤ کا پانی بھی بوجھل سا لگ رہا تھا۔ جاڑے کے دن تھے پھر بھی دھوپ میں بیٹھنے سے گرمی محسوس ہوتی تھی۔ پھر اچانک ایک زوردار جھونکا آیا اور جھٹ سے کندھے پر آ بیٹھا۔ سلوئی کے بال اڑنے لگے۔ برابر میں رکھا ہوا پرمود کا تنکوں کا ہیٹ اڑ کر قلابازیاں کھانے لگا۔ یہ خیال آتے ہی کہ ہیٹ کشتی کی چھت کے کنارے سے نیچے گر جائے گا، پرمود جلدی سے اٹھا۔ تیزی سے غوطہ مار کر پیٹ کے بل لیٹا اور ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر سلوئی ہنسنے لگی۔

ایک تیز جھونکا چلنے کے بعد ہوا پھر رک گئی۔ نرسل پھر سے ساکت ہو گئے۔ جیسے کوئی پاگل جھونکا راستہ بھٹک کر اِدھر آ نکلا تھا۔ بہت دیر بعد دور دلدلوں میں سے ٹھا ٹھا کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ کچھ وقفے سے ایسی آوازیں اور آئیں۔ یقیناً یہ گولیاں چلنے کی آوازیں تھیں۔ سلوئی اور پرمود اُس طرف نگاہیں جمائے سنتے رہے۔ ''کسی کی شادی ہے،'' سلوئی بولی۔ ''دلدلی علاقے کے باشندوں میں یہ رواج ہے — شادی کے موقعے پر گولیاں چلانا، ناچنا گانا۔''

اس سپاٹ کھلے علاقے میں گولیاں چلنے کی آوازیں صاف اور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ یہ آوازیں کافی دیر تک وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہیں۔ پھر رک گئیں۔

''اُدھر دیکھیے،'' سلوئی شمال کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے بولی۔ اس سمت میں افق کے پاس چند سیاہی مائل دھبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ پرمود دیکھتا رہا۔ ''واپس چلیں؟'' سلوئی نے پوچھا۔

''میرا خیال تھا آج ہم ایشان گاؤں تک ہو کر آئیں گے۔ کچھ دیر دیکھتے ہیں کیا صورت بنتی ہے۔''

دس پندرہ منٹ میں کالے دھبے پھیلنے لگے اور اوپر کی طرف بڑھ آئے۔ کشتی ایشان گاؤں کے پاس پہنچ گئی تھی۔ نرسلوں میں سے جھونپڑیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ سلوئی نے پرمود کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے واپس جانا ہی بہتر ہے،'' وہ بولی۔

پرمود نے اثبات میں سر ہلایا۔ چھت سے نیچے جھانک کر اس نے کشتی والے سے کشتی واپس موڑنے کو کہا۔ مڑتے وقت کشتی ایک طرف کو جھکی اور پھر جس راستے سے آئی تھی اسی پر بھک بھک

Scanned with CamScanner

کرتی لوٹنے لگی۔ سلوی اور پرمود بیٹھے بیٹھے مڑ کر شمال کے افق کی طرف دیکھتے رہے۔

دیکھتے دیکھتے بادل گھر آئے اور اس کے ساتھ ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی۔ کشتی نرسلوں کے درمیان کی جھیل میں سے گزر رہی تھی۔ اچانک جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لہریں اٹھنے لگیں۔ جب تک کشتی نے جھیل پار کی، ہوا بہت زور سے چلنے لگی تھی۔ جھیل کے پانی میں بھنور پڑتے دکھائی دینے لگے تھے۔ ''اچھا ہوا تیز ہوا شروع ہونے سے پہلے ہی ہم نے جھیل پار کر لی،'' پرمود نے کہا۔ کشتی والا کشتی کے پیچھے کے کنارے پر آ کر کچھ دیر اوپر دیکھتا رہا، پھر منھ ہی منھ میں اپنے آپ سے کچھ بولا۔ نرسلوں کی دیواروں میں سے گزرنے والے محفوظ بہاؤ میں کچھ زیادہ لہریں نہیں اٹھ رہی تھیں، لیکن دونوں طرف کے نرسل ہوا کے زور سے جھک کر اونچی آواز میں سرسرا رہے تھے۔ چاروں اور دور تک نرسلوں کے جھنڈ تیز ہوا میں جھکولے کھا رہے تھے۔ سارا برہمانڈ جیسے اتھل پتھل ہو گیا تھا؛ کسی مضبوطی، کسی یقینی پن کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ کشتی بھی بڑھتی ہوئی ہوا میں زیادہ ہچکولے کھانے لگی تھی۔ اچانک پرمود کو غیر محفوظ ہونے کا شدید احساس ہوا۔ ''ہنھ، یہ کیا مصیبت ہے!'' وہ چڑ کر بولا۔ ''کچھ ہی منٹوں میں پورا منظر بدل گیا! صبح سے خطرے کی کوئی علامت نہیں تھی۔''

''یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے،'' سلوی نے کہا۔ ''پندرہ بیس منٹ میں کشتی چیش پہنچ جائے گی۔'' لیکن سلوی کا چہرہ فکر مند تھا۔

دونوں چھت سے اتر کر نیچے آ بیٹھے۔ جس وقت چیش کی گودی نظر کے دائرے میں آ رہی تھی، جیسے مکئی کے دانے سے پھٹنے لگے۔ منٹ بھر بڑی بڑی بوندیں پڑتی رہیں اور پھر جھالا پڑنے لگا۔ ارد گرد کا منظر دھندلا گیا۔ چھت کے کنارے سے اندر آنے والی پھوار سے کپڑے نم ہو گئے۔ پرمود ایک دم سلوی کی طرف مڑ کر کہنے لگا، ''اب آ گے؟ ہمیں گاڑی میں اس کچے راستے پر جانا ہے۔ بارش میں اس کا کیا حال ہوگا؟''

''زیادہ بارش ہونے سے پہلے اگر ہم اس راستے کو پار کر لیں تو ٹھیک رہے گا،'' سلوی نے کہا۔

''اور اگر بارش بہت تیز ہو گئی تو؟'' پرمود بولا۔

سلوی کچھ نہ بولی، خاموشی سے بارش کے پردے میں سے دکھائی دیتی چیش کی گودی کی طرف دیکھتی رہی۔ پرمود نے سلوی کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اس کے بائیں بازو کو تھام لیا۔ وہ پہلی بار

Scanned with CamScanner

اس کے بدن کو اس طرح چھور ہا تھا؛ وہ کبھی اس سے غیر ضروری طور پر یا جان بوجھ کر قریب نہ ہوا تھا۔
کشتی کنارے پر لگتے ہی دونوں جلدی سے نیچے اتر آئے۔ تیزی سے کشتی والے کو پیسے تھما کر پرمود گاڑی کی طرف لپکا۔ سلوی کے لیے داہنے ہاتھ کا دروازہ کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی اچھل کر روانہ ہوئی اور گودی کے پاس کا چھوٹا سا راستہ پار کر کے داہنے ہاتھ مڑی۔ منٹ بھر میں گاؤں پار کر کے پھر داہنی طرف موڑ کاٹ کر کچے راستے پر پہنچ گئی۔ اب بارش کی تیز بوچھاڑ رک چکی تھی اور صرف باریک بوندیں پڑ رہی تھیں۔ لیکن آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ افق کی سمت رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔

''بارش اگر کچھ دیر کے لیے مہربانی کر دے تو کیا ہی اچھا ہو! ہم یہ راستہ پار کر کے ہائی وے پر پہنچ جائیں۔''

بارش کی بوچھاڑ نے راستے کو گیلا کر دیا تھا لیکن کیچڑ نہیں پھیلی تھی۔ گاڑی ٹھیک چل رہی تھی۔ اس اونچے نیچے راستے پر جتنی تیز چل سکتی تھی پرمود چلاتا رہا۔ دونوں طرف نرسلوں کے جھنڈ تیز ہوا سے جھولے کھا رہے تھے۔ تھوڑی اونچائی پر بنایا گیا یہ راستہ اس غیر محفوظ علاقے سے باہر نکلنے کا واحد راستہ تھا۔

اونٹ کے کوہان جیسا ایک پل پار کر کے پرمود بولا، ''واہ، چلو ایک پل تو پار کر لیا۔ بس اگلا پل اور پار ہو جائے! پل پر کیچڑ ہوئی تو گاڑی کے نہ پھسلنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میں ان پلوں سے بہت ڈرتا ہوں۔''

بارش اب تک ہلکی تھی۔ ہوا بہت تیز ہونے کی وجہ سے بادل گویا بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر میں پرمود دوسرے تنگ پل کو بھی پار کر گیا۔ ایک لمبا سانس باہر نکال کر بولا، ''چلو، پل تو پار ہو گئے! اب ہائی وے زیادہ دور نہیں۔''

لیکن دوسرا پل پار کرنے کے کچھ ہی منٹ بعد تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش اتنی موسلا دھار ہو رہی تھی کہ وائپروں کے چلتے ہوئے بھی سامنے دیکھنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ ''اس کی ماں کی...'' پرمود نے مراٹھی میں کہا۔

''کیا کہا؟'' سلوی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں،'' پرمود بولا۔

Scanned with CamScanner

"تھوڑا ٹھہر نہ جائیں یہاں؟ بارش بہت زور کی ہو رہی ہے۔"

"لیکن ٹھہر گئے تو دیر ہو جائے گی۔ بلاوجہ دیر کرنا ہمارے لیے ٹھیک نہیں۔ اتنی بارش سے راستہ تھوڑی دیر میں بہت پھسلواں ہو جائے گا۔"

"اچھا گاڑی تو ذرا دھیرے چلائیے۔ گڈھے دکھائی نہیں دے رہے۔"

منٹ بھر بعد پرمود بولا، "چلو تھوڑا رک جاتے ہیں! اتنی تیز بارش میں آگے جانا بھی مشکل ہے۔"

"راستے پر گاڑی روک کر اس نے کہا، "کہیں کوئی آڑ نہیں ہے۔ یہیں کھلے میں گاڑی روکنی ہوگی۔"

گاڑی رکنے پر بارش کی گرتی اور تیز ہوا میں جھولتی ہوئی چادریں اور زیادہ زبردست لگنے لگیں۔ جب تک گاڑی چل رہی تھی تب تک کم از کم یہ ڈھارس بندھانے والا خیال تھا کہ ہم کچھ کر رہے ہیں، آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب رکی ہوئی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تیز بارش اور ہوا کے زور کے سامنے ہاری مانی جانے لگی۔ کچھ دیر دونوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر پرمود سلوئی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، "کتنا عجیب لگتا ہے، دونوں یہاں گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں! چاروں طرف بارش اور طوفان کا راج ہے اور ہم یہاں اس سنسان جگہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" پھر کچھ لمحوں کے بعد بولا، "تم اتنی خاموش کیوں ہو سلوئی؟ ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہنھ!" سلوئی اس کی طرف دیکھ کر ہنس کر بولی اور پھر چپ ہو گئی۔ پرمود نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکے سے دبایا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

"دیکھو، جب سے ہم وہاں سے نکلے ہیں ہمارے سامنے سے کوئی گاڑی اُدھر جاتی دکھائی نہیں دی،" پرمود بولا، "ہمارے پیچھے بھی غالباً کوئی گاڑی نہیں آ رہی۔ مجھے لگتا ہے اس طوفان زدہ اُجاڑ علاقے میں صرف ہم ہی اس راستے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہاں ضرورت کے وقت مدد ملنا بھی کٹھن ہے۔"

"لیکن ہم اور کیا کر سکتے تھے؟ وہاں رک جاتے؟"

"یہ بات بھی ہے۔ لوٹنے کی کوشش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

کچھ دیر دونوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر پرمود بولا، "ہمارے گھر پہنچنے تک اگر بہت دیر ہو گئی... رات ہو گئی تو؟ یہاں راستے میں پتا نہیں کب تک پھنسے رہنا پڑے۔" اس نے سلوئی کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

وہ کچھ نہ بولی۔ ’’تمھیں ڈر نہیں لگتا کہ تمھارے بابا کیا کہیں گے؟‘‘ پرمود نے پوچھا۔

’’میں اس بارے میں سوچ ہی نہیں رہی ہوں، پرمود،‘‘ سلوئی نے کہا۔ ’’جو ہونا ہے ہو جائے۔‘‘

پرمود خاموشی سے سلوئی کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ پھر سلوئی بولی، ’’جب تمھارے ساتھ یہاں آنے کو تیار ہوئی تھی تب ہی میں نے ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ بابا کیا کہیں گے، کیا کریں گے، آگے کیا ہوگا۔‘‘

پرمود نے سلوئی کا ہاتھ کھول کر اس کی ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی رکھ دی اور انگلیاں مضبوطی سے اس کی انگلیوں میں پھنسا لیں۔ سلوئی پھر بولی، ’’ایسی بے پروائی میں نے زندگی میں کبھی نہیں دکھائی، پرمود! کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا کروں گی...‘‘

دونوں بارش کی آواز سنتے، خاموش بیٹھے رہے۔

’’حبس محسوس ہو رہا ہے یہاں۔۔‘‘ پرمود نے کہا۔ ’’سب کھڑکیاں بند ہیں۔ باہر کچھ نظر بھی نہیں آ رہا۔‘‘ اس نے اپنی انگلی کانچ پر جمی ہوئی دھند پر پھرائی۔ کانچ کے اُتنے حصے سے بارش کی دھاریں گرتی دکھائی دینے لگیں۔ پھر کانچ کے نچلے حصے پر انگلی پھرا کر اس نے حروف بنائے: SALWA۔ سلوئی ان حروف کو پڑھ کر تھوڑا سا ہنسی۔ اس نے پرمود کا ہاتھ دبایا۔ دھند پھر جمنے لگی اور حروف مدھم پڑتے پڑتے غائب ہو گئے۔

کچھ دیر بعد بارش دھیمی پڑتی دکھائی دی۔ ’’چلو، اب گاڑی اسٹارٹ کرتے ہیں،‘‘ پرمود بولا۔ ’’اب اور وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔‘‘ گاڑی کچھ آگے بڑھی تو اسے معلوم ہوا کہ اب راستے پر پھسلن آ گئی ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے باوجود گاڑی کبھی اِس طرف کبھی اُس طرف پھسلتی رہی۔ اونچائی پر بنے تنگ راستے کے دونوں طرف ڈھلانیں اور نیچے پانی اور نرسلوں کے جھنڈ۔ گاڑی کبھی بھی پھسل کر نیچے جا سکتی تھی۔ ہر بار جب گاڑی قابو سے باہر ہو کر ایک طرف جھکنے لگتی تو سلوئی اپنی بند مٹھی پیٹ کے پاس لے جا کر زور سے دباتی اور بے اختیار کہتی، ’’اللہ!‘‘

’’گھبراؤ مت، سلوئی، گھبراؤ مت!‘‘ پرمود آہستہ سے کہتا۔

کچھ دیر میں پرمود کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔

پھر ایک بار گاڑی داہنی طرف پھسلی اور آگے کا داہنا پہیہ راستے کے ایک گہرے گڈھے میں جا گھسا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا؛ کیونکہ اگر یہاں گڈھا نہ ہوتا تو گاڑی شاید راستے سے باہر ہو کر نیچے پھسل جاتی۔ گڈھے سے گاڑی باہر نکالنے کی پرمود نے بہت کوشش کی لیکن پہیہ گڈھے ہی میں گھر گھراتا اور پھسلتا رہا۔ پرمود کی قمیص پسینے میں تر ہوگئی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ بارش میں کھڑا ہو کر گڈھے میں پھنسے ہوئے پہیے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گاڑی کو دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا کچھ خاص فائدہ نہ ہوا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس اکیلے سے گڈھے میں سے گاڑی نکالنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسے گاڑی دھکیلتے دیکھ کر سلوئی بھی باہر نکلی۔ وہ بھی دھکا لگانے میں مدد کرنے لگی۔ پہیہ تھوڑا سا اوپر اٹھا مگر پھسل کر پھر نیچے جا رہا۔ دونوں کچھ دیر کھڑے ہانپتے رہے۔ ''پھر ایک بار کوشش کرتے ہیں،'' پرمود نے کہا۔ پہیہ دوبارہ تھوڑا سا اوپر آیا۔ اتنے میں سلوئی کا پیر کیچڑ میں رپٹا اور وہ داہنی کروٹ سے نیچے گر پڑی۔ پرمود نے فوراً گاڑی سے ہاتھ ہٹا کر اسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔ ''چوٹ لگی ہے کیا، سلوئی؟'' اس نے پوچھا۔ اسے چوٹ نہیں لگی تھی، لیکن کپڑے کیچڑ میں بھر گئے تھے۔ ''چلو، اندر جا کر بیٹھو،'' پرمود بولا۔ اسے اندر بٹھا کر پرمود نے کاغذی رومال سے اس کے کپڑے صاف کرنے کی کوشش کی۔ پھر بھی، بہت سے داغ رہ گئے۔

''ہم پہیہ باہر نہیں نکال سکیں گے،'' پرمود نے کہا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ بند کیا، سلوئی کی طرف دیکھا اور پھر خود پر نظر ڈالی۔ گاڑی گڈھے میں پھنسی ہوئی تھی، دونوں بارش میں بھیگ گئے تھے، سلوئی کے کپڑے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے: ایسی بھیگی ہوئی حالت میں ان کے پاس گاڑی میں بیٹھے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ٹھنڈ بھی لگ رہی تھی۔

''اس راستے پر کوئی گاڑی بھی نہیں آ رہی،'' پرمود نے کہا۔ ''گاڑی باہر نکالنے میں مدد مل جاتی۔''

''لگتا نہیں کہ ایسے حالات میں کوئی اس طرف آئے،'' سلوئی بولی۔

''گاڑی بھی مانگے کی ہے،'' پرمود نے خود سے کہا۔ ''کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوئی تو میرا ہی قصور ہو گا۔ فرانسوا اچھا آدمی ہے؛ کوئی طوفان نہیں اٹھائے گا۔ لیکن مجھ پر بات تو آ ہی جائے گی۔'' پھر سلوئی سے کہنے لگا، ''ایسا کرتے ہیں ــ میں پیدل ہائی وے تک جاتا ہوں۔ وہاں ٹیکسی اسٹینڈ پر مدد مل جائے

Scanned with CamScanner

گی۔ دیکھتے ہیں شاید کوئی ٹیکسی والا ادھر آنے کو تیار ہو جائے۔ کیوں؟" اس نے سلوئی کی طرف دیکھا۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو پرمود نے کہا، "ظاہر ہے، تمھیں یہاں کیلئے چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ لیکن گھنٹے بھر میں لوٹ آؤں گا۔ کم سے کم یہاں سے نکل تو سکیں۔"

"تھوڑی دیر راہ دیکھ لیتے ہیں — شاید راستے پر کوئی دیہاتی جاتا نظر آ جائے،" سلوئی نے کہا۔

پانچ چھ منٹ بعد پرمود دوبارہ بولا، "دیکھو سلوئی، یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کتنی دیر انتظار کریں۔ جلد ہی شام ہونے والی ہے۔ اس سے پہلے ہی مدد حاصل کرنی ہوگی۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔ تم اکیلے رہ لوگی نا؟"

سلوئی نے ہاں میں سر ہلایا۔ "گاڑی میں بیٹھی رہنا، باہر مت نکلنا،" یہ کہہ کر پرمود چل پڑا۔

تیز چلنے پر بھی ہائی وے تک پہنچنے میں آدھا پون گھنٹہ لگ جاتا۔ لیکن فوراً ہی اسے معلوم ہو گیا کہ تیز چلنا ناممکن ہے۔ کیچڑ میں پیر پھسلنے کے ڈر سے احتیاط سے چلنا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ کیچڑ میں پیر مسلسل سنے جا رہے تھے۔ گوند جیسی کیچڑ کی موٹی موٹی تہیں پرمود کے جوتوں پر جم گئیں۔ جوتوں کے بھر جانے کے بعد پتلون کے پائینچوں پر بھی کیچڑ جمنے لگی۔ بوٹ صاف کرنے کا بھی کوئی مطلب نہیں تھا، وہ پھر سے کیچڑ میں بھر جاتے۔ بارش میں بدن تو بھیگ ہی رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے بھی لگ رہے تھے۔ چشمے پر پانی کی متواتر بہتی دھاروں سے دیکھنے میں دقت ہونے لگی تو پرمود نے چشمہ اتار کر جیب میں رکھ لیا۔ چشمے کے بغیر اسے ٹھیک دکھائی دیتا تھا، لیکن چشمہ پہننے والا چشمے کے بغیر خود کو جیسے نہتا سا محسوس کرتا ہے، ویسا ہی اسے لگ رہا تھا۔ بارش اور تیز ہوا کی مار کھائے ہوئے اس دور دور تک پھیلے علاقے میں آدمی خود کو یوں ہی کتنا چھوٹا محسوس کرتا ہے؛ چشمہ اتار کر تو اسے اپنی بے بسی اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی۔

ہائی وے تک پہنچنے میں گھنٹہ بھر لگ گیا۔ وہاں کوئی ٹیکسی والا ایسے حالات میں نرسلوں والے دلدلی علاقے کے کچے راستے پر جانے کو راضی نہیں ہو رہا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے دگنے تگنے پیسوں پر ایک ٹیکسی والا تیار ہوا۔ مدد کے لیے ایک اور آدمی ساتھ لے کر پرمود ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ راستہ ایسا ہو رہا تھا کہ اسے ٹیکسی کے بھی پھسل کر نیچے جا پڑنے کا دھڑکا لگا رہا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ٹیکسی پھنسی

ہوئی گاڑی تک پہنچ گئی۔

گڈھے میں پھنسا ہوا پہیہ باہر نکلا تو پرمود نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ٹیکسی آگے اور گاڑی پیچھے، اس طرح وہ روانہ ہوئے۔ راستے میں ٹیکسی کا پہیہ بھی ایک چھوٹے گڈھے میں پھنس کر گھومنے لگا۔ اتر کر اس کو باہر نکالنا پڑا۔ ہائی وے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا تھا۔ بے حد تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی شہر تک کا فاصلہ باقی تھا۔

سلوئی برابر میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وہ بھی تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اب تک جو کچھ گزری سو گزری، گھر جا کر ابھی اور کچھ پیش آنا ہے، یہ ظاہر تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس کے بارے میں بات کرنے کی اسے خواہش نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں فکر سے بوجھل دکھائی دے رہی تھیں۔

جب پرمود نے سلوئی کو اتارا تب آٹھ بجنے کو تھے۔ ''امید ہے تمھیں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی،'' پرمود سلوئی کا ہاتھ دبا کر بولا۔

''فکر مت کیجیے،'' اس نے کہا اور فوراً چلی گئی۔ پرمود نے گاڑی فرانسوا کے گھر کی طرف موڑ لی۔

''میں سمجھا تھا کہ اب تم کل صبح آؤ گے،'' فرانسوا ہنس کر بولا۔

''سوری... اتنی دیر ہو گئی...''

''ارے ٹھیک ہے! گاڑی تو ثابت و سالم ہے نا؟''

''بالکل ثابت و سالم ہے۔ صرف دھونے کی ضرورت ہوگی۔''

''اس کی کوئی بات نہیں۔''

''اچھا، اب چلتا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔''

''ایک ڈرنک تو لے لو،'' پرمود کے کپڑوں اور اس کے حلیے کو دیکھتے ہوئے فرانسوا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تمھیں اس کی ضرورت ہے۔''

فرانسوا کی دی ہوئی برانڈی کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہی پرمود باہر نکل آیا۔ اس نے ٹیکسی پکڑ لی۔

گھر آیا تو بدن کی پوری تھکن اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ وہ نہانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے بدن میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔ تولیے سے بدن پونچھ کر خشک کپڑے پہنے تو اس کی جان میں جان آئی۔ ڈبل

Scanned with CamScanner

روٹی اور پنیر کھا کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں اسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن جاگنے پر پرمود کو اپنا بدن دُکھتا ہوا محسوس ہوا۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر یونہی لیٹا رہا۔ پھر اٹھ کر پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کالج جانا تھا۔ اٹھ بیٹھنے پر اسے معلوم ہوا کہ بدن جل رہا ہے۔ گردن کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ گھر میں تھرمامیٹر نہیں تھا اس لیے بخار دیکھنا ممکن نہیں تھا؛ لیکن بخار ہے ضرور، اس کا اسے یقین تھا۔ منھ دھو کر تر و تازہ ہونے اور کچھ چلنے پھرنے سے کچھ بہتر محسوس ہو گا، یہ سوچ کر وہ پلنگ سے اٹھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اسے احساس ہو گیا کہ آج کالج جانا ممکن نہیں ہو گا۔ چائے بنا کر پی، پھر نیچے دکان سے کالج کو فون کیا۔ پیراسیٹامول کی دو گولیاں کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ کل تک ٹھیک ہو جاؤں گا، تب سلوئی کا احوال جاننے کی کوشش کروں گا، اس نے طے کیا۔ وہ دن بھر بستر میں پڑا رہا، بس بیچ بیچ میں دوا کھانے کو اٹھتا تھا۔ بھوک نہیں تھی، اس لیے کچھ خاص کھایا نہیں۔ شام کو بہت سا وقت اس نے ریڈیو سنتے ہوئے گزارا۔ سننے سے تھکن محسوس ہونے لگی تو ریڈیو بند کر کے سو گیا۔

اس کا اندازہ تھا کہ اگلے دن تک اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، لیکن اس کی حالت اور بگڑ گئی۔ تیز بخار چڑھنے سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سوچے بغیر پڑا رہا، جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہو۔ پھر ایک دم اسے خیال آیا، کہیں مجھے نمونیا جیسا تو کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ کیا مجھے بھی شرما کی طرح بہت دن ہسپتال میں پڑا رہنا ہو گا۔ وہ ڈر گیا۔ ڈاکٹر کو بلانا ضروری محسوس ہوا۔

اس نے اٹھ کر پتلون پہنی اور مکھرجی کے فلیٹ پر گیا۔ مکھرجی کالج جانے کی تیاری میں تھا۔ ”اگر تم پندرہ بیس منٹ بعد آتے تو میں نکل گیا تھا،“ وہ بولا۔ اس نے پرمود سے کہا کہ وہ اپنی پہچان کے ایک ڈاکٹر کو اس کے پاس بھیج دے گا۔ پرمود واپس آ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ دوپہر کو ڈاکٹر آیا اور اس نے دو تین دوائیں لکھ کر دیں۔ چار بجے مکھرجی حال پوچھنے آیا تو پرمود نے اس سے دوائیں منگوائیں۔ مکھرجی نے پوچھا کہ کیا شام کے لیے کچھ کھانے کو چاہیے۔ پرمود نے کہا، ”نہیں۔ فرج میں پنیر وغیرہ رکھا ہے۔ اس سے کام چل جائے گا۔“

تیسرے دن بھی حالت میں کچھ بہتری دکھائی نہ دی۔ ڈاکٹر نے اینٹی بایوٹک گولیاں دی تھیں،

Scanned with CamScanner

ان کا اثر ہونے میں بھی وقت لگتا تھا۔ دن بھر پلنگ پر لیٹے لیٹے بہت سے خیالات اور یادیں پرمود کے ذہن سے گزرتی رہیں۔ بیماری میں بہت پرانی اور خفیف یادیں کیوں ابھر آتی ہیں؟ شاید حال کی زندگی بہت کمزور اور پست سطح پر آ جانے کی وجہ سے ذہن پچھلے زمانے کو زندہ کر کے اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوگا۔ یا پھر جسمانی وجود کے ڈھے جانے کے باعث ذہن کے اندر کے خانے سے سب کچھ اچھل کر سامنے آ جاتا ہوگا۔ ایسے خیالوں کے بیچ بیچ میں اس کے ذہن میں سلوئی کا خیال بھی تیرتا رہتا تھا۔ سوچتے سوچتے اسے اونگھ آ جاتی۔ بیداری اور نیند کی درمیانی سرحد غیر واضح ہوگئی تھی۔

شام کے وقت اسی غنودگی میں اسے دروازے کی گھنٹی بجنے کا احساس ہوا۔ گھرجی ہوگا، اس نے سوچا۔ بوجھل آنکھوں کے ساتھ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ فرید، سلوئی کا بھائی تھا۔ پرمود کو تعجب ہوا۔ فرید اس کے گھر کبھی نہیں آیا تھا۔

کئی لمحے کرسی پر خاموش بیٹھا رہنے کے بعد فرید بولا، ”کیا حال ہے، ڈاکٹر؟“

”زیادہ برا نہیں۔ ڈاکٹر نے دوا دی ہے۔“

دوبارہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد فرید نے کہا، ”مجھے سلوئی نے بھیجا ہے۔“

سلوئی نے فرید کو اعتماد میں لے لیا ہوگا۔ ہم دونوں کے بارے میں اس نے فرید کو کتنا اور کیا بتایا ہوگا؟

”... آپ کا حال پوچھنے کے لیے،“ فرید نے اپنا جملہ پورا کیا۔

”میری طبیعت خراب ہونے کا اسے کیسے پتا چلا؟“

”کل سلوئی نے مجھے آپ سے کالج میں ملنے کو کہا تھا۔ کالج میں پتا چلا کہ آپ سک لیو پر ہیں۔ آج بھی آپ کالج میں نہیں تھے۔ سلوئی کو بتایا تو اس نے کہا، 'ان کے گھر جا کر ملو۔' اس لیے آیا ہوں۔“

”سلوئی ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں، وہ ٹھیک ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔“

”اور بابا — بابا نے کچھ کہا؟“

”بہت غصہ ہوئے تھے۔ اتنی دیر ہوگئی تھی... کپڑے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے! 'کہاں گئی

تھیں؟ کس کے ساتھ گئی تھیں؟' ایسے پوچھتے رہے۔ 'سہیلیوں کے ساتھ گھومنے گئی تھی، سلوئی یہی کہتی رہی۔ بابا کا شک دور نہیں ہو رہا تھا۔ انھوں نے اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔ ظاہر ہے، کالج جانا بھی بند!''

پرمود کچھ کہے بغیر فرید کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، یہ معلوم ہونے پر وہ بہت بے چین ہوئی۔ وہ خود یہاں آتی، لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اس نے مجھ سے کہا۔ یہ اس نے آپ کے لیے بھیجے ہیں۔'' سیبوں کا تھیلا فرید نے میز پر رکھ دیا۔

فرید سے زیادہ بات کرنا پرمود کو مشکل محسوس ہوا۔ لگتا تھا فرید کو بھی دشواری ہو رہی ہے۔ یوں بھی وہ باتونی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پرمود بولا، ''دیکھو فرید، سلوئی کو مت بتانا کہ میں بہت بیمار ہوں! بس کہہ دینا، ذرا زکام ہو گیا ہے۔'' پھر کچھ رک کر کہنے لگا، ''میں اس سے ملوں گا، جتنی جلدی ہو سکا۔۔۔ انشاءاللہ!''

فرید کے جانے کے کوئی آدھ گھنٹے بعد فرانسوا آ گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد بولا، ''بہت مہنگی پڑی تمھیں پرسوں کی سیر!''

پرمود نے کہا، ''بیماری کی بات تو جانے دو۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ لیکن ایک اور لحاظ سے بھی یہ سیر واقعی بھاری پڑی!''

پرمود نے اسے سلوئی ابو فرید کے بارے میں بتایا۔ فرانسوا بولا، ''اگر کوئی زیادہ گمبھیر بات نہیں ہوئی تو پھر ٹھیک ہے! اس معاملے میں یہ لوگ بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ میری جان پہچان کی ایک لڑکی تھی؛ اس کا کسی کے ساتھ لو افیئر چل رہا تھا۔ وہ حاملہ ہو گئی۔ باپ کو معلوم ہو گیا اور اس نے ایک دن اپنی بیٹی کو چھری سے قتل کر دیا۔ ایسے معاملوں میں قانون بھی زیادہ تر باپ کا ساتھ دیتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ باپ نے اپنا فرض ادا کیا۔ ظاہر ہے، تم لوگ اتنا آگے نہیں گئے ہو گے — کم از کم مجھے تو یہی امید ہے!''

فرانسوا نے آنکھیں مٹکائیں۔ پرمود اس کے مذاق کا جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

آٹھ بجے بکھرجی حال دریافت کر کے گیا۔ وہ کوئی سبزی پکا کر لایا تھا؛ وہ پرمود نے کھائے بغیر

ریفریجریٹر میں رکھ دی۔ میز پر رکھے تھیلے میں سے ایک سیب کھا کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔

آسمان پر بہت اونچائی سے نیچے کی زمین نظر آ رہی تھی — دور دور تک پھیلا ہوا سپاٹ علاقہ۔ نرسلوں کے جھنڈ اور بیچ بیچ میں دلدل۔

پھر اس نے یکدم نیچے کو غوطہ کھایا۔ نرسلوں کی پتیوں اور پانی پر کی چھوٹی چھوٹی لہروں کے نقش قریب سے صاف دکھائی دینے لگے۔ نرسلوں کے ایک جھنڈ میں اسے ایک ہسپتال کا سا پلنگ پھنسا ہوا دکھائی دیا۔ پلنگ پر بچھی سفید چادر، اوپر لوہے کا فریم اور اس پر الٹی ٹنگی ہوئی سیلائن کی بوتل۔ بوتل سے نکلتی ہوئی ٹیوب پلنگ پر لیٹے ہوئے شخص کے ہاتھ میں جا رہی تھی۔ پلنگ پر لیٹے ہوئے شخص کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے چینی سے اپنے ہاتھ پیر اور سر پٹک رہا تھا۔ ہوا میں نرسلوں کے جھکولے کھانے سے پلنگ بھی ڈول رہا تھا۔

پھر پلنگ جھاڑی سے پھسل کر پانی میں جا پڑا اور آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ اب وہ آدمی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیلائن کی بوتل فریم سے چھوٹ کر پانی پر تیرنے لگی۔ پھر جھٹپٹا چھا گیا۔

سپاٹ اُجاڑ علاقے میں ایک ٹیلے پر ایک معبد کھڑا تھا۔ معبد کے اردگرد چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ معبد کے اونچے اور چوڑے دروازے سے ایک بڑا سا ہڈیوں کا بنا ہاتھ باہر نکل کر آس پاس کے مکانوں کے دروازے کھڑکیاں ٹٹول رہا تھا۔ ہاتھ کی انگلیوں کی ہڈیاں مکانوں کے دروازوں کھڑکیوں سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر زور کی ہوا چلنے لگی، ویرانی میں دھول اڑنے لگی۔ معبد اور مکان سب دھول میں چھپ گئے۔

وہ ویران سپاٹ میدان پار کر کے ٹیلے کے پاس آیا۔ چڑھ کر اوپر پہنچا۔ ٹیلے کی چوٹی پر دھول میں پتھر کا ایک بڑا سا پیالہ پڑا تھا۔ تیز ہوا میں آنکھیں آدھی میچ کر وہ جھک کر اس پیالے کو غور سے نہارنے لگا۔ اس کے ایک پہلو پر کچھ حروف کھدے ہوئے تھے۔ معبد بنوانے والے بادشاہ کا نام۔ اس پیالے میں کبھی بڑے دروازے کا پاکھا گھوما کرتا تھا۔ اب وہ لکڑی کا دروازہ غائب ہو چکا تھا، اینٹوں کی وہ دیوار بھی غائب ہو چکی تھی جس میں وہ دروازہ جڑا ہوا تھا۔ صرف پتھر کا یہ پیالہ باقی بچا تھا۔ پھر بھی ہوا سے دروازہ چرچرانے اور پٹوں کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھڑا یہ

آواز سنتا رہا۔اس نے پیالے پر ہاتھ پھیرا۔اس مٹی کی سرزمین میں پتھر کا یہ پیالہ بہت قیمتی تھا،سینکڑوں میل دور سے لایا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔اسے معلوم تھا کہ کبھی نہ کبھی لوگ یہاں واپس آئیں گے، یہ پیالہ اٹھا کر لے جائیں گے اور کسی نئے معبد کی تعمیر میں استعمال کریں گے۔اس کے لیے یہ پیالہ بے مصرف تھا کیونکہ اسے کہیں کوئی معبد یا حویلی بنانے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

ویران میدان میں ایک جگہ کسی نے گہرے گڈھے کھود رکھے تھے۔کنارے پر کچھ لمحے کھڑا رہنے کے بعد وہ ایک گڈھے میں اترا۔گڈھے کی دیواروں میں مٹی کھود کر گہرے کھانچے بنائے گئے تھے۔یہ کسی کی کھودی ہوئی قبریں تھیں۔ایک کے اوپر ایک چھ قبریں۔سب سے نیچے والی قبر اور سب سے اوپر والی قبر بننے کے درمیان کتنی صدیاں گزری ہوں گی، وہ کھڑا سوچتا رہا۔اور سب سے اوپر والی قبر کتنی صدیوں پرانی ہوگی۔اسے یہ قبریں ایسی معلوم ہوئیں جیسے مردہ خانے کی دیوار میں اوپر تلے بنی ہوئی درازیں۔ابدیت کے مردہ خانے کی درازیں۔اور اب یہ درازیں کس نے کس کے لیے کھول رکھی تھیں؟ کیا کوئی کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہا تھا؟

وہ باہر نکلا اور برابر کے گڈھے میں اترا۔اس کے ایک گوشے میں زمین کی سطح سے ملی ہوئی صرف ایک قبر تھی۔اس کے اردگرد سفید سفوف سا بکھرا ہوا تھا۔جس چٹائی میں لاش کو لپیٹا گیا ہوگا اس پر اس کے بدن کا نقش سا بنا ہوا تھا۔لاش بائیں کروٹ سے لٹائی گئی تھی۔ٹانگیں گھٹنوں پر سے اوپر کو مڑی ہوئی تھیں، دونوں ہاتھ منھ کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ہاتھوں میں پکڑا ہوا مٹی کا سکورا ٹوٹے ہوئے ٹھیکروں کی شکل میں اب تک باقی تھا، سکورے کا پانی پانچ ہزار سال پہلے سوکھ چکا تھا۔

ایک اور گڈھے میں اسے ایک لمبی چوڑی قبر ملی۔کسی بادشاہ یا ملکہ کی رہی ہوگی۔سفوف بن چکے لکڑی کے رتھ کے سامنے دو گدھوں کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے بکھرے پڑے تھے۔ان کے قریب ہی گاڑی ہانکنے والے دو مزدوروں کے ڈھانچے تھے۔گدھوں کے ڈھانچوں کے ڈھیر پر ایک گول کڑا پڑا تھا جسے لگام کے اڈے پر اٹکا کر رکھا گیا ہوگا۔اب صرف یہ کڑا ہی باقی بچا تھا، ٹوٹے پھوٹے ڈھانچوں کے ڈھیر پر پڑا ہوا چاندی کا کڑا۔اس کا جی چاہا، کڑا اٹھا کر جیب میں ڈال لے۔ لیکن اس کا ہاتھ جنبش ہی نہیں کر پا رہا تھا۔بہت کوشش کے باوجود اسے لگا جیسے ہاتھ مفلوج ہو چکا ہو۔

تھوڑا آگے اسے ایک بربط کی باقیات دکھائی دیں۔لکڑی کا بنا حصہ گل کر ختم ہو چکا تھا لیکن

Scanned with CamScanner

دھاتی حصے باقی تھے۔ تار باندھنے کے لیے جڑی ہوئی سونے کی کیلیں، پہلو پر لگائے ہوئے موتی اور قیمتی پتھر، اور سامنے کے حصے پر سونے کا ڈھلا ہوا بیل کا سر جس کی آنکھیں اور ایال لاجورد کی تھیں۔ بربط کے اس کھنڈر سے آگے بربط نواز کا ڈھانچہ پڑا تھا جس کی کھوپڑی پر سونے کا تاج تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ڈھانچے کی ہڈیاں ہلنے کی کوشش کر رہی ہیں تو وہ جلدی سے اوپر چڑھ کر گڈھے سے باہر نکل آیا۔

ہر طرف مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے بکھرے پڑے تھے۔ الگ الگ شکلوں والے منقش برتن۔ تکونے، چوکور نقش، سانپوں جیسی لہریے دار لکیریں، پرندوں اور ہرنوں کی شکلیں۔ مٹے ہوئے لال، کالے، سفید رنگ۔ بیل گاڑیوں کی لمبی قطار جن پر کالے پتھر کی بھاری سلیں اور ٹیڑھے میڑھے پتھر لدے ہوئے تھے۔ بیل جان توڑ کر گاڑیاں کھینچ رہے تھے، اور ان پر سوار لوگ زور زور سے چلا کر انھیں ہانک رہے تھے۔ دھول اُڑ رہی تھی۔

پھر اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہر طرف پانی ہی پانی پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ پانی کے سوا کچھ بھی موجود نہ تھا۔ گندا مور کھ پانی، جس میں بیچ بیچ میں بلبلے اٹھ رہے تھے۔ حال مست، بے حس پانی کو دھیرے دھیرے ہلتے دیکھ کر اسے دہشت اور گھن محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس پانی سے چھٹکارا پانے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر ایک دیوتا نمودار ہوا اور اس نے سیپی کے دو حصوں کی طرح کائنات کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ اوپر جنت اور نیچے دھرتی۔ دھرتی پر پیڑ اُگے، دریا بہنے لگے۔

فرات کے کنارے پر ہُلُپّو کا ایک پودا پنپ رہا تھا۔ دریا کا پانی پودے کے آس پاس پہنچ کر اسے جیون رس دے رہا تھا۔ پھر جنوب سے زور کی ہوا چلی اور اس نے پودے کو اکھیڑ ڈالا۔ پودا فرات کے پانی پر تیرنے لگا۔ دیوی اِنّا دریا کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اس نے پودے کو پانی میں سے اٹھایا اور اپنے شہر لے گئی۔ اسے اپنے مقدس باغ میں بو دیا اور اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ اِنّا نے خود سے کہا، ''جب یہ بڑھ کر بڑا پیڑ بن جائے گا تو میں اس سے ایک کرسی اور ایک مسہری بناؤں گی۔'' پیر سمیٹ کر گھٹنوں کے گرد بازو رکھے اِنّا دیوی پودے کی نرم اور تازہ پتیوں کو ہوا میں لہراتے دیکھتی اور اس کے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔

اِنّا دیوی پاتال میں اتر رہی تھی۔ نیچے اندھیرے راستے پر اس کا دھندلا پیکر دکھائی دے رہا

Scanned with CamScanner

تھا۔اوپر روشنی میں لمبی داڑھیوں اور کندھوں تک پہنچتے بالوں والے مرد آسمان کی طرف منہ کر کے گا رہے تھے:

ہماری ملکہ نے جنت چھوڑی، دھرتی چھوڑی،
پاتال میں اتری۔
انتا نے جنت چھوڑی، دھرتی چھوڑی،
پاتال میں اتری۔
راج چھوڑا، ملکہ کا تخت چھوڑا،
پاتال میں اتری۔

دھیرے دھیرے انتا دیوی پاتال میں غائب ہوگئی۔ان آدمیوں کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔
لمبی داڑھیوں اور کندھوں تک پہنچتے بالوں والے مرد دھرتی پر اکڑوں، خاموش بیٹھے تھے۔پھر آسمان سے انلیل دیوتا ہاتھ میں کلھاڑی لیے نمودار ہوا۔اس نے کلھاڑی ان آدمیوں کو دے دی۔وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور خوشی سے چیخنے لگے۔وہ گا رہے تھے:

کلھاڑی اور ٹوکری بنائیں شہر،
کلھاڑی بنائے ایمان دار گھر،
کلھاڑی کھڑے کرے ایمان دار گھر
خوشحال کرے ایمان دار گھروں کو،
جو گھر کریں بادشاہ سے بغاوت،
بادشاہ کی حکم عدولی کریں جو گھر،
کلھاڑی لائے قابو میں ان گھروں کو۔
بدمعاش پودوں کو کچل دے کلھاڑی،
اکھیڑ دے ان کی جڑیں، اڑا دے ان کا تاج،
بھلے پودوں کو جینے دے کلھاڑی۔
کلھاڑی کی تقدیر

Scanned with CamScanner

بنائی انلیل دیوتا نے،
عظیم اور طاقت ور ہے کلھاڑی۔

کلھاڑی سے گھاس اور جھاڑیاں کاٹ کر لوگوں نے گھر بنائے، کھیتی کی۔ دریا پاس ہی تھا، کلھاڑی کی مدد سے اس میں سے نہریں نکالیں۔ کھیت لہلہانے لگے۔ لوگ سکھی ہو گئے۔ دریا سے آتی ہوئی ہوا انھیں بھانے لگی۔ وہ دریا کنارے کے نرسلوں کی طرح خوشی سے ناچنے لگے۔ لیکن پھر ایک دن بہت زوردار جھکڑ چلے، گھٹا اٹھی۔ بارش نے گھروں اور کھیتوں پر حملہ کیا۔ طوفان نے گھر اور کھیت ہموار کر دیے۔ لوگوں نے اپنے بدن سکیڑ لیے اور اپنے بچاؤ کی کوشش کرنے لگے۔ طوفان کا زور ٹوٹا تو وہ اداس ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کا سب سروسامان برباد ہو چکا تھا۔ پھر انھوں نے ہر شے پر قادر انکی دیوتا سے التجا کی۔ ان کی التجا شہر اریدو میں انکی کے کانوں تک پہنچی۔ پھر انکی اریدو سے اپنے شاہی جہاز میں سوار ہو کر آیا۔ ''کیا گڑبڑ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ لوگوں نے بتایا، ''طوفان نے ہمارا سب کچھ ملیامیٹ کر دیا۔ اے انکی، ہماری حفاظت کر!'' انکی بولا، ''ٹھیک ہے، میں تمھاری حفاظت کروں گا۔ لیکن تمھیں میرے حکم پر چلنا ہوگا۔ میں سب چیزوں پر قابو رکھوں گا۔ ہر چیز میرے لفظوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ میں کسی کی زبان درازی برداشت نہیں کروں گا۔ تمھیں منظور ہے؟'' لوگ چلائے، ''ہمیں منظور ہے، اے انکی!'' تب انکی دیوتا نے ان کی زندگی کو پھر سے بحال کر دیا۔ نظم وضبط قائم کیا۔ اس نے دریا کے پانی کو قابو میں کیا۔ سمندر کے پانی کو پابند کیا۔ ہوا پر قابو پایا۔ پھر اس نے ہل اور کھلیان، اینٹیں اور مکان بحال کیے۔ جانداروں کو منظم کیا۔ لوگوں کی زندگی میں ترتیب پیدا کی۔ اس نے قاعدے کے مطابق سونپے گئے کام سے ہٹنے کا کسی کو تل بھر بھی موقع نہ دیا۔ سب لوگ انکی کے کہے پر خاموشی سے عمل کرنے لگے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنھیں یہ سب بھاری لگنے لگا۔ ایک نے کہا، ''انکی کے لفظوں کے سوا ہمارا کوئی وجود ہی نہیں!'' دوسرا بولا، ''ہم انکی دیوتا کے غلام بن گئے ہیں۔'' تیسرے نے کہا، ''یہ ہمارے ہی بھلے کے لیے ہے!'' چوتھا بولا، ''انکی دیوتا ہمارا واحد سہارا ہے۔'' پھر آسمان کی طرف منھ اٹھا کر سب گانے لگے:

انکی دیوتا، ساحر کی آنکھوں والے انکی دیوتا،
اپنی جگہ قائم رہتے ہوئے بھی

سب چیزوں میں سرایت کرنے والے دیوتا،

لامحدود علم رکھنے والے، اپنی رضا کو فیصلے اور مفاہمت کی شکل دے کر

انسانوں کے جھگڑے نمٹانے والے دیوتا،

سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک

رہنمائی کرنے والے...

لیکن ان کی آوازیں مدھم پڑنے لگیں اور وہ سب غائب ہو گئے۔

پھر اسے نرسلوں کے جنگلوں کے درمیان پانی کے بہاؤ پر چلتی ہوئی موٹر بوٹ دکھائی دی۔ کشتی کی چھت پر سلویٰ سر گھٹنوں پر رکھے اکیلی بیٹھی تھی۔ پھر وہ سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، چھت سے نیچے جھک کر کشتی میں چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ اس نے کشتی والے سے بار بار کچھ پوچھا۔ لیکن کشتی والے نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ سکان پر ہاتھ رکھے ساکت سامنے دیکھتا رہا۔ سلویٰ اٹھ کھڑی ہوئی اور پانی میں ہر طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ گھبرایا ہوا اور فکر مند دکھائی دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے کشتی دور چلی گئی۔

اس نے بہاؤ کی طرف دیکھا۔ پانی کی سطح کے ذرا نیچے ایک مرا ہوا کتا تیر رہا تھا۔ کھال گل کر گر جانے کی وجہ سے اس کا شفاف گلابی جسم پاکیزہ نظر آ رہا تھا۔ کتا آہستہ آہستہ تیرتا رہا۔

پھر وہ دوبارہ مٹی کے برتنوں کے ٹھیکروں سے بھرے ویران میدان میں چلنے لگا۔ اسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ ٹھیکروں کے اس میدان میں پانی کہیں نہیں ملے گا، یہ وہ جانتا تھا۔ ٹھیکروں کو دیکھ دیکھ کر اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس نے دو چار ٹھیکروں کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔ بہت چلنے کے بعد سامنے کھجور کے کچھ پیڑ دکھائی دیے۔ وہ پیڑوں کے پاس پہنچا۔ پھر ان کے پاس سے گزرنے لگا۔ بائیں طرف ایک پیڑ کے نیچے اسے کالا برقع پہنے ایک بڑھیا نظر آئی۔ وہ اکڑوں بیٹھی اپنے سوکھے ہوئے ہاتھوں سے زمین پر پڑی کھجوریں بین رہی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے بڑھیا نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے نظر ہٹا کر اپنے راستے پر چلے جانا چاہا، لیکن وہ نہ نظر پھیر سکا اور نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکا۔ لگتا تھا وہ اپنی جگہ جم گیا ہے۔ اس کا پورا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔ بہت دیر تک بڑھیا ساکت بیٹھی اس کی

Scanned with CamScanner

طرف دیکھتی رہی۔ پھر گردن نیچی کر کے دوبارہ کھجوریں بیننے لگی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا اور چل پڑا۔

7

ہفتے بھر میں پرمود ٹھیک ہو گیا۔ کمزوری پھر بھی باقی رہ گئی۔ اس کے علاوہ بیماری سے اٹھنے کی حالت میں اسے اپنی ذہنی کیفیت بہت نازک اور غیر مستحکم محسوس ہوتی تھی۔ اسے لگا کہ ابھی کچھ دن ضرورت محسوس ہونے پر بھی وہ کسی سے زور یا جذبے کے لہجے میں بات نہیں کر سکے گا۔

پہلے ہی دن کالج میں اس نے فرید کو تلاش کیا، لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ پرمود کو خیال آیا کہ سیدھا سلوئی کے گھر چلا جائے، لیکن فیصلہ نہیں کر سکا۔ تیسرے دن کوریڈور سے گزرتے ہوئے اسے سمیع نامی اپنا ایک شاگرد دکھائی دیا۔ وہ جانتا تھا کہ سمیع فرید کا دوست ہے۔ اس نے سمیع کو روک کر پوچھا: ’’کیوں، فرید آج کل کالج نہیں آ رہا ہے کیا؟‘‘

سمیع کچھ ہچکچایا، پھر بولا: ’’آپ کو معلوم نہیں سر؟ سمیع کالج چھوڑ کر بغداد چلا گیا ہے۔‘‘

’’بغداد؟ کالج چھوڑ کر؟ وہ کیوں؟‘‘

’’فرید کے والد کو پچھلے ہفتے پولیس نے گرفتار کر لیا۔ وہ کسی شخص کے ذریعے بہت بڑی رقم ملک سے باہر ایک بینک میں بھیجنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پولیس نے انھیں جال میں پھنسا لیا۔‘‘

’’پھر فرید بغداد کیوں چلا گیا؟‘‘

’’والد کے جیل جانے کے بعد بچوں کو کون دیکھتا؟ فرید کے چچا بغداد سے آئے اور اسے اور اس کی بہن کو اپنے ساتھ لے گئے۔‘‘ پرمود کو خاموش کھڑے دیکھ کر سمیع نے پوچھا: ’’آپ کو فرید سے کچھ کام تھا؟‘‘

’’نہیں، کوئی ایسا خاص کام نہیں تھا،‘‘ پرمود بولا۔ ’’او کے، تھینکس۔‘‘

اگلے کچھ دن پرمود نے اپنے معمول کے کاموں کے سوا ہر چیز سے دلچسپی لینا ترک کر دیا۔ کالج سے نکل کر سیدھا گھر آتا اور شام کا وقت زیادہ تر ریڈیو سننے یا کوئی اِدھر اُدھر کی چیز پڑھنے میں گزارتا۔ پہلے کی طرح دریا کنارے کے ہوٹل میں جا کر بیٹھنے کو بھی اس کا جی نہ چاہتا۔ ایک بار وہ

دریا کنارے جا کر بیٹھا تو اسے ابوفرید کی یاد آئی۔ برابر کی میز پر چار آدمی ہنستے چلاتے پانسہ کھیل رہے تھے۔ پانسہ پھینکنے کی کھڑ کھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ابوفرید کا پانسہ غلط پڑ گیا، پرمود کو خیال آیا۔

چھٹیوں کا خیال پرمود کے ذہن میں بار بار آنے لگا۔ ٹرم ختم ہونے والی تھی۔ تین چار ہفتے میں امتحان؛ پھر پندرہ دن چھٹی۔ فوراً ہوائی جہاز پکڑ کر ملک سے باہر نکل جانا چاہیے۔ لیکن کہاں؟ یہ اسے اب تک معلوم نہیں تھا۔ اس دوران اسے بلومنگٹن سے جواین کا خط ملا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنے والد کے پاس مہینہ بھر گزارنے کے لیے تہران جانے والی ہے۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا وہ بھی تہران آ سکتا ہے۔ جواین کا خط آئے کئی دن ہو گئے تھے، پرمود نے جواب نہیں لکھا تھا۔ تہران میں جواین کے والدین کے گھر جانے کا خیال اسے اتنا بھایا نہیں۔

ایک دن فرانسوا پرمود کے گھر آیا۔ "چلو، اب صرف بتیس دن رہ گئے، پھر بیروت!" اس نے کہا۔

"واہ! تم تو ایک ایک دن گن رہے ہو!"

"میں تو ہر چھٹیوں کے بعد یہاں آتے ہی دن گننا شروع کر دیتا ہوں!"

"تو تم بیروت جاؤ گے؟"

"اور کیا! اور کہاں جاؤں گا؟ بیروت جانے کا موقع چھوڑ دوں گا کیا؟"

"ہوں..." پرمود نے خود سے ہونکارا ابھرا۔

"اور تم کہاں جاؤ گے — بمبئی؟"

"کون جانے! بمبئی جانا کوئی ضروری نہیں۔"

"کمال ہے! گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تمھارا؟"

پرمود نے کندھے اچکائے۔

"تو پھر کیا امریکہ جاؤ گے؟"

"امریکہ جانے کی بھی مجھے کوئی خاص خواہش نہیں۔ یوں بھی وہ بہت دور ہے۔ پندرہ دن کے لیے اتنا لمبا سفر کرنے کا کوئی مطلب نہیں۔"

"تمھیں بتاؤں — تم میرے ساتھ بیروت چلو!" فرانسوا چٹکی بجا کر بولا۔ "میں تمھارا پورا خیال رکھوں گا۔ بیروت کتنا خوبصورت ہے، ایک بار دیکھ لو۔"

Scanned with CamScanner

''نہیں بابا! میں کسی لڑائی میں جا کر پھنسنا نہیں چاہتا۔''

''اچھا... '' فرانسوا دکھی لہجے میں بولا۔ ''یعنی بیروت میں خطرہ معلوم ہوتا ہے اس لیے تم وہاں نہیں چلنا چاہتے۔ اگر بیروت محفوظ محسوس ہو تو تم وہاں جا کر مزے کرنے کو تیار ہو!''

پرمود نے ہنس کر کہا، ''بیروت تمھارا ہے فرانسوا، میرا نہیں! میں بھلا بیروت سے وفاداری کیوں جوڑوں!''

''تو پھر، کہاں سے جوڑو گے اپنی وفاداری؟''

''پتا نہیں۔''

''تو پھر یہیں کیوں نہیں رہ جاتے؟''

''یہاں؟ نہیں، باہر تو مجھے ضرور جانا ہے۔ مجھے تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یقیناً! سچ کہوں تو میں بھی تمھاری طرح دن گننے لگا ہوں۔''

''جلدی طے کر لو کہاں جانا ہے۔ بعد میں عین وقت پر ٹکٹ، ویزا وغیرہ حاصل کرنا مشکل ہوگا۔''

''مجھے عادت ہے عین وقت پر دوڑ دھوپ کرنے کی!'' پھر کچھ رک کر بولا، ''اگر ممکن ہو تو یونان جانے کی سوچ رہا ہوں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ سستا بھی ہوگا۔ اور اس جاڑے کے موسم میں اچھا بھی رہے گا۔ کسی پتھریلے یونانی جزیرے پر جا کر دس پندرہ دن سمندر کو دیکھتے ہوئے گزارنے کا خیال تمھیں کیسا لگتا ہے؟''

''تمھاری مرضی!'' فرانسوا منھ بنا کر بولا۔

فرانسوا نے بتایا کہ اگلے دن وہ فرنچ کیمپ جا رہا ہے، اس نے پرمود کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ پرمود بولا، ''ٹھیک ہے۔ ایک بار دیکھتے ہیں تمھارا فرنچ کیمپ!''

فرنچ کیمپ شہر سے خاصی دور، کویت جانے والی سڑک پر تھا۔ ویران علاقے میں باڑ لگا کر نیچے نیچے ایک منزلہ پری فیبریکیٹڈ مکان کھڑے کر لیے گئے تھے۔ بہت ہی عملی اور عارضی قسم کا انتظام تھا، ہر طرح کی دلکشی سے عاری۔ فرانسوا نے کچھ فرانسیسیوں سے پرمود کا تعارف کرایا۔ ان انجینئر ٹائپ کے لوگوں سے پرمود کی کچھ زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ فرانسوا اسے کیمپ کے مرکز میں بنے اسٹور میں لے گیا۔ شہر کی دکانوں میں نہ ملنے والی چیزیں یہاں دستیاب تھیں۔ فرانس سے منگوائے

ہوئے خوراک کے مہر بند ڈبے، فرنچ وائن وغیرہ۔ ''تمھیں کچھ خریدنا ہے؟'' فرانسوا نے پوچھا۔ پرمود ڈبوں کا جائزہ لینے لگا۔ پاس ہی فرانسوا کی جان پہچان کا ایک فرانسیسی خاندان خریداری کر رہا تھا۔ ان کے پانچ چھ سال کے دو بچے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انھیں فرانسوا کی بابت تجسس ہے۔ فرانسوا کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے ایک بچہ پوچھنے لگا، ''موسیو، وُوزیت فرانسے؟ موسیو، وُوزیت فرانسے؟'' (موسیو، کیا آپ فرانسیسی ہیں؟) یہ سوال کر کے بچے آپس ہی میں ہنسنے لگے۔ گندمی رنگت والا، عرب دکھائی دینے والا آدمی فرانسیسی کیونکر ہے، اس پر انھیں تعجب اور شک ہو رہا تھا۔ فرانسوا کچھ بے چین سا دکھائی دینے لگا۔ اس نے بچوں کے شوروغل کو نظرانداز کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ پھر بھی بچے کچھ دیر تک شور مچاتے رہے۔ پھر ان کی ماں نے آ کر ڈانٹا تو چپ ہوئے۔

واپس آتے ہوئے جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو گورنر ہاؤس کے سامنے خالی جگہ میں انھیں لوگوں کی ایک بھیڑ دکھائی دی۔ پاس ہی ایک اونچے پلیٹ فارم پر ٹی وی کیمرا کھڑا کیا گیا تھا۔ مجمع جوش سے نعرے لگا رہا تھا۔

''کیا نعرے لگا رہے ہیں؟'' پرمود نے پوچھا۔

''مصری صدر سادات کے اسرائیل کے دورے کی مذمت کر رہے ہیں،'' فرانسوا بولا۔

''اچھا، یعنی سرکاری مظاہرین سرکاری دفتر کے سامنے سرکار کے پسندیدہ نعرے لگا رہے ہیں!'' پرمود نے کہا۔

کوئی تیس چالیس مظاہرین تھے جو چھوٹے سے دائرے میں چکر لگاتے ہوئے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ ٹی وی کے کیمرے ان پر مرکوز تھے۔ ٹی وی پر یہ فلم دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا کہ یہ سینکڑوں افراد کی زوردار ریلی ہے۔

امتحان قریب آنے کی وجہ سے نصاب پورا کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ کام کا دباؤ بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ پرچے تیار کرنے کا کام بھی پورا کرنا تھا۔ پرمود کو زیادہ فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس گڑبڑ میں بھی چھٹیوں کا خیال اس کے ذہن سے محو نہیں ہو رہا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا ضروری ہو گیا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ جواین کا خیال اس کے ذہن میں کئی بار آتا تھا۔ وہ تہران میں یعنی اتنے

Scanned with CamScanner

قریب آ رہی ہے، کیا اس سے ملنا نہیں چاہیے؟ لیکن تہران جانے پر وہ خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔ جواین کو یہاں بلوانا بھی ممکنات میں سے نہیں تھا۔ اس ملک کا ٹورسٹ ویزا ملنا یوں بھی مشکل تھا؛ اس پر یہ کہ جواین امریکی تھی۔ اسے یہاں آنے کی اجازت ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر پرمود کو خیال آیا، جواین سے ہندوستان میں کیوں نہ ملا جائے۔ میں بمبئی چلا جاؤں اور اسے بھی وہیں بلا لوں۔ تہران سے بمبئی کچھ زیادہ دور نہیں۔ دونوں قریب قریب ساتھ ہی بمبئی پہنچنے کا بندوبست کر سکتے تھے۔ بمبئی جانے کے بارے میں اسے بظاہر کوئی جوش نہیں تھا، پھر بھی اس خیال سے اسے ایک دم اپنے اندر توانائی سی محسوس ہوئی۔ شاید دل سے اس کو بمبئی جانے کی خواہش تھی۔ لیکن میں اصل میں جواین کی خاطر بمبئی جا رہا ہوں، وہ خود کو یہ سمجھا سکتا تھا۔

جواین سے اس طرح ارادہ کر کے ملنا، اس کے ساتھ دس پندرہ دن گزارنا، یہ ایک اہم قدم تھا۔ اس کے آگے کیا ہوگا، اس کے بارے میں بھی سوچنا ضروری تھا۔ کیا آگے چل کر جواین سے شادی کر کے ہندوستان میں بس جانے کا امکان تھا؟ لیکن جواین ہندوستان میں رہنے کو راضی ہوگی یا نہیں، اس بارے میں اسے شک تھا۔ اگر راضی ہو جاتی، پھر بھی اس تجربے کو آگے چل کر کتنی کامیابی حاصل ہوگی، اس بارے میں بھی وہ یقین سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ یا وہ پھر سے امریکہ لوٹ جائیں؟ لیکن پھر میں امریکہ چھوڑ کر آیا ہی کیوں؟ مجموعی طور پر، اسے مستقبل کے بارے میں کسی قسم کا یقین نہیں تھا۔ جواین کے ساتھ ہندوستان جانے سے شاید حالات زیادہ پیچیدہ ہو جاتے؛ شاید یہ کوئی مناسب خیال نہیں تھا۔ لیکن وہ معروضیت اور سمجھ بوجھ کے ساتھ اس بارے میں سوچنے کی حالت میں نہیں تھا۔ جواین کے ساتھ ہندوستان جانے کا خیال کسی حد تک ناگزیر اور بے تابی پر مبنی تھا؛ لیکن اس وقت وہ اس کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے جواین کو خط لکھ بھیجا۔

بمبئی جانے کے خیال کے ذہن میں جڑ پکڑنے کے بعد پرمود ایک دن حمید کے گھر گیا۔ پندرہ دن کی مختصر چھٹیوں میں بیشتر ہندوستانی وطن نہیں جاتے تھے۔ لیکن حمید کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، اس کی بیوی یہاں نہیں تھی؛ اس لیے پرمود کو خیال ہوا کہ وہ ضرور ہندوستان جانے والا ہوگا۔ بے شک، وہ علی گڑھ کا تھا اس لیے دہلی کا جہاز پکڑے گا۔ پھر بھی پرمود اس سے ایک بار ملنا چاہتا تھا، کیونکہ کافی دن پہلے ریستوران میں ملاقات ہونے پر اس نے حمید سے اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

پرمود کو دیکھ کر حمید کچھ کنفیوزڈ سا لگا لیکن جلد ہی اس نے بڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ پرمود کا استقبال کیا۔ ''آؤ، آؤ بھئی!'' پرمود کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ہندی میں کہا۔

ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے نوعمر لڑکے کی طرف اشارہ کر کے حمید نے کہا، ''یہ میرا دوست جواد ہے۔''

''ہاں، تم نے پچھلی بار تعارف کرایا تھا جب ہم ریستوران میں ملے تھے،'' پرمود کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جانی دوست معلوم ہوتا ہے تمھارا۔''

''ہاں، واقعی جانی دوست ہی ہے۔'' حمید نے کچھ عجیب سے انداز میں ہنس کر کہا۔

چھوٹی میز پر ایک ادھ بھرا گلاس رکھا تھا۔ برابر کی بڑی میز پر اسکاچ کی بوتل تھی۔ ''واہ! لگتا ہے پارٹی چل رہی ہے!''

حمید ہنسا اور جواد سے بولا، ''جواد، ذرا ایک اور گلاس لے آنا...'' جواد اٹھ کر اندر گیا اور گلاس لے آیا۔ میز پر سے بوتل اٹھا کر اس نے وسکی انڈیلی اور گلاس پرمود کے سامنے رکھ دیا۔ پرمود نے بتایا کہ اسے برف نہیں چاہیے، تو وہ جا کر فرج سے پانی کی بوتل لے آیا اور پرمود کے گلاس میں پانی ڈالا۔ پھر وہ بوتل واپس فرج میں رکھ کر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ ''لو،'' حمید نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

پرمود نے اپنا گلاس اٹھا کر پوچھا، ''جواد نہیں پیے گا؟''

''نہیں، یہ نہیں پیتا،'' حمید بولا۔ ''شریف بچہ ہے۔'' حمید نے 'چیرز' کہہ کر اپنے گلاس میں بچی ہوئی وسکی ایک لمبے گھونٹ میں ختم کر دی۔

''معلوم ہوتا ہے تم نے بہت کم وقت میں خاصی ترقی کر لی!'' پرمود نے کہا۔ ''بڑے پکے شرابی کی طرح پینے لگے ہو۔''

اپنی خوبصورت ترشی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حمید مسکرایا۔ ''دراصل پرمود، ایک بار شروع ہونے کی بات ہے۔ پھر کوئی مشکل نہیں۔''

حمید کا گلاس خالی دیکھ کر جواد پھر اٹھا۔ اس نے حمید کا گلاس بھرا اور اندر سے پانی لا کر ڈالا۔ لگتا تھا اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ حمید اپنے گلاس میں کتنا پانی چاہتا ہے۔

''سال بیچ کی چھٹیاں قریب آ رہی ہیں،'' پرمود نے حمید سے کہا۔ ''تم نے گھر جانے کی تیاری

Scanned with CamScanner

شروع کر دی ہو گی۔ جہاز کا ٹکٹ بک کرا لیا؟''

لمحہ بھر رک کر حمید بولا، ''میں ہندوستان نہیں جا رہا ہوں چھٹیوں میں۔''

''نہیں جا رہے؟'' پرمود حیران ہو کر بولا۔ ''لیکن تمھاری بیوی وہاں ہے؟ یا وہ یہاں آنے والی ہے؟''

''نہیں، وہ بھی نہیں آ رہی۔''

''وہ یہاں نہیں آ رہی، تم وہاں نہیں جا رہے — یہاں آنے سے ذرا پہلے ہی تو تمھاری شادی ہوئی تھی...''

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے نجی معاملات میں بلا وجہ مداخلت کو نامناسب جان کر پرمود نے موضوع بدل دیا۔ دونوں بہت دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ زیادہ تر حمید ہی بولتا رہا۔ اسے چڑھ گئی تھی۔ جیسے نشہ چڑھنے پر بہت سے لوگ باتونی ہو جاتے ہیں، اس کا بھی یہی معاملہ تھا۔ جواد خاموش بیٹھا تھا؛ حمید کچھ پوچھتا تو جواب دے دیتا اور بس۔ کچھ دیر بعد اس نے ٹیپ ریکارڈر پر عربی گانوں کی کیسٹ لگا دی اور بیٹھ کر سننے لگا۔ حمید اور پرمود زیادہ تر انگریزی اور بیچ بیچ میں ہندی میں بات کر رہے تھے۔ پرمود نے کہا، ''ہماری باتوں سے جواد کو بوریت تو نہیں ہو رہی ہو گی؟''

حمید بولا، ''وہ ٹھیک ہے، اس کی فکر مت کرو۔''

بولتے بولتے دونوں لڑکیوں کے موضوع پر آ گئے۔ ''یہاں لڑکیوں سے ملنا جلنا، ڈیٹنگ ویٹنگ کرنا بڑا مشکل ہے!'' پرمود نے کہا۔

حمید فوراً بولا، ''ہاں، لڑکیوں کا ملنا مشکل ہے، لڑکوں کا ملنا آسان ہے!'' اس نے پرمود کو آنکھ ماری۔

پرمود کچھ لمحے حمید کو دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا، ''اچھا، یعنی —'' اس نے جواد کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ ''یعنی تم اور وہ... اچھا، یہ بات ہے...''

حمید راز داری سے مسکرایا۔ ''ہے تو!'' اس نے کہا۔ دونوں ہندی میں بات کر رہے تھے۔ لیکن جواد کو محسوس ہو گیا کہ وہ اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں، اور اس نے ان کی طرف نظر اٹھائی۔ پھر گردن پھیر کر خاموشی سے گانا سننے لگا۔

Scanned with CamScanner

پرمود کے سر میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ حمید اب بھی کچھ کہہ رہا تھا لیکن پرمود کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ اپنی ادھیڑبن میں لگا ہوا تھا اور معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس سے نہ رہا گیا اور اس نے حمید سے کہا، ''معاف کرنا حمید، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی بیوی کو یہاں نہیں لانا چاہتے تھے؟'' پھر ذرا رک کر پوچھا، ''پھر یہاں آنے سے پہلے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''والد صاحب کے اصرار پر،'' حمید بولا۔ ''انھوں نے کہہ دیا تھا کہ جانا ہے تو شادی کر کے جاؤ۔ میں باہر نکلنا چاہتا تھا۔ گھر میں بہت گھٹن محسوس ہوتی تھی۔''

''گھٹن کاہے کی؟ تم تو اپنے والد ہی کی طرح کٹر مذہبی تھے۔''

''نہیں، وہ بات نہیں۔ گھٹن اِسی ایک معاملے میں تھی۔ کبھی کبھار موقع ملتا، وہ بھی چوری چھپے، بھاگم بھاگ... سوچا، گھر سے نکل جاؤں تو جی بھر کے آزادی ملے گی۔''

''لیکن اب شادی کرنے کے بعد گھر سے یہ تقاضا نہیں ہوتا کہ بیوی کو ساتھ لے کر جاؤ؟''

''تقاضا نہیں ہوتا؟ والد والدہ نے، بڑے بھائی نے، خود بیوی نے خط پر خط لکھے۔ میں کچھ نہ کچھ لکھ کر بات ٹالتا رہا۔ تین چار مہینے بعد معاملہ بہت ٹیڑھا ہو گیا۔ والد نے بیوی کو سیدھے یہاں بھیج دینے کا منصوبہ بنایا۔ مگر میں بے فکر رہا۔ جانتا تھا کہ جب تک میں یہاں سے کاغذات نہ بھیجوں، بیوی یہاں آ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اسے ویزا ہی نہیں ملے گا! اس لیے یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ پھر پچھلے مہینے بڑے بھائی کاروبار کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے۔ انھوں نے سوچا راستے میں یہاں رک کر مجھ سے ملیں اور منانے کی کوشش کریں۔ لیکن انھیں بھی ویزا نہیں ملا! — اس ملک میں یہ اچھی بات ہے۔ کام کے سوا کسی کو ویزا نہیں دیتے۔ بند دروازوں والا ملک! اس ملک میں میں خود کو بہت محفوظ سمجھتا ہوں۔ کوئی یہاں آ کر مجھے تنگ نہیں کر سکتا، نہ بیوی کو میرے سر مڑھ سکتا ہے!''

پرمود حمید کا منھ تکتا رہ گیا۔ ایک دم اتنا کچھ بولنے کے اثر سے حمید کے چہرے پر جوش طاری ہو گیا تھا۔ شراب بہت چڑھ جانے کی وجہ سے آنکھیں سرخ اور بھاری ہو رہی تھیں۔ بہت بولنے سے شاید اس کا گلا سوکھ گیا تھا؛ ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور خالی کر دیا۔ ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ پوری ہو گئی تو جواد نے اٹھ کر اسے الٹ کر لگایا۔ پھر ریفریجریٹر سے پیپسی کی ایک بوتل نکالی اور اپنی جگہ بیٹھ کر خاموشی سے اسے پینے لگا۔

Scanned with CamScanner

پرمود نے حمید سے کہا، ''ابھی کچھ عرصہ پہلے تم اتنے کٹر خیالات کے تھے— سینما نہیں دیکھنا، دارو کو نہیں چھونا—اور اب ایک دم اتنے بدل گئے! یہ کیسے ہوگیا؟ میں نہیں سمجھتا تھا کہ آدمی اتنی آسانی سے بدل سکتا ہے۔ سکھائی ہوئی اقدار کو اتنی آسانی سے ترک کرسکتا ہے۔''

حمید کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ ''پرمود، یہ مت سمجھو کہ میں نے اپنا برتاؤ آسانی سے بدل لیا۔ میرے دماغ میں کتنا طوفان مچا تھا، اس کا تمھیں کیا اندازہ؟ بہت اذیت سے گزرا ہوں۔ اب بھی کبھی کبھی میرے ذہن میں سخت کشمکش ہونے لگتی ہے۔ کسی ایک جگہ ٹکتا ہی نہیں۔ ایسے موقعوں پر یہ مجھے سنبھالتا ہے۔'' حمید نے جواد کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

حمید کے گھر سے لوٹتے ہوئے پرمود سوچ رہا تھا کہ اس نے عجیب بات کی۔ عقیل اور ابوفرید کو اس ملک کے بند دروازوں کی وجہ سے نامرادی کا سامنا کرنا پڑا؛ خود پرمود کو بھی اس بند دروازوں والے ملک میں گھٹن محسوس ہوتی ہے؛ اور حمید کو ان بند دروازوں سے تحفظ کا احساس ہوتا ہے! جو زنجیریں باقی سب کو قید میں رکھتی ہیں وہی اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ چلتے چلتے پرمود کو حمید کی بیوی کا خیال آیا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوتے ہوئے بھی پرمود اس کا چہرہ تصور میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تبھی اسے یاد آیا کہ اس نے حمید کے گھر سے نکلتے وقت جواد سے ہاتھ ملایا تھا۔ اس کا ہاتھ نرم اور گرم تھا۔

-

جواین کا اگلا خط آیا تو وہ تہران میں تھی۔ امریکہ سے نکلتے وقت ہی اسے پرمود کا خط ملا تھا۔ جواین نے لکھا تھا کہ ایران میں شاہ کے خلاف بڑی تحریک چل رہی ہے۔ لوگ غیر مطمئن ہیں اور ماحول تپ رہا ہے۔ ایسے حالات میں وہاں زیادہ دن ٹھہرنے کے بجائے ہندوستان جانا اسے بہتر معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے والد کو بھی ایران میں زیادہ دیر رہنے کی خواہش نہیں تھی، لیکن ان کا کچھ عرصے وہاں رکنا ضروری تھا۔ بمبئی جانے پر جواین کی آمادگی کا پتا چلتے ہی پرمود نے جہاز کے ٹکٹ وغیرہ کا انتظام کر کے اسے ٹیلیگرام بھیج دیا۔ دو دن بعد اس کا بھی ٹیلیگرام آ گیا۔ چھٹیوں کا پروگرام طے ہوگیا۔

امتحان شروع ہوئے۔ سوالوں کے جواب لکھتے طالب علموں کی نگرانی کرتے ہوئے کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکر لگانے کا اکتا دینے والا کام شروع ہوگیا۔ ابھی امتحان ختم نہیں ہوئے تھے کہ

ایک کورس کی کاپیاں اس کے پاس جانچ کے لیے آ گئیں۔ گھر کا سارا وقت کاپیاں جانچنے میں گزرنے لگا۔ ایک روز شام کو پرمود اسی کام میں مصروف تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ایک عراقی کھڑا تھا۔ انگریزی اچھی بول رہا تھا۔ اندر آ کر بیٹھتے ہی اس نے کہا، ''میں انڈین کونسلیٹ سے آیا ہوں۔ کونسل صاحب نے آپ کو ملاقات کے لیے بلایا ہے۔ دو تین بار انھوں نے کالج میں آپ کو فون کیا۔ لیکن آپ نہیں ملے۔ اس لیے آپ کا پتا ڈھونڈ کر مجھے بھیجا ہے۔''

ملاقات کا مقصد دریافت کیا تو اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد پرمود بیٹھا سوچتا رہا۔ خود کونسل نے اپنا آدمی بھیج کر بلوایا تھا، یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ ایسا کون سا اہم کام ہوگا؟ کیا وہ انجانے میں کسی مشکل میں پھنس گیا ہے؟ اس کا کوئی سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پرمود کچھ بے چین ہوا تھا۔ وہ ہر طرح کے اہلکاروں سے ممکنہ حد تک دور رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ کونسل کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ شروع میں جب پرمود انڈین کلب میں جاتا تھا تب اس نے اس کے بارے میں سنا تھا۔ معلوم ہوا کہ کونسل یوں کلب میں آیا کرتا تھا، لیکن ان دنوں وہ جگر کی بیماری میں مبتلا تھا۔ اس کے بعد پرمود کا شاذ ہی کبھی انڈین کلب جانا ہوا ہوگا۔

دوسرے دن صبح پرمود کونسلیٹ میں حاضر ہوا۔

''آیئے آیئے پروفیسر صاحب!'' کونسل نے کرسی سے اٹھ کر ہاتھ بڑھا کر بڑے تپاک سے اپنے وسیع کمرے میں اس کا سواگت کیا۔ ''آپ کو آج تک دیکھا کیسے نہیں؟'' کونسل نے حیرانی کا اظہار کیا۔ ''میں یہاں کے تقریباً سارے ہی ہندوستانی پروفیسروں سے واقف ہوں۔''

''میں انڈین کلب میں زیادہ جاتا نہیں، شاید اس لیے ہمارا تعارف نہیں ہوا،'' پرمود نے کہا۔

''اچھا، ٹھیک!'' کونسل بولا۔ ''چلیے آج تو تعارف ہو گیا، یہ اچھا ہوا۔ ارے بھئی، پیپسی لاؤ!''

کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کونسل نے کہا، ''سنا ہے آپ فرسٹ ایر کو کمپوزیشن کا کورس پڑھاتے ہیں۔''

''جی،'' پرمود نے کہا۔ وہ ان دنوں اسی کورس کی کاپیاں جانچ رہا تھا۔

''بات یہ ہے،'' کونسل کی پاٹ دار پنجابی آواز اب ذرا نیچے سُر میں آ گئی، ''آپ کے اس

کورس میں ایک لڑکا ہے۔'' کونسل نے ایک چٹھی اس کے سامنے رکھی۔ ''یہاں کے نیول کمانڈر کا بیٹا ہے۔ اس نے اپنے باپ کو بتایا کہ اس کا پرچہ بہت خراب ہوا ہے۔۔'' کونسل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''لیجیے، پیپسی لیجیے!''

''تو پھر؟'' پیپسی کا گھونٹ لے کر پرمود بولا۔

''مسئلہ یہ ہے، پروفیسر صاحب ــ میں آپ سے درخواست نہ کرتا؛ جانتا ہوں یہ اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ ذرا اسپیشل سچویشن ہے! دراصل بات یہ ہے، انھیں یہاں ایک نیول اکیڈمی بنانی ہے۔ ہم انڈیا کی طرف سے یہ کنٹریکٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو اب اس نیول کمانڈر کی خوشنودی تو چاہیے ہوگی نا؟ اس نے خود مجھے فون کر کے آپ کے اس کورس کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے کہا، دیکھتا ہوں کیا کیا جا سکتا ہے۔ سمجھے آپ؟''

''یعنی آپ چاہتے ہیں میں اس لڑکے کو پاس کر دوں؟'' ہاتھ میں پکڑی چٹھی کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے پرمود نے کہا۔

''میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا پروفیسر صاحب، کہ یہ ٹھیک بات نہیں ہے! ویسے تو میں خود بھی ایسی بات کبھی نہیں مانوں گا۔ لیکن یہاں کے جو حالات ہیں وہ تو آپ کو معلوم ہی ہیں ــ ہمارے ملک کے مفاد کا سوال ہے۔ اس نیول اکیڈمی کا کنٹریکٹ ہمیں ضرور ملنا چاہیے۔ کمانڈر کو اوبلائج کرنے سے ہمارے چانسز یقینی طور پر بہت اچھے ہو جائیں گے۔ آیا آپ کی سمجھ میں؟''

''آ گیا،'' پرمود آہستہ سے بولا۔

''تو آپ یہ کام کر دیں گے؟''

کچھ لمحے خاموش رہ کر پرمود بولا، ''میں اس طرح کا کام کرنے پر کبھی راضی نہ ہوتا؛ لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ اپنے ملک کے بھلے کے لیے یہ ضروری ہے تو مجھے انکار کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں ــ''

''ویری گڈ! میں لڑکے کو کہلوا دوں گا کہ آپ سے آ کر مل لے۔'' پھر کرسی سے اٹھ کر پرمود سے ہاتھ ملاتے ہوئے کونسل نے کہا، ''کبھی شام کے وقت آیئے ادھر! ڈرنک کا پروگرام رہے۔''

کونسلیٹ سے کالج جاتے ہوئے پرمود اس بارے میں سوچتا رہا۔ یہ ایک عجیب وغریب اور

کوفت میں مبتلا کرنے والی صورت حال تھی۔ وہ پیسے وغیرہ کے لیے کبھی ایسا کام نہ کرتا۔ لیکن یہاں ایک الگ ہی معاملہ درپیش تھا — ملک کا مفاد! حب الوطنی اور اخلاقیات میں سے کس کو اولیت دی جائے؟ بلاشبہ ایسے سوالوں پر اپنے دماغ کو تھکانے سے پرمود کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ کونسل کا اصرار ہے تو کر ڈالتا ہوں، یہ سوچ کر اس نے معاملے کو یہیں چھوڑ دیا۔ امتحان کی کاپیوں پر نام نہیں تھے؛ جانچ کے لیے بھیجنے سے پہلے ان پر خفیہ نمبر ڈالے جاتے تھے۔ اس لیے اس طالب علم کو گھر پر بلانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کاپیوں کا پلندا اس کے سامنے رکھ کر پرمود نے اس سے اپنی کاپی تلاش کرنے کو کہا۔ اس احمق کو اسی میں خاصی دیر لگ گئی۔ پرمود نے کاپی پر نظر ڈالی۔ بیٹا جی نے کاپی میں مشکل ہی سے کچھ لکھا تھا۔ چار میں صرف دو سوالوں کے نہایت مختصر جواب دیے تھے۔ اب اس گھامڑ کے نمبر کیسے بڑھائے جائیں۔ آخر پرمود نے اسے کسی اور طالب علم کی کاپی میں سے ایک اور سوال کا جواب نقل کرنے کو کہا۔

اس پورے معاملے کے دوران پرمود خود کو کوستا رہا۔ ایسا گندا کام کرنے پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ اسے کبھی گمان تک نہ ہوا تھا کہ "ملک کی خاطر" اسے کبھی ایسا کام بھی کرنا پڑے گا۔

چھٹیاں شروع ہونے میں صرف تین دن باقی تھے؛ لیکن اسے ان کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ سامان باندھنا بھی باقی تھا۔ پرمود کاپیاں جانچنے میں بری طرح مصروف تھا۔ امتحان ختم ہوتے ہوتے دو اور کورسوں کی کاپیاں بھی اس کے پاس آ گئی تھیں۔ اگر چھٹیوں کے کچھ دن اسے یہیں گزارنے ہوتے تو انھیں آرام سے جانچ کر دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ اسے چھٹیاں شروع ہوتے ہی روانہ ہونا تھا اس لیے اس سے پہلے ان سب کاپیوں کو نمٹا کر مارکس شیٹس جمع کرانا ضروری تھا۔ سو وہ دن رات اس کام میں لگا رہتا۔ پاس رکھا ریڈیو بھی مسلسل چلتا رہتا تھا۔ کاپیاں جانچتے وقت ریڈیو پر گانے سننا اچھا لگتا تھا۔ اس کے علاوہ پرمود خبروں سے آگاہ رہنا چاہتا تھا۔ بی بی سی کا نیوز بلیٹن وہ غور سے سنتا۔ ایران کے ہنگامے بڑھ رہے تھے۔ بہت سے لوگ ملک چھوڑ کر جا رہے تھے۔ جہاز پکڑ کر بروقت نکل جانے والوں کی بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ پرمود کو فکر لگ گئی کہ اگر ایسے حالات میں جوائن کی فلائٹ منسوخ ہو گئی یا وہ وہیں پھنسی رہ گئی اور بمبئی نہ جا سکی تو سب تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے

وہ ریڈیو سے کان لگائے تہران کے حالات پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

شام کو کچھ دیر آرام کر کے پرمود پھر کاپیوں کا ڈھیر لے کر بیٹھ گیا۔ سات بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجی۔ اب کون وقت خراب کرنے آ گیا، اس جھنجلاہٹ کے ساتھ پرمود نے دروازہ کھولا۔ فرانسوا تھا۔ پرمود نے ہیلو وغیرہ کہہ کے اسے اندر بلایا۔ فرانسوا کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا؛ چہرہ کھنچا ہوا اور گمبھیر تھا۔ اس کا موڈ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

''کیوں، تم نے اپنی کاپیاں ختم کر لیں؟'' پرمود نے کچھ ضرورت سے زیادہ بشاش لہجے میں پوچھا۔ ''چھٹیوں کی تیاری ہو گئی؟''

''چھٹیوں کا معاملہ ہی ٹھپ ہو گیا،'' چہرے کے کھنچاؤ کو جوں کا توں رکھتے ہوئے فرانسوا بولا۔

''کیا مطلب؟''

''چھٹیوں کا معاملہ ہی ٹھپ ہو گیا،'' اس نے اسی دھیمے پتھریلے لہجے میں دہرایا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہوا کیا؟''

لائٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے فرانسوا نے کہا، ''بغداد میں عرب ملکوں کے خارجہ وزیروں کی کانفرنس ہے، تمھیں معلوم ہے نا؟''

''ہاں۔ مصری صدر سادات کے اسرائیل کے ساتھ سمجھوتے کی مخالفت کے سلسلے میں، ہے نا؟ میں نے سنا ہے اس کانفرنس کے بارے میں۔''

''کانفرنس کل سے شروع ہو رہی ہے — اور آج سے بغداد ایرپورٹ بند۔ دس دن کے لیے بند!''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' پرمود زور سے بولا۔

ہونٹوں میں سگریٹ اٹکائے، پتھریلا چہرہ لیے فرانسوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ''مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟'' پرمود نے پوچھا۔

''ابھی شام کو ٹریول ایجنٹ نے مجھے بتایا ہے۔ دس دن کے لیے ایرپورٹ بند!''

''یہ سب کیا ہے؟ یعنی پورا ایرپورٹ ہی بند؟ یعنی جہاز آنا بھی بند اور جانا بھی؟ یعنی دس دن کے لیے تمام ایرلائنز کی ساری فلائٹس کینسل؟''

Scanned with CamScanner

''بالکل!'' ہونٹوں میں دبے سگریٹ کو ہاتھ لگائے بغیر فرانسوا نے کہا۔

''او ڈیم!'' کہہ کر پرمود کچھ دیر کے لیے چپ رہ گیا۔ پھر بولا، ''یہ تو بھیانک بات ہے۔ یعنی چھٹیاں یہیں گزارنی پڑیں گی؟''

''تمھیں بتایا تو — چھٹیوں کا معاملہ ہی ٹھپ ہو گیا۔''

''لیکن آخر کیوں؟ جہازوں کو جانے دینے میں ان کا کیا بگڑتا ہے؟ کم از کم کچھ جہازوں کو تو جانے دے سکتے ہیں۔''

''سکیورٹی! انھیں مکمل سکیورٹی چاہیے۔ اتنے سارے وزرائے خارجہ آئیں گے، جائیں گے — کوئی کہیں بم وغیرہ رکھ دے تو صورت حال خراب ہو جائے گی۔ جہازوں کو آنے جانے دیا گیا تو سب لوگوں کی چیکنگ کرنا مشکل ہو گا۔ اس لیے انھوں نے باقی سب کے لیے ایرپورٹ ہی بند کر دیا!''

''ہونہہ! یہ تو بھیانک بات ہے! تمھیں بیروت جانا تھا، مجھے بمبئی جانا تھا —''

ہونٹوں میں سے سگریٹ نکال کر فرانسوا نے راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی اور سگریٹ پھر سے ہونٹوں میں اٹکا لیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بائیں ہتھیلی پر داہنے ہاتھ کی مٹھی زور سے ماری اور کمرے میں بے چینی سے کئی چکر لگائے۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر اس نے فرانسیسی میں گالی دی، ''میرد!'' (Merde!)

پرمود اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اب بمبئی جانا ممکن نہیں ہو گا، یہ اسے معلوم ہو گیا تھا۔ اُدھر جواین پروگرام کے مطابق بمبئی پہنچ جائے گی۔ اب دو دن میں اسے کس طرح اطلاع دی جائے۔

''سڑک کے راستے ملک سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہے کیا؟'' پرمود ایک دم بولا۔

''میں نے اس بارے میں سوچا تھا۔ بغداد سے شام اور وہاں سے لبنان جا سکتے ہیں۔ لمبا راستہ ہے۔ بیروت تک بس نہیں جاتی؛ کار سے جانا پڑتا ہے۔ میری کار کمبخت اچھی کنڈیشن میں نہیں ہے۔ اتنا لمبا راستہ طے نہیں کر سکے گی۔ اسے مرمت کے لیے دے کر جانے والا تھا۔'' لمبا کش لے کر فرانسوا نے سگریٹ بجھایا اور بولا، ''دوسرا راستہ کویت کا ہے۔ یہاں سے کویت کوئی سو کلومیٹر دور ہے۔ وہاں جا کر جہاز پکڑ سکتے ہیں۔ لیکن کویت کا ویزا ملنا بہت مشکل ہے۔ یونیورسٹی سے سفارشی خط

وغیرہ لے جانا پڑتا ہے۔ یہ سب مرحلے طے کرنے میں آدھی چھٹیاں گزر جائیں گی۔ پہلے معلوم ہوتا تو وہاں کا ویزا لے کر رکھتے۔ لیکن اب دیر ہوگئی ہے۔''

فرانسوا نے دوسری سگریٹ سلگائی اور اس دوران پرمود نے کہا، ''اور ایران؟ یہاں سے ایران کی سرحد تو قریب پڑتی ہے۔''

''ہاں، ایران تو برابر ہی میں ہے۔ دریا پار کر کے آدھ گھنٹے کی مسافت پر ابادان ہے۔ لیکن آج کل ایران میں زبردست گڑبڑ ہے۔ ویزا نہیں ملے گا، اور سرحد بھی میرے خیال سے بند ہوگئی ہے۔''

''یعنی باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔''

''چھٹیوں کا معاملہ ہی ٹھپ ہوگیا!''

فرانسوا کے جانے کے بعد پرمود نے پھر سے کاپیاں اٹھائیں؛ لیکن اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ کاپیاں جلدی جلدی پوری کرنے کی اب ضرورت بھی کیا تھی۔ اصل میں کاپیاں تقریباً پوری ہی ہو چکی تھیں — اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ انھیں جلدی میں نمٹانا بیکار ہی گیا۔ اس کی دوڑ دھوپ بے معنی ثابت ہوئی تھی۔

باقی سب تو ٹھیک ہے، لیکن جواین کو کس طرح اطلاع دی جائے۔ یہ ایک فوری اور اہم سوال تھا۔ جواین اگر اکیلی بمبئی پہنچے گی تو عجیب صورت حال ہوگی۔ میں نے ہی اسے بمبئی بلایا اور میں ہی وہاں موجود نہیں، اس پر اسے کتنا غصہ آئے گا۔

ٹیلیگرام بھیجوں؟ لیکن ایران کے جو حالات ہیں ان میں ٹیلیگرام نہ جانے کب پہنچے۔ پہنچے گا بھی یا نہیں — یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اچانک پرمود کو یاد آیا؛ جواین نے تہران سے اپنے باپ کے لیٹر ہیڈ پر خط لکھا تھا جس پر اس کے گھر کا فون نمبر تھا۔ اس کو فون کر دوں۔ کم از کم کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

دوسرے دن صبح پرمود کو کالج جانا تھا۔ دوپہر کو کالج سے نکل کر وہ سنٹرل پوسٹ آفس گیا۔ اس نے تہران کی کال بک کرائی۔ آپریٹر نے کہا، ''اتنی جلدی نہیں ملے گی۔ شام کو سات بجے آنا۔''

سات بجے پرمود پھر پوسٹ آفس پہنچا۔ بنچوں پر بیٹھے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ نو بج گئے۔ پھر دس بجنے کو ہوے۔ جھنجھلائے ہوے چہرے کے ساتھ پرمود بار بار آپریٹر سے پوچھتا رہا۔ آپریٹر

Scanned with CamScanner

نے کہا، ''تہران کی لائن نہیں مل رہی۔ بہت سے لوگ تہران سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔'' آخر سوا دس بجے آپریٹر نے کہا، ''اب کوئی چانس نہیں۔ کل صبح آنا۔'' اکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ پرمود گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بدھ کا دن گزر چکا تھا۔ اگلے دن جمعرات تھی۔ جمعے کے دن جواین کو تہران سے روانہ ہونا تھا۔ کل فون لگ گیا تو ٹھیک، ورنہ آگے آنے والے الجھاوے کو ٹالنے کا کوئی طریقہ نہیں۔

سونے سے پہلے پرمود نے بی بی سی پر گیارہ بجے کی خبریں لگائیں۔ ایران کے بارے میں سرخیوں میں بتایا گیا کہ سڑکوں پر بے تحاشا مجمع ہے اور ایر پورٹ پر زبردست افراتفری ہے۔ اور یہ بھی کہ ملک سے نکلنے والوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ افواہیں ہیں کہ خود شاہ بھی جلد ہی ایران سے جانے والا ہے۔ دوسرے دن صبح ہی پرمود پوسٹ آفس جا کر بیٹھ گیا۔ دوبارہ وہی اکتا دینے والا انتظار۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آپریٹر نے اس کا نام پکارا۔ بوتھ کا نمبر بتایا۔ پرمود تناؤ بھرے ذہن کے ساتھ بوتھ میں داخل ہوا۔

''ہیلو، کیا میں جواین سے بات کر سکتا ہوں؟''

''کون بول رہا ہے؟''

''کہیے پرمود ہے۔''

''ایک منٹ—''

کسی معمر امریکی عورت کی آواز تھی۔ اس کی ماں ہوگی۔

''ہیلو— جواین؟ ہائے جواین! میں پرمود۔''

''پرمود! ہائے پرمود! تم بول رہے ہو؟ کہاں سے؟ میں نے تمھیں کل ٹیلیگرام بھیجا تھا۔ وہ—''

''ہیلو... ہیلو...'' پرمود اونچی آواز میں بولا۔ جواین کی بات اسے ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لائن میں بہت کھڑکھڑاہٹ تھی۔ اس نے جواین سے اونچی آواز میں بولنے کو کہا۔ پھر اس نے اپنی کہانی سنائی۔ جواین بولی، ''ارے یہاں میری بھی یہی صورت حال ہو گئی ہے! یہاں ہر طرف کنفیوژن ہے۔ ایر پورٹ پر اتنی بھیڑ! وہاں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ سینکڑوں لوگ لندن اور پیرس

Scanned with CamScanner

جانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں، لیکن جہاز بڑی مشکل سے جا رہے ہیں۔ زیادہ تر فلائٹس پھنس گئی ہیں۔ میں نے سوچا، اب کیسے انڈیا جا سکتی ہوں! اس لیے میں نے کل تمھیں ٹیلیگرام بھیج دیا۔"

"لیکن اب تم کیا کرو گی تم؟"

"جب بھی ممکن ہوگا امریکہ لوٹ جاؤں گی۔ . . میرے والد بھی جلد ہی یہ ملک چھوڑ دیں گے۔ یہاں اب امریکیوں کا رہنا ممکن نہیں۔ بہت امریکہ مخالف ماحول ہے۔"

کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جواین نے پرمود سے پوچھا، "تمھارا کیا پروگرام ہے پرمود؟ گرمیوں میں امریکہ آؤ گے؟"

"دیکھتے ہیں، ابھی کچھ ٹھیک نہیں۔" دو چار باتیں کر کے اس نے "بائے" کہا۔

بوتھ سے باہر آ کر پرمود نے لمبا سانس لیا۔ بوتھ بند ہونے اور زور زور سے بولنے کی وجہ سے اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو گیا تھا۔ اس نے منھ پونچھا اور چل دیا۔ ذہن سے ایک بڑا تناؤ دور ہونے کے بعد اسے بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

چلتے چلتے پرمود کو جواین کے الفاظ یاد آتے رہے، اس کی آواز کانوں میں گونجتی رہی۔ اس کی وہ جانی پہچانی آواز سن کر اسے کتنا اچھا لگا تھا! اس کی وہ مخصوص آواز، مخصوص لہجہ — جس میں وہ 'آئی' کو 'آ' کہتی تھی! امریکہ میں اس کے اس تلفظ پر وہ کبھی کبھی اسے چھیڑتا تھا۔ وہ کہتی تھی، "میرے باقی لہجے میں جنوب کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ کسی کو شک بھی نہیں ہوتا کہ میں جنوب کی ہوں۔ لیکن یہ 'آئی' کا تلفظ بدلنا میرے بس سے باہر ہے — میں نے اس کی بہت کوشش کی لیکن نہ بدل سکی۔ میرا 'آ' اب تک جنوبی ہی ہے۔" فون پر سنے ہوئے اس کے لفظ پرمود اپنے ذہن میں دہراتا رہا۔ جواین سے سات آٹھ منٹ فون پر بات کرنے پر اسے افسوس ہو رہا تھا۔ اس سے روبرو ملاقات ہونی چاہیے تھی۔ پرمود کو اس سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ ان کا پروگرام اگر کامیاب رہتا تو اگلی شام وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔ مگر اب وہ سب بکھر چکا تھا۔

گھر آ کر پرمود پلنگ پر لیٹ رہا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ پچھلے ہفتے بھر رات دیر دیر تک بیٹھ کر کاپیاں جانچنے کی تھکن، اور پھر دو تین دن کا یہ تناؤ۔ شام کو وہ باہر کھانا کھا کر آیا۔ دس بجے بی بی سی کی خبریں سن کر وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے اگلے پندرہ دنوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ عام

حالات میں وہ کچھ لکھنے پڑھنے کا پروگرام بنالیتا، لیکن اب اسے اس سلسلے میں کوئی اشتیاق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بس پندرہ دن آرام کروں، سوتا رہوں۔ کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حال کیا برا ہے! یہاں کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ جواین اور تہران کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اُس پار ایران میں شاہ کا تخت ڈگمگا رہا ہے: اس نے خود سے یوں کہا جیسے شاہ کا تختِ طاؤس پلنگ کے ساتھ والی دیوار کے اُس طرف بچھا ہوا ہو۔ شاہ نے اپنی ماں کو پہلے ہی کیلیفورنیا بھیج دیا تھا؛ نوے سال کی ہٹی کٹی آریہ عورت۔ اس کی زندگی میں کیسے کیسے تجربے رہے ہوں گے۔ شان وشوکت، خدم وحشم۔ کہا جاتا ہے شاہ کا بیٹا یعنی ولی عہد ٹیکسس میں ہے۔ شاہ بھی جلد ہی ایران سے باہر چھٹیوں پر جانے والا ہے۔ اب اس کی باقی زندگی ملک سے باہر ہی گزرے گی۔ پیسہ بے شک اس کے پاس بے تحاشا ہوگا! پھر بھی مجموعی طور پر اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ شاید پیرس میں گردن میں مفلر لپیٹے بنچ پر بیٹھ کر کھوئی ہوئی حکومت کو یاد کیا کرے گا۔ ایسے ہی خیالات کے بہاؤ میں تیرتے ہوئے پرمود کو نیند آ گئی۔

اگلی صبح جاگنے کے بعد پرمود دیر تک پلنگ پر لیٹا رہا۔ نو ساڑھے نو بجے اچانک مکھرجی آیا۔
''واہ! تم یہیں ہو اب تک!'' مکھرجی نے کہا۔ ''میرا خیال تھا تم چھٹیوں پر چلے گئے ہو گے۔ میں تو صرف چانس لے کر آ گیا۔''

پرمود نے اپنے چھٹیوں پر نہ جانے کی وضاحت کی۔

''چلو، میرے ساتھ چلو،'' مکھرجی بولا۔ ''آج شرما کو گھر لانا ہے۔ ڈاکٹروں نے اجازت دے دی ہے۔ اس کا تھوڑا بہت سامان بھی لانا ہے وہاں سے۔ سوچا تمھاری مدد لے لوں۔''

''ارے واہ! شرما گھر آ رہا ہے! بہت خوب! آخر ٹھیک ہو ہی گیا بیچارہ۔'' پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے، مجرم سی آواز میں پرمود نے کہا، ''آئی ایم سوری، بہت دنوں سے شرما کی خبر لینے جا نہیں سکا۔ ایسی بات نہیں کہ اسے بھول گیا ہوں، لیکن بس اپنے کاموں میں پھنسا رہا۔۔۔''

مکھرجی نے پرمود کی معذرت پر دھیان نہیں دیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ اس کا ساتھی شرما گھر لوٹ رہا ہے۔ ''ڈاکٹر تو اس سے کہہ رہے تھے کہ ہفتہ بھر اور ہسپتال میں رہ کر آرام کر لو۔ شرما نے کہا، اب دو ہفتے چھٹیاں ہیں۔ گھر میں بھی آرام ہی کروں گا۔ ہسپتال میں ایک اور ہفتہ گزارنے کی

کیا ضرورت۔ آخر ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔''

مکھرجی کے ساتھ ہسپتال جاتے ہوئے پرمود سوچتا رہا، کیا کہانی ہے شرما کی! جب سے میں یہاں آیا ہوں، تقریباً اسی وقت سے ہسپتال میں پڑا ہے۔ میں نے یہاں اتنے دن گزارے، اتنے تجربے حاصل کیے، یہاں وہاں گھوما، اور اس تمام وقت یہ آدمی ہسپتال کے پلنگ پر پڑا رہا! میں نے اس کے بارے میں کبھی کچھ زیادہ سوچا تک نہیں۔ شرما گویا ذہن کے ایک کونے میں بے اعتنائی سے ڈالا ہوا اپنے ہی وجود کا ایک حصہ ہو، یہ مضطرب کرنے والا خیال پرمود کے ذہن سے گزرا۔

شرما اب ٹھیک دکھائی دے رہا تھا۔ بہت دبلا ہو گیا تھا لیکن چہرے پر تازگی تھی۔ گھر جانے کے تصور نے اس میں جوش بھر دیا تھا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں بھرنے میں مکھرجی اور پرمود کا ہاتھ بٹانے لگا۔ تینوں ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آ گئے۔ ٹیکسی سے اتر کر عمارت میں داخل ہوتے ہوئے شرما مسرور آواز میں چلایا، ''واہ! اس کھلی ہوا میں چلنا کتنا مزیدار ہے! ہسپتال کے بیڈ سے بندھے رہنے سے میں بیزار ہو گیا تھا۔ آخر جان چھوٹی ہسپتال کی بوؤں اور دواؤں، انجکشنوں اور ٹیسٹوں سے۔ آخر میں آزاد ہو ہی گیا! آئی ایم فری!''

پرمود کو شرما کی بات سن کر بہت لطف آیا۔ وہ کسی نئے نئے آزاد ہوئے ملک کی طرح اپنی آزادی کا جشن منا رہا تھا۔ ایک لحاظ سے پرمود کو اس پر رشک آیا۔ اِدھر میں یہاں پابند ہونے کی وجہ سے بیزار ہو رہا ہوں، اور اتنے دن پابندی میں جکڑا رہنے والا یہ آدمی اپنی آزادی پر خوش ہے۔

پرمود نے فرانسوا کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ فرانسوا کے دروازہ کھولتے ہی اندر بھرا ہوا سگریٹ کا دھواں پرمود کی ناک میں گھسا۔ کمرے میں کپڑے وغیرہ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر دونوں کچھ کہے بغیر بیٹھے رہے۔

''تو پھر اب کیا ہو؟'' پرمود بولا۔

''اب کیا ہو!''

پھر منٹ بھر کی خاموشی۔ پھر پرمود نے کہا، ''اس ملک میں کسی اور جگہ نہیں جا سکتے کیا؟''

''شمال کی پہاڑیوں میں جا سکتے ہیں۔ لیکن جاڑوں کے دن ہیں، وہاں سردی بہت ہو گی۔ اور

برف بھی۔ اس موسم میں وہاں جانا بیکار ہے۔'' پھر کچھ رک کر فرانسوا بولا، ''لیکن بغداد جانے میں کوئی حرج نہیں۔ بغداد کیوں نہیں جاتے تم؟''

کچھ دیر سوچ کر پرمود نے کہا، ''اس وقت بغداد جانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ پھر کبھی جا سکتے ہیں۔''

''میں کل بغداد جا رہا ہوں۔ فرانسیسی سفارت خانے میں کچھ کام ہے۔ دو دن میں لوٹ آؤں گا۔''

بیئر کا ایک کین ختم کرتے کرتے پرمود نے فرانسوا کے گھر آدھ گھنٹہ گزارا۔ پھر وہ باہر نکلا اور کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اس کے بعد دریا کنارے پہنچا۔ آج وہ یہاں بہت دنوں بعد آیا تھا۔ دریا کنارے کے راستے پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ ایک ریلنگ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پانی کو دیکھنے لگا۔

دریا میں کنارے کے پاس بیئر کے بہت سے خالی کین تیر رہے تھے۔ کین پر لال دائرے میں بیئر کا نام لکھا تھا: 'سوان لاگر'۔ شاید ان دنوں شہر میں اس بیئر کی بڑی مقدار درآمد کی گئی تھی۔ شہر میں بہت جگہوں پر اس کے کین پڑے دکھائی دیتے تھے۔ اچانک بیئر کے کسی مخصوص برانڈ کی لہر سی آ جاتی تھی، کبھی کوئی ولندیزی بیئر، کبھی چیک، کبھی فرانسیسی۔ ایک بار ایک جاپانی بیئر بھی آئی تھی! اگلے کچھ دن اسی بیئر کے خالی کین ہر جگہ پڑے نظر آیا کرتے۔ 'سوان لاگر' آسٹریلوی بیئر تھی۔ پانی میں ہچکولے کھاتے یہ خالی کین دیکھ کر اسے یاد آیا: ایک بار اس نے دریا کنارے کی تصویر والا پکچر پوسٹ کارڈ خریدا تھا؛ اس تصویر میں کنارے کے پاس ہنس تیر رہے تھے۔ پرمود نے یہاں کبھی ہنس نہیں دیکھے تھے۔ اسے خیال ہوا، شاید برسوں پہلے اس دریا کے کنارے پر ہنس ہوتے ہوں گے اور تصویر میں دکھائی دینے والے ہنس اُسی زمانے کے رہے ہوں گے۔ اب ہنس نہیں تھے، مگر ان کی جگہ کم از کم سوان لاگر کے چمکدار کین ہنسوں ہی کی طرح پانی پر تیر رہے تھے۔ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کو سینچنے والے اس دریا پر آسٹریلیا سے آئے ہوئے بیئر کے کین ہچکولے کھا رہے تھے۔

پرمود نظر اٹھا کر دور کھڑے ہوئے بہت بڑے غیر ملکی جہازوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پاس ہی ایک ریستوران میں مغربی گانے بج رہے تھے۔ بونی ایم کا بہت دفعہ سنا ہوا گانا:

By the rivers of Babylon
there we sat down;

Scanned with CamScanner

Yeah, we wept
When we remembered Zion.
Let the wicked
carry us away in captivity,
require from us a song:
Now how shall we sing the Lord's song
in a strange land?

پرمود کو خیال آیا، جو شخص اپنے وطن میں خدا کا نغمہ نہ گا سکا ہو، کسی دور کے ملک میں بھی نہ گا سکا ہو، وہ اس اجنبی سرزمین میں اسے کیونکر گا سکے گا؟

پرمود کو لگا کہ اس دریا کے پانی میں ایک دکھ، ایک افسوس سا تیر رہا ہے۔ بہت قدیم زمانے سے یہ اسی طرح ہے۔ وہ جھٹکے سے ریلنگ سے واپس مڑا۔

ابوفرید کی گرفتاری کے بعد جب سلوئی غیر متوقع طور پر چلی گئی، تب پرمود کو اپنے اندر جو خالی پن محسوس ہوا تھا، اس سے بھی بڑا خالی پن اسے اب محسوس ہو رہا تھا۔ صبح دوپہر شام رات، کسی بھی وقت باہر نکل کر وہ راستوں پر بھٹکتا رہتا۔ ایک بار یونہی گھومتا ہوا وہ ابوفرید کے گھر کے سامنے جا نکلا۔ باہر کا پھاٹک بند تھا۔ گھر کے سامنے لگے چھوٹے پودے سوکھے ہوئے سے لگ رہے تھے۔

ایک شام دریا کے پاس بڑی سڑک سے گزرتے ہوئے ایک ہندوستانی شخص نے پرمود کو روک لیا۔ وہ کچھ دیر تک بتا نہیں پایا کہ اسے کیا چاہیے۔ پرمود کو اندازہ ہو گیا کہ اسے بہت چڑھ چکی ہے۔ ''آپ کو کوئی پتا معلوم کرنا ہے؟ کسی دکان یا ہوٹل میں جانا ہے؟'' پرمود نے پوچھا۔ وہ کچھ ٹھیک سے بول نہیں رہا تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا... '' ایسا کچھ بدبداتا رہا۔ پرمود کے چہرے پر جھنجھلاہٹ جھلکنے لگی۔ کسی قدر حقارت کا تاثر بھی رہا ہوگا جسے شاید اس شخص نے محسوس کر لیا۔ پرمود سفید پوش انٹلکچوئل دکھائی دیتا تھا، اور وہ شخص نچلے طبقے کا معلوم ہوتا تھا۔ پرمود کی طرف ڈولتا ہوا چہرہ جھکا کر چڑھی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟''

''نہیں۔ کون؟''

''میں... میں سیکنڈ انجینئر ہوں،'' وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

Scanned with CamScanner

"واہ، بہت خوب!" پرمود نے کہا، "جہاز پر واپس جانے کا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں؟"

لیکن اس کا اتنی جلد جہاز پر واپس جانے کا ارادہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ کچھ لمحے اسی طرح گزرے۔ اس آدمی نے اپنے سامنے ہاتھ پھراتے، ہلکے سے ڈولتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا، "میری سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کیا ہے! میری سمجھ میں نہیں آتا..."

پرمود کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے جواب میں کیا کہے۔ کچھ دیر میں اسے اندازہ ہوا کہ اس آدمی کو کسی چیز کی خاص ضرورت نہیں ہے؛ اسے صرف کمپنی چاہیے، کوئی بات کرنے والا چاہیے۔ پردیس کے اس شہر میں جہاز سے اتر کر گھومتے ہوئے اس کے لیے اکیلاپن ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اسے کوئی ایسی چیز درکار تھی جو شراب اور ویشیاؤں سے نہیں مل سکتی تھی۔ پرمود اسے ہندوستانی دکھائی دیا اس لیے اسے روک لیا۔

کچھ منٹ پرمود اس سے بات کرتا، یعنی بولنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جلد ہی اسے بے چینی ہونے لگی۔ وہ اس شخص کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ ظاہر ہے یہ پھر کسی شراب خانے میں جانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے ساتھ جا کر پینا، باتیں کرنا، اِدھر اُدھر گھومنا، بہت دیر تک وقت کاٹنا— پرمود خود کو اتنا نہیں الجھانا چاہتا تھا۔ خود اسے کمپنی کی خواہش نہیں تھی؛ وہ گھر جا کر آرام سے لیٹنا چاہتا تھا۔

وہ شخص کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پرمود نے جلدی سے کہا، "سوری، اب مجھے جانا ہے، دیر ہو رہی ہے۔" وہ ابھی ہوا میں ہاتھ لہرا رہا تھا کہ پرمود تیزی سے چل دیا۔ پیچھے سے پکارنے کی آواز سن کر بھی اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس سے دور جاتے ہوئے پرمود خود کو مجرم سا محسوس کرنے لگا۔ پرمود اس خیال سے بلاوجہ جلدی جلدی چلتا رہا کہ اس آدمی کا اکیلاپن بھوت کی طرح اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ پھر بھی اس کے کہے ہوئے لفظ پرمود کے ذہن میں ابھرتے رہے: "میری سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کیا ہے..."

اس کے بعد بارشیں ہوئیں اور کیچڑ پھیل گئی تو پرمود پورا دن گھر بیٹھ کر گزارنے لگا۔ دن بھر بیٹھا ریڈیو سنتا رہتا۔ بی بی سی پر ہر گھنٹے کی خبریں؛ وہی سرخیاں تھوڑے بہت فرق سے دہرائی جاتیں۔ خبروں کے آخر میں معمول کا جملہ: اینڈ دیٹس دی اینڈ آف دَ ورلڈ نیوز۔ پرمود کو ہر بار لگتا کہ خبریں پڑھنے والا "ورلڈ" کے لفظ پر جملہ ختم کر دے گا۔ رات سوا گیارہ بجے اندھیرے میں پلنگ پر لیٹے

ہوے خبریں سنتے ہوے جب خبریں پڑھنے والے ''اینڈ دیٹس دی اینڈ آف دَ ورلڈ!..'' کہا تو پرمود نے ''نیوز'' کا لفظ آنے سے پہلے ہی کھٹ سے ریڈیو بند کر کے آنکھیں موند لیں۔

''MY TOYOTA IS FANTASTIC'' ٹیکسی کے پچھلے کانچ پر لال حرفوں میں یہ پٹی چپکی ہوئی تھی۔ ان دنوں بہت سی ٹیکسیوں پر یہ الفاظ دکھائی دیتے تھے۔ دراصل یہ ٹیکسیاں پرانے امریکی ماڈلوں کی تھیں؛ ان پر جاپانی ٹویوٹا کار کا یہ اشتہار لغو اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ اشتہار کی پٹیاں مفت میں ملتی تھیں، شاید اس لیے ٹیکسی والوں نے انھیں چپکا لیا تھا۔ ان پڑھ ٹیکسی والوں میں انگریزی کی بو تک نہ تھی، اس لیے انھیں اس سے کچھ لینا دینا نہ تھا کہ ان پر کیا لکھا ہے۔ یہ پٹیاں انھیں ایک طرح کی سجاوٹ لگتی تھیں۔ ایک ٹیکسی کے کانچ پر پرمود کو یہ پٹی سر کے بل چپکی دکھائی دی۔

نکڑ پر ایک سگریٹ والے کے پاس رک کر پرمود نے ایک پیپسی کولا خریدا۔ پیپسی پیتے ہوے وہ دکان کے سامنے کھڑا رہا۔ دوپہر کا وقت تھا اور راستہ سنسان تھا۔ دکان کے سامنے سڑک کے کچھ حصے میں پیپسی کی بوتلوں کے ٹین کے ڈھکن بکھرے ہوے تھے۔ بہت دن پہلے کے پڑے ہوے وہ ڈھکن کاروں کے پہیوں کے تلے آنے کی وجہ سے دوپہر میں نرم پڑ جانے والے سڑک کے کولتار میں دھنس گئے تھے۔ اب زیادہ تر ڈھکنوں کا صرف اوپر والا سپاٹ حصہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ کسی کسی ڈھکن کا دندانے دار حصہ بھی نظر آتا تھا لیکن بہت کم۔ دوپہر کی دھوپ میں سڑک کے کولتار کے پس منظر میں ان ڈھکنوں کی چمک نمایاں تھی۔ گاڑیوں کے ٹائروں تلے یہ ڈھکن روز بروز دبتے جانے والے، دب کر غائب ہو جانے والے تھے۔

فرانسوا کی بغداد سے واپسی کے بعد وہ اور پرمود اکٹھے اِدھر اُدھر وقت گزارنے لگے۔ ایک دو بار وہ فرانسوا کی گاڑی میں شہر کے باہر چکر لگا آئے۔ ایک بار فرانسوا نے کہا:

''کیا خیال ہے، نرسلوں کے علاقے کی سیر کی جائے؟''

''نہیں،'' پرمود نے کہا۔ ''مجھے وہاں نہیں جانا ہے۔''

Scanned with CamScanner

''کیوں؟ ایک بار طوفان میں پھنس گئے تو ڈرنے لگے؟''

''نہیں، ڈرنے کی بات نہیں۔ بس وہاں جانے کو جی نہیں کرتا۔''

فرانسوا کے ساتھ ایک بار ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے پرمود نے پاس رکھا ہوا بغداد آبزرور کا شمارہ اٹھا لیا۔ اس کی ورق گردانی میں اس نے دیکھا ''آج کی پروازیں'' کا کالم ہمیشہ کی طرح موجود ہے۔ جانے اور آنے والی فلائٹس کے اوقات ہمیشہ کی طرح باقاعدہ چھپے ہوئے تھے۔ یہ صفحہ فرانسوا کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے پرمود نے کہا، ''یہ دیکھو، ایرپورٹ پر ایک بھی جہاز آ جا نہیں رہا، اور یہاں سب پروازوں کے اوقات چھاپ رکھے ہیں جیسے سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہو!'' فرانسوا نے اخبار پر نظر ڈال کر زور سے سگریٹ کا دھواں نکالا اور کندھے اچکائے۔

ایک شام جب دونوں اس پر غور کر رہے تھے کہ کیا کیا جائے، پرمود نے تجویز پیش کی، ''کیوں نہ آج چل کر کیبرے دیکھا جائے۔''

فرانسوا نے ناک چڑھائی۔ ''یہاں کے کیبرے میں کیا رکھا ہے!''

''اس کی کیا فکر کرنا! ہم اس لیے تھوڑا ہی جا رہے ہیں کہ کیبرے بہت اچھا ہوگا! ہم تو بس ایک مختلف جگہ وقت گزارنے کے خیال سے جا رہے ہیں۔ یوں بھی یہاں اور کرنے کو ہے کیا؟''

''کیبرے دیکھنا ہو تو بیروت میں دیکھو۔ کیا زبردست کیبرے ہوتا ہے وہاں!''

''اب بس بھی کرو بیروت بیروت! بیروت کی تو واٹ لگ گئی نا! اب ہمیں صرف یہ سوچنا چاہیے کہ یہاں کیا کیا جا سکتا ہے۔''

پھر فرانسوا راضی ہو گیا۔ اس نے گاڑی نکالی۔ جس کیبرے میں پرمود پہلے عقیل کے ساتھ گیا تھا، اسی کی طرف فرانسوا نے گاڑی موڑ لی۔ یہی کچھ غنیمت کیبرے تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت پرمود کو عقیل کی یاد آئی۔ آج عقیل نہیں تھا!

پچھلی بار عقیل اور پرمود گرمیاں ختم ہونے سے پہلے آئے تھے، اس لیے کیبرے باہر کھلے میں ہو رہا تھا۔ اب جاڑوں میں کیبرے انڈر ہال میں منتقل ہو گیا تھا۔ ہال خاصا بڑا تھا لیکن بہت ساری میزیں رکھی جانے کی وجہ سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ اسٹیج کے سامنے کی طرف اوپر گیلری تھی۔ فرانسوا نے کہا، گیلری میں چلتے ہیں۔ دونوں اوپر چلے گئے۔ گیلری میں ہر میز کے گرد چھوٹے پارٹیشن لگا کر باکس

بنائے گئے تھے۔ ریلنگ کے پاس کی میز سے نیچے کا منظر اچھا دکھائی دیتا تھا۔ اسٹیج پر ابھی کوئی ہلچل نہیں تھی۔ نیچے کی میزیں زیادہ تر بھر چکی تھیں۔ لوگ سگریٹ پیتے، بیئر کی بوتلیں سامنے رکھے انتظار کر رہے تھے۔

پھر اسٹیج پر قطار میں لگائی گئی کرسیوں پر سازندے آ کر بیٹھے۔ ان میں پرمود نے اس اندھے آدمی کو پہچان لیا جسے پچھلی بار دیکھا تھا۔ اندھا سازندہ گردن اوپر اٹھائے اپنے ساز کو سہلا رہا تھا۔ پرمود کو یوں لگا جیسے وہ اس کی طرف 'دیکھ' رہا ہے۔

اسٹیج پر ساز بجنے شروع ہوئے ہی تھے کہ پرمود کا دھیان ایک جوڑے کی طرف گیا جو زینہ چڑھ کر ابھی اوپر پہنچا تھا۔ "ڈاکٹر کیمرون!" پرمود کرسی سے اٹھ کر بولا۔ کیمرون جس سے ماریا کے گھر پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی، وہ یہاں اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ دونوں سے ہاتھ ملا کر پرمود نے فرانسوا سے ان کا تعارف کرایا۔ "ہمارے ساتھ بیٹھیے،" پرمود نے کہا۔ پرمود اپنی کرسی چھوڑ کر فرانسوا کے برابر میں آ بیٹھا اور سامنے کی دونوں کرسیاں کیمرون اور اس کی بیوی کو پیش کیں۔

"آپ کو یہاں دیکھنے کی توقع نہیں تھی،" پرمود نے کیمرون سے کہا۔

ادھیڑ عمر کیمرون ہنس کر بولا، "مجھے یہاں کی سماجی زندگی سے دلچسپی ہے؛ لوگوں کے رہن سہن، تفریح وغیرہ کے طریقوں سے۔ سوچا ایک بار کیمرے تھیٹر میں جا کر دیکھا جائے کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ میری بیوی یہاں آنے کو راضی نہیں تھی۔ میں نے کہا، تھوڑی دیر بیٹھ کر دیکھیں گے اور باہر نکل آئیں گے۔" ویٹر کی لائی ہوئی بیئر کا گھونٹ لے کر اس نے کہا، "اس کے علاوہ چھٹیوں میں یہاں کرنے کو ہے بھی کیا۔"

"باہر کہیں نہیں گئے؟"

"ہمارا سوئٹزرلینڈ جانے کا پروگرام تھا، اسکی انگ کے لیے۔ لیکن اچانک ساری فلائٹس کینسل ہو گئیں تو سب دھرا رہ گیا۔"

"یعنی آپ کے ساتھ بھی ہمارے جیسا معاملہ ہوا۔"

کیمرون کی سوئس بیوی سے فرانسوا کی خوب گھٹ رہی تھی۔ وہ فرانسیسی جانتی تھی اس لیے بات چیت روانی سے ہو رہی تھی۔ مسز کیمرون ریلنگ کے پاس بیٹھی تھی اور نیچے بیٹھے ہوئے کچھ لوگ گردن

Scanned with CamScanner

اٹھا اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے تھے۔ پرمود نے کیمرون سے کہا، ''آپ کی بیوی کے بارے میں لوگوں کو تجسس ہو رہا ہے۔ یہاں عورتیں نہیں آتیں ۔۔ یعنی 'اچھی' عورتیں!''

''مجھے اندازہ تھا اس بات کا،'' کیمرون بولا۔ ''جب ہم اندر آئے تو سب کی نظریں ہماری طرف مڑ گئی تھیں۔ مگر وہ ٹھیک ہے۔ غیر ملکی لوگوں کو ہمیشہ تھوڑا بہت لائسنس دے دیا جاتا ہے!''

مسز کیمرون تماشبینوں میں اکیلی عورت تھی۔ تیز میک اپ کیے اور اشتعال انگیز لباس پہنے کمرے کی جو عورتیں تماشبینوں میں چل پھر رہی تھیں ان کی بات الگ تھی۔

شو شروع ہوا۔ کچھ منٹ کے لیے بات چیت میں وقفہ آ گیا۔ پرمود کو محسوس ہوا کہ ہال میں سگریٹ کا دھواں بھر گیا ہے۔ ماحول پر گھٹن سی چھا گئی۔

پرمود کیمرون سے اس کے تجربات کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کیمرون بہت ملکوں میں گھومتا پھرتا اور رہتا آیا ہے اس لیے اس کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ باتوں کے دوران کیمرون نے کہا، ''بہت سے ملکوں میں اسی طرح کے حالات ہیں جیسے یہاں ہیں۔ بس یہاں ان کی شدت کچھ زیادہ ہے! ہر طرف انسان کی آزادی پر قدغنیں ہیں۔''

''سچ ہے،'' پرمود نے کہا۔ ''لیکن ذرا سوچیے ڈاکٹر کیمرون، اگر اتنا سخت کنٹرول نہ رکھا جاتا، ہاتھ ذرا نرم رکھا جاتا تو کیا ہوتا؟''

''آپ کا کیا خیال ہے؟''

''باقی گروپ بھی تاک میں ہیں ۔۔ کمیونسٹ ہیں، شدت پسند مذہبی ہیں۔ وہ موقع پاتے ہی اُبھر آتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہاں انتشار نہ پھیل جاتا؟''

''سوچنے کی بات ہے۔''

''یہاں ہم اس بات پر پریشان ہیں کہ اتنی سخت سکیورٹی کے نتیجے میں بغداد ایرپورٹ بند ہو گیا ہے۔ لیکن تہران میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں بھی ایرپورٹ بند ہے۔ لوگ شاہ کی سخت گرفت توڑ کر باہر نکل رہے ہیں، بغیر کسی رکاوٹ کے ہجوموں کی شکل میں گھوم رہے ہیں، آزادی کی ہوا میں سانس لے رہے ہیں ۔۔ لیکن ان کی آزادی کے نتیجے میں انتشار پھیل گیا ہے۔ لہٰذا دوسروں کے لیے ایرپورٹ بند! دونوں ہمسایہ ملکوں کے دارالحکومتوں کے ایرپورٹ بند ہیں، لیکن بالکل متضاد وجوہ سے۔''

کیمرون کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا، ''بات تو ٹھیک ہے، لیکن کیا کیا جائے؟''

''ہاں، کیا کیا جائے؟ لوگ کیا کریں؟'' پرمود جیسے اپنے آپ سے بولا۔ اس نے گردن گھما کر نیچے اسٹیج کی طرف دیکھا۔ رقاصہ رقص ختم کر کے اندر جا چکی تھی اور کرسیوں پر بیٹھے سازندے اپنا اپنا ساز بجانے میں مصروف تھے۔ باقی سازندے اِدھر اُدھر دیکھتے بھی جا رہے تھے لیکن کالے چشمے والا اندھا سازندہ گردن سیدھی اوپر کیے بڑی توجہ سے بجا رہا تھا۔ باقی سب کے درمیان بیٹھے ہوئے بھی وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں سے نہ ہو۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد مسز کیمرون اپنے شوہر سے بولی، ''چلو اب چلیں، کافی ہو گیا۔'' فرانسوا اور پرمود سے رخصت لے کر وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بیئر کے گلاس آدھے سے زیادہ بھرے رہ گئے تھے۔

کیمرون میاں بیوی کے جانے کے بعد پرمود اور فرانسوا کچھ دیر خاموشی سے اسٹیج کی طرف دیکھتے رہے۔ دونوں نے مل کر وسکی کی جو کوارٹر بوتل منگوائی تھی وہ ختم ہو گئی۔ تب فرانسوا نے ایک اور منگوائی۔ سگریٹ کے بڑھتے ہوئے دھوئیں اور ہال کی عمومی گھٹن سے پرمود کو اب بے چینی اور کوفت سی ہونے لگی۔ اسے خیال آیا کہ گرمیوں میں جب عقیل کے ساتھ یہاں آیا تھا تب خاصا بہتر تھا۔ باہر کھلی جگہ کی تازہ ہوا میں بیٹھنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ اب اس گھٹے ہوئے ہال میں بیٹھنا کتنا ناگوار ہے۔ پرمود کو پھر عقیل کی یاد آئی اور اس کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

کیبرے والی دو عورتیں ان کی میز کے پاس آ گئیں۔ ہنستے ہوئے عربی میں بات کرنے لگیں۔ ان دونوں کے غیر ملکی ہونے کا احساس ہوا تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگیں۔ بات کرتے کرتے وہ میز پر بیٹھ گئیں۔ ایک جس نے نیچے گلے والی لمبی سرخ فراک پہن رکھی تھی، فرانسوا کے پہلو میں بیٹھ گئی اور دوسری، جو سفید منی اسکرٹ میں تھی، پرمود کے پاس۔ اس کے برابر میں بیٹھتے ہی سینٹ کا تیز بھبکا آیا۔ اس سے پہلے بھی یہ عورتیں میز کے پاس سے گزرتی دکھائی دی تھیں لیکن مسز کیمرون کی موجودگی کی وجہ سے پاس نہیں پھٹکی تھیں۔ اب ان دونوں کو اکیلا بیٹھے دیکھ کر انھوں نے ان کو آ پکڑا۔

''ان سے کہو یہاں سے جائیں،'' پرمود نے فرانسوا سے کہا۔

''بیٹھا رہنے دو نا۔ تھوڑا مزہ لیتے ہیں،'' فرانسوا بولا۔ اس نے ان دونوں کے لیے ایک اور

Scanned with CamScanner

بوتل اور گلاس منگوائے۔ فرانسوا کی پیش کی ہوئی سگریٹ دونوں نے لے لی۔

منی اسکرٹ والی ذرا دقت سے پرمود سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''تم جہاز کے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہم جہاز سے آئے ہیں،'' پرمود نے کہا۔ اس نے فرانسوا کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کیپٹن ہے اور میں وائس کیپٹن!''

''اوہ کیپٹن — بگ پیپل!'' وہ آنکھیں پھیلا کر بولی۔ اس نے ایک گھونٹ میں وسکی کا گلاس آدھے سے زیادہ خالی کر دیا۔ اگر یہاں گاہک پھنسے تو ٹھیک، ورنہ وہ اس میز پر زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی؛ ان کی منگوائی ہوئی وسکی جلدی سے ختم کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ ''تمھارا جہاز کیا لایا؟'' اس نے پوچھا۔

''بیئر،'' پرمود بولا۔ ''بیئر کے کین۔ پورا جہاز بھر کر بیئر لائے ہیں ہم!''

''بہت اچھے! پھر تو تمھیں جہاز پر خوب بیئر پینے کو ملتی ہوگی۔''

''ہاں بالکل۔ ہم پانی پیتے ہی نہیں۔ صرف بیئر پیتے ہیں!''

''اوں...'' نقلی حیرت کی آواز نکال کر وہ پرمود کے قریب کھسک آئی۔ اس کے تیز سینٹ کی بو سے پرمود کا جی متلانے سا لگا۔ ''تمھارا نام کیا ہے؟'' پرمود نے اس سے پوچھا۔

''میرا نام؟'' وہ ناز سے بولی۔ ''میرے دو نام ہیں، مسلم اور کرسچین! اگر تم مسلم ہو تو مسلم نام بتاؤں ورنہ کرسچین۔ تم کیا ہو؟''

''دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میں ہندو ہوں۔''

''ہندو؟'' اس نے بھنویں اونچی کر کے کہا۔ ''یہ تو مشکل ہو گئی!'' پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی، ''چلو تم مجھے ایک ہندو نام بتاؤ — اچھا سا ہندو نام۔ مجھے ایک ہندو نام بھی مل جائے گا! بتاؤ نا —''

''ساوتری۔''

''ساویتری؟ ہاں، اچھا ہے! ساویتری... ساویتری...''

Scanned with CamScanner

کچھ منٹ تک منی اسکرٹ والی 'ساوتری' پرمود سے بات کرنے کی کوشش میں لگی رہی، لیکن اپنی قلیل انگریزی کی وجہ سے اس سے زیادہ بات نہیں کی جا رہی تھی۔ پرمود بھی کچھ زیادہ نہیں بول رہا تھا۔ تب کچھ دیر وہ بیٹھی سگریٹ پھونکتی رہی۔ وہ اٹھ کر چلی جاتی لیکن اس کی ساتھ والی لڑکی کا فرانسوا کے ساتھ معاملہ اچھا چلتا دکھائی دے رہا تھا، اس لیے بیٹھی رہی۔

فرانسوا نے لال فراک والی کے کندھے کے گرد ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ دونوں بیچ بیچ میں زور سے ہنستے تھے۔ ان کی باتیں آدھی انگریزی آدھی عربی میں چل رہی تھیں۔

اسٹیج پر ایک فربہ رقاصہ آ گئی تھی۔ چہرے پر تھپے ہوئے گہرے میک اپ کے باوجود وہ اپنی بڑھی ہوئی عمر چھپا نہیں پا رہی تھی۔ اس کے ناچ میں برسوں کی مہارت جھلکتی تھی۔ جوانی کی دلکشی کی کمی کو وہ جوش اور ولولے کے ساتھ ناچ کر پورا کر رہی تھی۔ اس سے اس کا ناچ کسی قدر مضحکہ خیز ہو گیا تھا۔ اسٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ اس کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں ہنستے ہوئے کچھ بول رہے تھے۔ اس دوران ایک آدمی نے اٹھ کر کوئی چبھتا ہوا فقرہ اچھالا۔ اس کی پروا کیے بغیر رقاصہ نے اپنی تگ و دو جاری رکھی۔ وہ اور کچھ دن اس دھندے میں ٹکنے پر مصر تھی۔ اس کے چہرے پر جمی ہوئی مسکراہٹ پرمود کو ایک بھونڈے اور بھیانک مکھوٹے جیسی محسوس ہوئی۔

ہال میں بھرے ہوئے دھوئیں سے پرمود کی آنکھوں میں پانی آنے لگا تھا۔ دھوئیں اور سینٹ کی تیز بھبکے سے اس کا سر دُکھنے لگا تھا۔ پیٹ میں کوئی چیز اوپر کو آتی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر یکایک اسے محسوس ہوا کہ اسے قے ہو جائے گی اور وہ غش کھا کر گر پڑے گا۔ اس کا یہ خیال نہیں تھا کہ اس کی یہ کیفیت پینے کی وجہ سے ہے۔ اس نے اتنی زیادہ نہیں پی تھی۔ گھٹی ہوئی ہوا کی وجہ سے اس کی طبیعت مالش کرنے لگی ہو گی۔ یہاں سے جتنی جلد ممکن ہو نکل جانا چاہیے اور کھلی ہوا میں لمبا سانس لینا چاہیے۔

اس نے آنکھ کھول کر فرانسوا سے کہا، ''چلو اب چلتے ہیں یہاں سے!''

فرانسوا نے لال فراک والی سے کچھ کہا۔ لال فراک والی نے منی اسکرٹ والی سے کچھ کہا۔ پھر فرانسوا پرمود سے بولا، ''انھیں ساتھ لے چلتے ہیں۔''

پرمود نے نیند میں چلنے والے کی طرح سر ہلایا۔ اس گھٹے ہوئے اندھیرے ہال سے وہ کسی بھی طرح باہر نکل جانا چاہتا تھا۔

Scanned with CamScanner

سرکاری ضابطوں کی رو سے کیبرے والی عورتوں کو کھلم کھلا باہر نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ فرانسوا نے ان دونوں کو بتایا کہ اس کی گاڑی کہاں کھڑی ہے۔ فرانسوا اور پرمود باہر نکلے اور گاڑی میں جا کر بیٹھے۔ فرانسوا نے پرمود سے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ ''انھیں ہوٹل میں لے چلتے ہیں! میں اس قسم کے ایک دو ہوٹلوں کو جانتا ہوں،'' فرانسوا نے کہا۔ اتنے میں کیبرے تھیٹر کے پچھلے دروازے سے نکل کر وہ دونوں گاڑی کی طرف آئیں۔ لال فراک والی فرانسوا کے برابر میں جا بیٹھی اور منی اسکرٹ والی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش میں پیر پھسلنے سے پرمود کے اوپر گر پڑی۔ پھر زور سے ہنس کر سیدھی ہوئی لیکن پرمود سے سٹ کر بیٹھ گئی۔

کھلی ہوا میں پرمود کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ اس کی متلی دور ہو گئی۔ سر ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن رات کی ٹھنڈی ہوا سے ایک طرح کی غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ آگے کی سیٹ پر لال فراک والی زور زور سے فرانسوا سے باتیں کر رہی تھی۔ منی اسکرٹ والی بار بار متجسس نظروں سے پرمود کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی خاموشی کے لحاظ میں اس نے بھی خاموش رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گاڑی چلنے سے ٹھنڈی تیز ہوا لگنے لگی تو پرمود آہستہ آہستہ اس کے اوپر ڈھیر ہوتا گیا۔ پھر اس نے اپنا بازو پرمود کے گرد ڈال دیا۔ کچھ دیر میں پرمود کا سر اس کے زانو پر تھا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ پرمود کے سینے پر رکھ لیا۔ پرمود آنکھ بند کیے پڑا رہا۔

کچھ دیر تک پرمود کی نظروں کے سامنے اسٹیج پر ناچنے والی عورتوں کے پیکر آتے رہے۔ پھر ایک تاریک ویرانی اس کی آنکھوں کے سامنے پھیل گئی۔ اس ویرانی میں گونج دار آواز پیدا کرنے والی ہوا بہہ رہی تھی۔ اس ہوا سے پرمود کو عجیب سا ڈر لگا۔ پھر دھیرے دھیرے روشنی ہوتی گئی۔ اس ویرانی میں ایک گہوارہ ہوا میں لٹکا ہوا دکھائی دیا۔ گہوارے کی زنجیر بہت اوپر آسمان میں چلی گئی تھی۔ وہ کس چیز سے بندھی ہوئی تھی یہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گونج دار ہوا سے گہوارہ ہل رہا تھا۔ اس میں سے کرر... کرر... کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ روشنی بڑھتی گئی تو گہوارے میں لیٹا ہوا بچہ نظر آنے لگا۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ پیر مارتا ہوا وہ بچہ کروٹ لے کر گہوارے کی سلاخیں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ایسا نہ کر سکا تو رونے لگا۔ سر اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے ہاتھ پیر پٹکتا رہا، جیسے گہوارے سے باہر آنا چاہتا ہو۔ گہوارہ ہوا پر جھولتا رہا۔ پیچھے جاتے ہوئے وہ چھوٹا معلوم ہونے لگتا اور جب اِس طرف آتا تو اس کے

Scanned with CamScanner

پہلو پر لگی لوہے کی سلاخیں پرمود کو صاف دکھائی دینے لگتیں۔ وہ ان سلاخوں اور ان کے پیچھے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بچے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اسے نیچے کی زمین دکھائی دینے لگی۔ ہوا میں جھولتے ہوئے گھوارے کے بہت نیچے سپاٹ زمین دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دلدلی زمین اور کالی کیچڑ۔ اس کیچڑ میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے جاندار رینگتے ہوئے اچھل رہے تھے۔ پرمود کو ان جانداروں سے بہت گھن آئی۔ یکایک اسے ڈر لگا کہ بہت اوپر دور دور تک جھولنے والے اس گھوارے سے گر کر وہ بچہ کیچڑ کے ان جانداروں کے بیچ میں آپڑے گا۔ گھوارہ جھولے کھاتا رہا۔ لوہے کی موٹی سلاخیں بار بار پرمود کی آنکھوں پر آتی رہیں۔ غور سے دیکھنے پر پرمود کو احساس ہوا کہ اس روتے ہوئے بچے کا چہرہ خود اس کے چہرے کی طرح ہے۔ وہ بچہ وہ خود تھا۔

گھوارے میں لیٹے روتے ہوئے بچے کو غور سے دیکھنے میں پرمود کو اپنی آنکھوں میں بھر آنے والا پانی محسوس نہیں ہوا۔ منی اسکرٹ والی نے اس کی آنکھوں کے گیلے پن کو اپنے زانو پر محسوس کر کے آگے کی سیٹ پر بیٹھے فرانسوا سے کہا، ''ارے یہ کیا! تمھارا دوست رو رہا ہے!''

فرانسوا نے پیچھے مڑ کر ایک نظر دیکھا اور ہونٹوں میں سگریٹ اٹکائے ہوئے بولا، ''جانے دو۔ میرا دوست ذرا جذباتی ہے۔ ہوٹل پہنچ کر ٹھیک ہو جائے گا!''

اپنے زانو پر سر رکھے روتے ہوئے پرمود کو دیکھتے دیکھتے منی اسکرٹ والی کے دل میں ایک جبلی نسوانی جذبہ بیدار ہو گیا۔ وہ بائیں ہاتھ سے پرمود کو آہستہ آہستہ تھپکنے اور داہنے ہاتھ سے اس کی پتلون کی جیب میں رکھے بٹوے کو ٹٹولنے لگی۔

❁❁

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیر طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120

Scanned with CamScanner

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریئل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیر طبع)
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکری کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیولیاما زاریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70

Scanned with CamScanner

اسماعیل کادارے

کور فرمان

(ناولا)

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص:

افضال احمد سید

Scanned with CamScanner

البانیہ کے معروف ادیب اسماعیل کادارے (Ismail Kadare) 1936 میں پیدا ہوئے۔ ان کے ناولوں اور دوسری تحریروں کا 1980 اور 1990 کے عشروں میں پہلے فرانسیسی اور پھر انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور دنیا بھر کے پڑھنے والوں کو ان کے منفرد اسلوب سے آگاہی ہوئی۔ ان کے فکشن کے موضوعات وسیع ہیں، لیکن ان تمام تحریروں میں اپنے معاشرے اور تاریخ کے گہرے مطالعے اور مشاہدے سے پیدا ہونے والی دانش مشترک محسوس ہوتی ہے۔ اسی دانش سے ان کے اس مخصوص نقطۂ نظر کی تشکیل ہوئی ہے جو سرتاسر سیاسی نوعیت کا ہے اور البانیہ کی سخت گیر مطلق العنان ریاست کے کردار کو خطۂ بلقان کی خون آلود جابر تاریخ کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ کادارے کی کتابوں پر ان کے اسی صریح سیاسی نقطۂ نظر کے باعث ان کے اپنے وطن میں پابندیاں لگائی جاتی رہیں۔

ایک مطلق العنان ریاست اپنی اصل میں جاگیردارانہ ہوتی ہے، جس میں مملکت کے تمام وسائل اور تمام انسان بادشاہ یا آمر کی ذاتی ملکیت تصور کیے جاتے ہیں، وہ کسی قانون یا ضابطے کا پابند نہیں ہوتا اور اسے اپنی حاکمیت قائم رکھنے کے سلسلے میں آسمانی تائید اور بااثر طبقوں کی عملی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ حاکمیت کا یہی نمونہ مطلق العنان ریاست کی ہر سطح پر ملتا ہے، اور بڑی یا چھوٹی جاگیریں رکھنے والے رئیس، مال و دولت اور اثر و رسوخ رکھنے والے تاجر اور طاقت اور اختیار رکھنے والے سرکاری اہلکار اپنے اپنے دائرے میں اسی مطلق اقتدار کے مالک بنے رہتے ہیں۔ ان میں پست ترین گھر یا خاندان کا ادارہ ہے جہاں مرد کو، خواہ وہ گھر کے باہر حاکم ہو یا محکوم، اپنی عورت اور بچوں پر اسی قسم کا مطلق اقتدار حاصل ہوتا ہے جیسا بادشاہ یا آمر کو پوری مملکت کے انسانوں پر۔ ظاہر ہے اس طرح کا غیر منصفانہ نظام متواتر جبر اور تشدد کے بغیر جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لرزہ خیز طریقوں سے انسانوں کی جان لینا اور ان کے جسم کے اعضا کو مسخ کرنا اس قسم کے معاشروں میں جائز سمجھا جاتا ہے۔

اسماعیل کادارے کے جس ناولا کا ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، اس میں اسی قسم کی ایک بہیمانہ سزا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نہ صرف انسانوں کی آنکھوں کو برباد کرنے کی یہ سزا ہولناک ہے بلکہ اس سزا کو ایک ایسے جرم سے منسلک کیا گیا ہے جس کی تعریف نہایت مبہم ہے۔ اس موضوع کے ذریعے اسماعیل کادارے نے اپنے بے مثال انداز میں ایک مطلق العنان اور بے دستور ریاست کے کردار اور شہریوں سے اس کے جابرانہ رشتے کو اجاگر کیا ہے۔ اس ناولا کے مترجم افضال احمد سید نے کہیں کہیں اس ناولا کی تلخیص کر دی ہے جس کا مقصد وحدتِ تاثر کو قائم رکھنا ہے۔

Scanned with CamScanner

1

ستمبر کے آخری ہفتے تک یہ واضح ہو گیا تھا کہ حادثات کا یہ سلسلہ محض اتفاق نہیں تھا۔ ان لوگوں کے مطابق جنھیں اُس کی دل نشیں آواز میں اذان سننے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، ہمارا نوجوان حاجی ابراہیم مینار کی سیڑھیوں سے گر پڑا تھا۔ اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ دربارِ عام کے بعد ولی عہد کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ دو تین اور غیر معمولی واقعات یکے بعد دیگرے ہفتے کے اختتام تک پیش آئے۔ شاہی محل کی طرف جاتے ہوئے، جہاں اُسے اپنی حکومت کی طرف سے ایک قرضے کا، جس کا ہمیں بہت دنوں سے انتظار تھا، اعلان کرنا تھا، برطانوی سفیر کی بگھی اُلٹ گئی۔

سب لوگ متفق تھے کہ سفیر کا حادثہ، نوجوان حاجی کا گرنا اور ولی عہد کی بیماری، ان سب میں ایک سبب مشترک تھا — وہ سبب چشمِ بد تھا۔

شاید اس سال خزاں کے سرد اور خنک موسم یا معاشی بدحالی کی وجہ سے چشمِ بد کے اثرات ماضی سے زیادہ نقصان پہنچا رہے تھے۔ لوگوں میں بے چینی اور غصہ پھیل رہا تھا، جس کی خبر سلطان تک پہنچائی جا چکی تھی۔

سلطان کا ردِ عمل جلد متوقع تھا۔ آخر ایک جمعے کو فرمان جاری ہو گیا۔ تمام خاص فرمانوں کی طرح اس کا عنوان بہت مختصر تھا: ''کور فرمان'' — لغوی معنوں میں اندھا کرنے کا حکم۔ بہر حال، یہ فرمان نہ اتنا سخت تھا اور نہ اتنا نرم جتنی اس کے بارے میں توقع کی گئی ہوگی۔

اعلان کے ایک ہفتے بعد ہی، حیرت انگیز تیزی سے، مجلسِ سلطنت میں کور فرمان نافذ کرنے سے متعلق بحث کی مختلف جزئیات کا لوگوں کو علم ہونے لگا۔ قوپرولو قبیلہ، جو شیخ الاسلام کے دھڑے کے خلاف تھا، چشمِ بد رکھنے والوں کے لیے کم سزا کے حق میں تھا۔ قوپرولو نے انھیں سلطنت کے تمام

Scanned with CamScanner

اداروں سے نکال دینے یا نظر بند کرنے یا بہت سنگین حادثات کی صورت میں دور دراز مقامات پر جلاوطن اور قید کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ دوسری طرف شیخ الاسلام اور اُس کے مقلدین نے روایتی سزاؤں کی حمایت کی۔ سلطان نے دونوں فریقوں کو سنا اور کسی کا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کیا، یا شاید اس نے دونوں کا بیک وقت ساتھ دیا۔

کورفرمان کا خاص حصہ یہ تھا:

چشم بد کے مضر اثرات حالیہ دنوں میں زیادہ ہونے لگے ہیں، اور آزارِ چشم کی وجہ سے تباہی پھیلنے کے خطرے کو روکنے کے لیے سلطنت اپنی اور رعایا کی فلاح اور بہبود ملحوظ رکھتے ہوئے، متعدد اقدامات اٹھانا ضروری گردانتی ہے۔

چشم بد کے حامل افراد کو، ماضی کے برعکس، سزائے موت نہیں دی جائے گی، صرف انھیں مذموم حرکتوں کو پھیلانے سے روکا جائے گا، اور یہ ہدف ان کو آلۂ جرم سے محروم کر کے حاصل کیا جائے گا۔ چشم بد کے حامل ہر فرد کی آنکھیں ضبط کر لی جائیں گی۔

سلطنت ان اقدامات سے متاثر ہونے والے افراد کو معاوضہ پیش کرے گی اور جو افراد خود کو حکام کے حوالے کر دیں گے انھیں زیادہ معاوضہ دیا جائے گا۔ جو افراد کسی بھی طرح سے کورفرمان کی مخالفت کے مرتکب ہوں گے ان کی آنکھیں جبری طور پر نکال لی جائیں گی اور وہ کسی بھی معاوضے کے مستحق نہیں ہوں گے۔

سلطنت کی تمام رعایا سے کہا گیا کہ وہ علانیہ یا خفیہ طور پر کسی بھی فرد کی جو کہ چشم بد رکھتا ہو، اطلاع دیں۔ انھیں اپنے خطوط کے آخر میں ملزم کا پورا نام اور گھر یا دفتر کا پورا پتا درج کرنا ہوگا۔ مخبری ہر شخص کی کی جا سکتی ہے، چاہے وہ عام رعایا میں سے ہو یا اس کا تعلق سلطنت کے حکام سے ہو۔

2

اخبارات کے متعارف ہونے کے بعد ہی یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ سلطنت کے کچھ اعلانات روایتی ذرائع ابلاغ، یعنی منادی کرنے والے، زیادہ موثر طور پر لوگوں تک پہنچاتے تھے جبکہ کچھ اعلانات اشاعت کے ذریعے زیادہ اثر انداز ہوتے تھے۔ کورفرمان خواہ سماعت کے ذریعے پھیلا یا بصارت

Scanned with CamScanner

کے، بہر حال اس سے فوری طور پر دہشت پھیل گئی۔ مگر یہ مکمل طور پر اس وقت سمجھا جا سکتا تھا جب کان اور آنکھ دونوں مل کر اس کے معنی دماغ تک پہنچانے کا کام کریں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جن لوگوں نے اسے پہلی بار منادی کرنے والے سے اعلان کرتے ہوئے سنا، اسے پڑھنے کے لیے اخبار خریدنے دوڑ پڑے۔ اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اخبار سے جانا، اپنے اخبار قہوہ خانوں کی میزوں یا عوامی بنچوں پر چھوڑ کر منادی کرنے والے کی تلاش میں قریبی چوک کی طرف لپکے۔

ایک دیرینہ احساس جو شاید لوگ حالیہ برسوں میں فراموش کر چکے تھے، اچانک فضا میں دھیرے دھیرے دوبارہ شامل ہونے لگا— یہ خوف کا احساس تھا۔ مگر اس بار یہ کوئی عام خوف، جیسے بیماری، قزاقی، بدروحوں یا موت سے خوفزدہ ہونا نہیں تھا۔ ہوش اڑا دینے والا جو احساس لوٹ آیا تھا اس کا نام سلطنت کا خوف تھا۔

سلطنت کے خوف نے ذہن کے تمام گوشوں تک رسائی حاصل کر لی۔ چند ساعتوں کے دوران، یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں میں، ہزاروں ہزار لوگ اس کے دندانوں اور چرخیوں میں جکڑ لیے جائیں گے۔ اسی سے مماثل صورت حال چھ سال پہلے ہوئی تھی جب ممنوعہ فرقوں کے خلاف مہم چلی تھی۔ ایک اس سے بھی پندرہ سال پہلے کی مثال ملتی ہے جب ایک زبردست سازش کو بے نقاب کیا گیا تھا، جو شروع میں صرف اعلیٰ عہدے داروں کے ایک تنگ حلقے کو گھیرتی ہوئی معلوم ہوئی تھی، مگر بتدریج اس نے کئی ہزار خاندانوں کو اپنی دہشت کا شکار بنایا تھا۔

لوگ سمجھتے تھے کہ وہ بھول چکے ہیں، مگر جیسے ہی طبل گڑگڑائے اور منادی کرنے والے نے با آوازِ بلند کور فرمان کے پہلے الفاظ کا اعلان کیا، انھیں یقین آ گیا کہ وہ ایک بات بھی نہیں بھولے تھے اور یہ خوف ہمیشہ ان کے دل میں تھا، انگوٹھی کے جوف کے اندر احتیاط کے ساتھ پوشیدہ کیے ہوئے زہر کی طرح۔

شروع ہی سے یہ واضح تھا کہ اب جو کچھ عمل میں لایا جا رہا ہے وہ ممنوعہ فرقوں کے خلاف مہم یا اُس طرح کی دوسری تمام وارداتوں سے زیادہ ہولناک ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نئی مہم کا ہدف اس قدر قیاس پر مبنی تھا کہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

گھروں، دفتروں اور قہوہ خانوں میں لوگ سنیچر کی صبح شروع ہوتے ہی اس کے سوا کوئی اور

Scanned with CamScanner

بات نہیں کر رہے تھے۔ مگر لوگ کور فرمان پر اس طرح تبصرہ کر رہے تھے جو مکمل طور پر اس سے پیدا ہونے والی دہشت کے برخلاف تھا۔ لوگ اس پر سرسری طور پر، تقریباً تفریحی انداز میں بات چیت کر رہے تھے۔ بظاہر، لوگوں نے سوچا تھا کہ خوش طبعی اس خفیف ترین شک کے اثر کو زائل کرنے کا بہترین تریاق ہے جو ان کے اپنے یا دوسروں کے ذہن میں چوری چھپے موجود ہے کہ وہ کور فرمان کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

لوگ روایتی اندازِ فکر سے متاثر ہو کر کہتے کہ ہلکے رنگ کی پتلیوں والی آنکھیں چشم بد ہوتی ہیں۔ مگر سب کو معلوم تھا کہ پتلیوں کا رنگ خود آزارِ چشم کی تشخیص کا مکمل ذریعہ نہیں تھا، اور چونکہ یہ مسئلہ ایک کثیر قومی سلطنت میں اٹھا تھا جہاں کچھ لسانی گروہوں کی آنکھیں اور سر کے بال اور جلد بھی دوسروں سے زیادہ گہرے یا ہلکے رنگوں کی تھی، بلاشبہ رنگ ایک مناسب علامت نہیں ہو سکتی تھی۔ رنگ صرف بہت سے عوامل میں سے ایک تھا: جیسے بھینگا پن، یا دیدوں کا غیر معمولی طور پر بڑا یا چھوٹا ہونا۔ پھر بھی کسی ایک یا ایک سے زیادہ خصوصیات کا کسی کی آنکھوں میں پایا جانا آزارِ چشم کا ناقابلِ تردید ثبوت نہیں تھا— چشم بد کچھ اور تھی۔ یہ آنکھوں کی پیدائشی قسم تھی جس کی نگاہ جہاں پڑتی تھی تباہی پھیلاتی تھی۔ اس کا سراغ لگانا بہت دشوار تھا اور کور فرمان میں کسی واضح علامت کا ذکر نہیں تھا۔ پھر بھی اگر فرمان میں جزئیات کی گنجائش نہیں تھی، خصوصی مجالسِ عمل کو، جو کم و بیش تمام علاقوں میں قائم ہو گئی تھیں، ضرور واضح ہدایات دی گئی ہوں گی تاکہ چشم بد کو صحیح طور پر شناخت کیا جا سکے اور غلط تاویل اور ممکنہ بدعنوانی کا تدارک کیا جا سکے۔

ایک مرکزی مجلس اب قائم ہو چکی تھی اور اسے اس مہم کے نظم و نسق کی ذمے داری دے دی گئی تھی۔ مجلس کو سلطنت کے ہر صوبے میں بے شمار شاخیں مہیا کی گئی تھیں۔ اس کے بعد بے ہودہ نام والی مقامی شاخیں بھی کھل گئیں جنھیں عثمانیہ اصطلاح میں خدا معلوم کس وجہ سے فرنگیوں کی منحوس زبان کے ایک لفظ کے لاحقے کے ساتھ ''کور آفس'' کہا جاتا تھا۔

کور آفسوں کی باضابطہ سرگرمیاں فوراً ہی سامنے نہیں آئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا کام صرف مخبروں کی فراہم کردہ اطلاعات کو جمع کرنا اور اعلیٰ حکام کو پہنچانا ہے۔ مگر دوسروں نے فوراً حقیقت کا ادراک کر لیا جب انھوں نے اونچے کناروں والی چارپائیاں، جن کے دونوں طرف

سلاخوں پر باندھنے والی چمڑے کی پٹیاں لگی تھیں، کور آفسوں کے حوالے ہوتے ہوئے دیکھیں۔ بآسانی یہ اندازہ لگا لیا گیا کہ کور آفس ہی وہ جگہ ہو گی جہاں آنکھیں نکالی جائیں گی۔ بہرحال، ''کوریاطاق'' یا اندھا کرنے کی سرکاری آہنی چارپائیوں کا استعمال زیادہ تر علامتی تھا۔ آنکھیں نکالنے کا عمل کہیں اور کیا جاتا تھا؛ کور آفسوں میں آنکھیں صرف اس وقت نکالی جاتی تھیں جب علاقے کے لوگوں کو سبق سکھانا ضروری ہو۔

مرکزی مجلس نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا تھا جس میں اندھا کیے جانے کے پانچ منظور شدہ طریقوں کی فہرست تھی۔ بازنطینی ونیشی طریقہ (لوہے کی تیز نوکوں والی دوشاخہ سلاخ کا استعمال)؛ تبتی طریقہ (مجرم کے سینے پر بھاری پتھر رکھتے جانا یہاں تک کہ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے اُبل پڑیں)؛ مقامی طریقہ (تیزاب کا استعمال)؛ رومی قرطاجنی طریقہ (تیز روشنی کا اچانک سامنا)؛ اور یوروپی طریقہ (مکمل تاریکی میں طویل عرصے تک قید)۔

اس حکم میں یہ اطلاع بھی تھی کہ جو لوگ خود کو پیش کر دیں گے، اور کچھ دوسرے لوگ جنھیں مختلف وجوہ کی بنا پر مجلس نے مراعات حاصل کرنے کا اہل قرار دیا تھا، نہ صرف مستقل زرِ تلافی پائیں گے بلکہ انھیں اپنے اندھا کیے جانے کے طریقے کا انتخاب کرنے کا بھی استحقاق ہو گا۔

اندھا کرنے کے پانچ طریقوں کی ہدایات کے اعلان کے بعد دوسرے ہنگامی اقدامات بھی کیے گئے جو واضح طور پر اس بات کی نشانی تھے کہ کور فرمان پر مکمل عمل کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔

اعلیٰ طبی مدرسے نے جراحتِ اخراجِ چشم کو نصاب میں داخل کیا، دارالسلطنت میں بازنطینی ونیشی طریقے کے لیے لوہے کی دوشاخہ سلاخوں کی پہلی کھیپ تیار ہو گئی اور دوسرے کارخانوں میں تیزاب بننا شروع ہو گیا جسے چھوٹے چھوٹے مضبوط پیپوں میں ذخیرہ کیا گیا، اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ سلطنت کے انتہائی دور دراز مقامات تک ترسیل کے متحمل ہوں گے۔ مگر تبتی طریقے کے لیے کچھ بھی نہیں چاہیے تھا؛ بڑے پتھر ہر جگہ مل سکتے تھے۔

3

میری، گھر کا کام اپنی بھابی پر چھوڑ کر، یہ کہہ کر کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے، اوپر اپنے

کمرے میں جانے لگی۔ اس کی بھابی نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ وہ دونوں بہت کم سن تھیں (ان کے درمیان مشکل سے ایک سال کا فرق تھا) اور دونوں ہر روز گھر کا کام کاج ختم کرنے کے بعد بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کی عادی تھیں جب تک کہ میری کی ماں آ کر انھیں اٹھا نہ دیتی۔ ''ان کو خطرہ ہے کہ میں شاید تمھیں شادی شدہ زندگی کے راز بتاتی ہوں،'' میری کی بھابی دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا کرتی۔

اپنی منگنی کے باضابطہ اعلان سے ایک دن پہلے، اور پھر آنے والے چند ہفتوں میں، میری نے کچھ راز جان لیے تھے جب اس کی بھابی نے شرم وحیا کے پردے میں اسے کچھ باتیں بتائی تھیں۔ مگر بھابی کی بتائی ہوئی باتیں اس کے لیے چند بوندوں سے زیادہ نہ ہو پاتیں جو کسی صحرا میں گم ہو چکی تھیں، جبکہ اسے ایک تند رو سیلاب کی پیاس تھی۔

مگر بالکل حال میں، جب اس کی شادی کا دن قریب آنے لگا، غیر شادی شدہ لڑکی نے اپنی بھابی سے، جو اب اسے زیادہ آشکار طور پر کچھ باتیں بتانے پر آمادہ ہو چکی تھی، جنسی تعلقات کے بارے میں سوالات کرنے ختم کر دیے۔

بھابی نے زیادہ سر کھپانا مناسب نہیں سمجھا— کوئی اس خاندان سے اور کیا توقع رکھ سکتا ہے جس میں مختلف افراد مختلف مذاہب کی پیروی کرتے ہیں۔

بھابی سچ مچ حیرت زدہ ہو گئی تھی جب اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ اس کے ہونے والے شوہر کا خاندان، البانیہ سے تعلق رکھنے والے کئی خاندانوں کی طرح، نسل در نسل، اپنے بیٹے سے مختلف مذاہب کے افراد کو لگانے کی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کا سسر، الیکس یورا، عیسائی تھا، مگر اس کے ایک بیٹے کی، جو کہ بحریہ میں چلا گیا تھا، مسلمان کے طور پر پرورش ہوئی تھی جبکہ دوسرا، اس کا ہونے والا شوہر، عیسائی رہ گیا تھا۔ شاید باپ نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی یہی کیا ہوتا اگر اس کی دو بیٹیاں ہوتیں۔ مگر چونکہ میری اکلوتی بیٹی تھی، اس نے اپنے طور پر اسے دو مذہبوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی؛ چونکہ وہ اسے بیک وقت دو مذہبوں میں پرورش نہیں کر سکتا تھا— اگرچہ ایسے واقعات بھی موجود تھے— اس نے دو مذہبوں سے اس کے دو نام رکھے: خاندان اور قریبی دوستوں کے لیے اس کا نام میری تھا، اور باقی دنیا، بشمول اس کے منگیتر، کے لیے اس کا نام مریم تھا۔

Scanned with CamScanner

جس قوپرولو خاندان میں وہ بیاہی جارہی تھی، اس کا اس کے خاندان سے دور کا رشتہ تھا۔ اس کے اپنے خاندان کا نام، یورا، پہلے قوپریلس ہی تھا، جو سلطنت کی مصلحتوں کے باعث، البانوی سے ترجمہ ہوکر عثمانیہ قوپرولو ہوگیا تھا۔

''پاگل خانہ!'' کم سن بھابی نے پھر ایک بار سوچا جب اس کی آنکھیں سیڑھیوں کے زینے کی طرف اٹھیں۔ میری اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ ''خدا جانے وہ وہاں گھنٹوں اکیلی بیٹھی کیا کرتی ہے!''

وہ دوسروں کی ٹوہ لینے کی عادی نہیں تھی، مگر آخرکار تجسس اس پر غالب آ گیا۔ وہ پنجوں کے بل اوپر گئی اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر چابی کے سوراخ سے میری کی خواب گاہ میں جھانکا۔

جو کچھ نظر آیا وہ اسے دم بخود کرنے کے لیے کافی تھا۔ میری آئینے کے سامنے بالکل برہنہ کھڑی ہوکر ریشمی جھالر والی جانگیہ کو پہن اور اتار رہی تھی۔

''ابھی سے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' نوجوان شادی شدہ عورت نے حیرت سے سوچا۔ وہ میری کے متحرک جسم سے اپنی آنکھیں ہٹا نہیں پا رہی تھی۔

''نہیں،'' اس نے سوچا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا۔ ''کوئی لڑکی اس طرح کی حرکات نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ جنسی تجربہ حاصل نہ کرچکی ہو۔''

شاید نوجوان بھابی نے فرش کے تختوں کو چرچرایا ہوگا، کیونکہ میری اچانک مڑی اور اس نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ رکھا۔ مگر جلد ہی وہ پرسکون ہوگئی؛ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ دروازے کی چٹخنی اندر سے لگی ہوئی ہے۔

اس کی بھابی آہستہ سے ہٹ گئی اور دبے قدموں کے ساتھ نیچے آ گئی۔ ''وہ ضرور ساتھ سو چکے ہیں،'' اس نے سوچا۔ اسی وجہ سے میری کا تجسس بھی ختم ہوگیا تھا۔ وہ اپنے ذہن سے اس بے پناہ سفید جسم کو نہیں نکال سکی۔ اور اس نے ایک بار پھر سوچا ''ہاں، ہاں، ضرور یہی ہوا ہے۔''

4

اس کا شک درست تھا۔ دو ہفتے پہلے میری اور اس کے منگیتر کے درمیان بالکل اچانک وہ تعلق

Scanned with CamScanner

قائم ہو گیا تھا جو اس کے نزدیک ان کی شبِ زفاف سے پہلے نہیں ہونا چاہیے تھا۔

یہ سچ تھا کہ اس کا خاندان، جزیرہ نمائے بلقان سے آئے ہوئے بہت سے خاندانوں کی طرح، کم از کم دار السلطنت کے مسلمان خاندانوں کی نسبت، بہت زیادہ آزاد خیال تھا، مگر پھر بھی اس کے خاندان میں کسی نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ میری نے اپنے منگیتر کے ساتھ خلوت میں وقت گزارا ہوگا۔ وہ یہ تصور بالکل نہیں کر سکتے تھے کہ میری اپنی بکارت قبل از وقت ضائع کر چکی ہے۔

جس دن یہ واقعہ ہوا وہ کوئی عام دن نہیں تھا۔ نئے فرمان نے گھر کے سب لوگوں کو ایک گردابِ بلا میں ڈال دیا تھا۔ قریب کے چوک سے طبل بجنے کی آواز اور پھر منادی کرنے والے کی مشاق خطابت میں کور فرمان کے الفاظ سنائی دیے۔ میری اپنی آنکھیں اپنے باپ کے چہرے سے نہیں ہٹا سکی جو بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔

وہ آہستگی سے اس کے پاس گئی، حسبِ عادت اس کے کندھے پر دھیمے سے ہاتھ رکھا اور شیریں لہجے میں پوچھا، ''بابا جانی، آپ کس بات سے اتنے پریشان ہو گئے؟ ہمارے خاندان میں چشمِ بد جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔''

''نہیں بالکل نہیں... بالکل نہیں، کوئی نہیں!''

اس نے اپنے باپ کو پریشان نگاہوں سے دیکھا، جو اسی سوال کو خاموشی سے دہرا رہا تھا۔ ''اور کیا ہم قوپرولو کے دور کے رشتے دار نہیں ہیں؟''

''کیا؟'' باپ تقریباً دہاڑا۔ ''قوپرولو کے رشتے دار؟ ہاں، ہم ہیں۔ مگر اس طرح کے حالات میں یہ رشتے داری کس کام آئے گی؟ ایسے حالات میں کسی رشتے دار کا نہ ہونا بہتر ہے،'' اس نے قریب قریب سرگوشی کی حد تک مدھم آواز میں کہا۔

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ صلاح دین، میری کا منگیتر، اندر داخل ہوا۔ اس کا طرزِ عمل دوسروں کے برخلاف اتنا پرسکون تھا کہ الیکس نے اسے کرختگی سے گھورا جیسے کہنا چاہتا ہو، ''کیا تم اس دنیا میں نہیں رہتے ہو؟ کیا تم نے ابھی تک کور فرمان کے متعلق نہیں سنا؟''

بہت جلد، میز سج جانے سے بھی پہلے، وہ صلاح دین کے خوش و خرم ہونے کا سبب جان جانے والے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ ان کے ہونے والے داماد کو نہ صرف فرمان کا اندازہ تھا بلکہ وہ اس کے

Scanned with CamScanner

بارے میں ہر شخص سے زیادہ جانتا تھا، کیونکہ دو دن پہلے اس کے افسران نے اسے طلب کر کے آگاہ کیا تھا کہ اسے مرکزی مجلس نے کورفرمان کے تعلیمی عملے کا رکن مقرر کیا ہے۔

صلاح دین کے الفاظ نے گھر کی فضا میں اچانک تبدیلی پیدا کر دی۔ یہ پریشانی کے دور ہونے کا احساس تھا جس میں مستقبل کے داماد کی ستائش بھی شامل تھی جسے اتنا اہم کام سونپا گیا تھا۔ اور اصل طمانیت کی بات یہ تھی کہ ان کا اپنا آدمی قلعے کے اندر ہے۔

صاف صاف ستائش نہ صرف میری بلکہ اس کی ماں، اس کی بھابی، اور یہاں تک کہ اس کے بھائی کی آنکھوں میں بھی جھلک رہی تھی جو اب تک اپنی بہن کے منگیتر سے خود کو دور رکھتا آیا تھا۔

صرف الیکس ہی تھا جس کے چہرے پر تھوڑی دیر بعد سیاہ سائے منڈلاتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی نگاہیں مستقل صلاح دین کے چہرے پر مرکوز تھیں جیسے وہ اندازہ لگا رہا ہو کہ اس کے وجود کی گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے، اس کی جلد کے نیچے، اس کی ہڈیوں کے گودے کے اندر۔ اس نے نوجوان مرد کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا، ''امید ہے کہ جب تم وہاں ہو گے، اپنے آپ کو کسی بے قاعدگی میں ملوث ہونے نہیں دو گے۔''

''کیا؟'' صلاح دین نے غیر محسوس انداز میں اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

وہ اچانک چوکنا ہو گیا۔ ''کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں،'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، نوجوان مرد کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے۔ ''ہم اس کے بارے میں پھر کبھی بات کریں گے۔''

الیکس نے جو کچھ کہا اس پر وہ واضح طور پر افسردہ تھا اور کھانے کے بقیہ وقت میں وہ اپنی فاش غلطی کی تلافی کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ زندہ دلی لوٹ آئی اور شاید بلا کم و کاست یہی وجہ رہی ہو گی کہ وہ لوگ کھانے اور دیگر لوازمات کے درمیان اس پر توجہ نہیں دے رہے تھے کہ میری اور اس کا منگیتر، باہر برآمدے میں جانے کے بجائے جہاں انھیں تنہائی میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرنے کی اجازت دی گئی تھی، خاموشی سے خواب گاہ تک جانے والی سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔

کون جانے، وہاں موجود لوگوں نے واقعی نہیں دیکھا یا انھوں نے نہ دیکھنے کا بہانہ کیا۔ ماں اور بھابی نے واقعی نہیں دیکھا، کیونکہ وہ میز کی صفائی میں مصروف تھیں۔ بھائی، جو بمشکل کھڑا ہونے کے

Scanned with CamScanner

قابل رہ گیا تھا، پہلے ہی اپنی خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ اور جہاں تک باپ کا تعلق ہے، اس نے شاید انھیں اوپر جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، یا پھر — اور یہ سب سے زیادہ قابل قبول خیال ہے — اتنے دنوں کی پریشانی کے بعد، اور خاص طور پر کھانے کی میز پر تازہ واقعے کے بعد، وہ بدمزگی پھیلانا نہیں چاہتا تھا — یا پھر اس نے انھیں دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کا بہانہ کیا — ویسے بھی، کیا وہ چھ ہفتوں کے اندر شوہر اور بیوی نہیں بننے والے تھے؟

منادی کرنے والے کے طبل کے دور کا بجنا جاری تھا، اور اس پس منظر میں میری نے اپنے منگیتر کے بوسوں کے خلاف کسی مزاحمت کی پیش بندی نہیں کی، پھر اس نے اسے اپنے کپڑے اتارنے اور اپنے وجود کے مرکز کو ایک آقا کی حیثیت سے اپنے تصرف میں لینے دیا۔

ایک ہفتے بعد جب یہ سب پھر ہوا — انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ توجہ مبذول کرائے بغیر آئے گا، اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہ اس کے والدین کو اُس دن ایک جنازے میں شرکت کے لیے جانا تھا — میری اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے شادی شدہ زندگی کے رموز پر اپنی بھابی سے کچھ اور آگاہی حاصل نہیں کرنی ہے۔ وہ ایک تب خیز بے تابی سے اپنے منگیتر کی آمد کی منتظر رہتی، مگر اس گزشتہ ہفتے وہ صرف دو مرتبہ ہی ملنے آ سکا۔ (وحشت انگیز مجلس کے کام میں اس کا سارا وقت صرف ہو جاتا تھا۔) ان کو اکیلے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے اس نے اتوار کا انتظار کیا، جس دن وہ دوپہر میں کھانے کے وقت پر اپنے معمول کے مطابق آیا کرتا، وجدانی طور پر یہ جانتے ہوئے کہ معجزہ پھر ایک بار رونما ہوگا۔ وہ اور اس کی بھابی صبح کے گھر کے کام کو نپٹا چکی تھیں، مگر جہاں بھابی یہ چاہ رہی تھی کہ وہ دونوں ایک کونے میں بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کریں گی، میری نے، جو اپنی خواب گاہ میں آنے والی سرشاری کے تصور میں پناہ لینا چاہتی تھی، کہا کہ اس کے سر میں عجیب سا درد ہو رہا ہے، اور اکیلی اوپر چلی گئی۔

وہ کچھ دیر ٹہلتی رہی، پھر سڑک کو دیکھنے کے لیے کھڑی ہو گئی جس پر اس کا منگیتر متوقع طور پر چلتا ہوا آئے گا۔ پھر اس کی نظریں اس صندوق پر پڑیں جس میں اس کا عروسی لباس رکھا ہوا تھا — اس میں بیسیوں کپڑوں کے علاوہ بستر کی چادریں تھیں، اور برسوں سے جمع شدہ گلاوزی ریشمیں زیر جامے، جیسے شیشے میں بند کیا ہوا دھواں۔ اف خدایا! اس نے اس سے پہلے اسے پہن کر اُسے حیرت زدہ کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا تھا؟

Scanned with CamScanner

اس نے تقریباً تمام زیر جاموں کو پہن کر دیکھا، اور آخر کار لوٹ کر ایک نیم سفید زیر جامے کو پسند کیا۔ اس نے اسے پہنا، پھر اس پر اپنے کپڑے پہنے اور پھر دیوان پر ناتراشیدہ پشم سے بنے کمبل پر اپنے خیالوں میں گم بیٹھی رہی۔ اس نے اس خیال کو جو اس کے دماغ میں سب پر حاوی تھا دور کرنے کی تمام کوشش کی، مگر اسے پتا چل گیا کہ یہ اس کے لیے ناممکن ہے۔ اس کے بعد سے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہو چکی تھی کہ اگر اس نے اپنے منگیتر کے ساتھ دوپہر کے کھانے کے بعد اوپر آنے کا کوئی طریقہ نہیں نکالا تو اس سے اذیت برداشت نہیں ہو سکے گی۔

5

اتوار کے دن وہ دوپہر کا کھانا گھر کے مرکزی کمرے میں ایک بڑی بیضوی میز پر کھاتے تھے۔ صلاح دین بارہ بجے سے چند منٹ پہلے یوروپی تراش کا سوٹ پہنے وہاں پہنچا۔ یہ نئی وضع تھی جو دارالسلطنت کے سلیقہ مند نوجوانوں نے حال ہی میں اختیار کی تھی۔

''کام کیسا چل رہا ہے؟'' الیکس یورا نے، جب سب میز کے گرد بیٹھ گئے، سوال کیا۔

ہونے والے داماد نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی:

''بہت ٹھیک، سچ مچ بہت ٹھیک ٹھاک۔''

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اس موضوع پر آ گئے جس کے بارے میں وہ گزشتہ پورے ہفتے سے بے صبری کے ساتھ سننا چاہتے تھے، یعنی کور فرمان۔

''کیا تمھیں بہت زیادہ مخبریاں مل رہی ہیں؟'' الیکس کے بیٹے جون نے پوچھا۔

صلاح دین نے کہا، ''ہاں، کافی۔''

''اور کس طریقے سے یہ قرار دیا جائے گا کہ فلاں کی آنکھیں واقعی چشم بد ہیں؟''

صلاح دین مسکرایا۔ ''ہم کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیں گے۔''

''ایسا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوگا۔''

''سب کچھ منحصر ہے،'' اس کے ہونے والے بہنوئی نے جواب دیا۔ ''مثال کے طور پر—''

''مثال کے طور پر،'' جون نے بات کاٹی، ''کوئی شخص بالکل ذاتی وجہ سے کسی شخص کی آنکھوں

Scanned with CamScanner

کوضرر رساں سمجھ سکتا ہے۔ اس صورت میں تم کیا کرو گے؟''

صلاح دین نے اپنے ہونے والے سالے کی بات سنتے ہوئے مسکرانا جاری رکھا، مگر اب اس کی نیم خشم گینی اس کے چہرے سے ایک نقاب کی طرح الگ ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو،'' اس نے کہا۔ ''بہرحال اس طرح کی صورت سے نپٹنے کے لیے مرکزی مجلس اور اس کی تمام خودمختار شاخیں ایک دفتری مراسلے کی ہدایات پر عمل کریں گی جس میں چشم بد کی تمام تفصیلات درج ہیں۔''

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر دوبارہ کہنا شروع کیا:

''خود میری آنکھیں بھی ہلکے رنگ کی ہیں، مجھے بھی مشکوک سمجھا جانا چاہیے۔ بلکہ مجھے تو مرکزی مجلس کے پاس سے بھی نہیں گزرنا چاہیے۔ مگر صرف ظاہری علامت پر فیصلہ نہیں ہوتا۔ میرے کام میں کچھ خفیہ باتیں بھی ہیں جنھیں میں آپ لوگوں کے سامنے بھی نہیں کہہ سکتا۔ ہم تمام پہلوؤں کا بہت احتیاط سے جائزہ لیتے ہیں اور جب تک ضروری ہوتا ہے مشکوک شخص کی پوشیدہ طور پر نگرانی کرتے ہیں۔''

''پوشیدہ نگرانی؟ خوب! یہ نئی بات ہے،'' بھائی نے کہا۔

''واقعی!'' الیکس کی بیوی اچانک بول اٹھی۔

صلاح دین نے تائید میں سر ہلایا۔

''پھر بھی،'' جون بولتا گیا، ''مجھے بالکل یقین نہیں کہ چشم بد کو معلوم کرنے کا عملی طور پر کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔''

صلاح دین نے کچھ نہیں کہا۔

الیکس نے اپنے بیٹے پر ناپسندیدگی کی نگاہ ڈالی، جو رائیگاں گئی۔

''میرے خیال میں بالکل ٹھیک یہی بات ہے جس میں کورفرمان کی اصل طاقت چھپی ہوئی ہے،'' جون بولتا گیا۔

''کہاں چھپی ہوئی ہے؟'' اس کے ہونے والے بہنوئی نے پوچھا۔

جون نے فوراً جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے کہا:

Scanned with CamScanner

''اس میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں ہے کہ کورفرمان نے لوگوں کو ایک زلزلے کی طرح کا جھٹکا دیا ہے اوران کو سلطنت میں جاری کردہ کسی بھی فرمان سے زیادہ پریشانی میں ڈالا ہے۔اس کی خوفناک طاقت کا راز اس بات میں ہے کہ یہ اتنا غیرواضح ہے۔کورفرمان کی وجہ سے ہم میں سے ہرایک اپنے ہمسائے پرشبہ کرنے لگا ہے۔کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ہم سب خود کو قصوروار سمجھنے لگے ہیں۔''

''جہاں تک میرا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ کسی بھی اہم فرمان کو طاقت عدل اور انصاف کے اس تاثر سے حاصل ہوتی ہے جس کا وہ حامل ہوتا ہے۔'' صلاح دین کا لہجہ غصہ دلانے والا نہیں بلکہ کسی حد تک دوستانہ تھا۔

''کیا سچ مچ کچھ گمنام خط پہنچے ہیں اوراب وزیراعظم مصطفیٰ پاشا پر بھی شبہ کیا جارہا ہے؟'' جون کی بیوی نے بیچ میں دخل دیا، شاید گفتگو کا رخ ایک دوسری جانب موڑنے کے لیے۔

صلاح دین نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا، ''مجھے نہیں معلوم، یہ صرف افواہ ہوسکتی ہے۔''

''پچھلے سال اسی طرح ایک افواہ وزیر بصری کے بارے میں پھیلی تھی، جو سچ ثابت ہوئی اور وزیر کو پھانسی پانا پڑا۔''

''اس طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں،'' الیکس یورا نے کہا۔ وہ اس بات کو یقینی بنانے پر مستعد تھا کہ اس مرتبہ کوئی اشتعال انگیز یا غیرمحتاط تبصرہ اس کی میز پر سے نہ کیا جائے۔

الیکس نے اپنی بیٹی کی نگاہوں میں خواہش کی جھلک کو دیکھ لیا تھا: اس کی آنکھیں منگنی کے ابتدائی دنوں سے مختلف انداز میں چمک رہی تھیں۔

دو ہفتے پہلے، دن کے کھانے کے بعد، اسی وقت کی طرح جواَب ہے، اس نے سوچا تھا کہ شاید اس نے ان کے اوپر خواب گاہ میں جانے کی آواز سنی ہے۔وہ ایک لمحے کے لیے بدحواس ہوگیا تھا، مگر اس نے پیچھے مڑکر دیکھنے سے گریز کیا، جیسے کوئی شخص کسی بدروح کو دیکھنے سے بچنا چاہتا ہو۔

''کیا فرمان جلد نافذ ہوجائے گا؟''

اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا — وہ یہ الفاظ کس طرح ادا کرسکتا ہے؟

''نافذ؟'' صلاح دین نے دہرایا۔ ''ہاں، جلد ہی نافذ ہوجائے گا۔اسی ہفتے ہوسکتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

6

جمعہ کو فجر سے پہلے ہی طبل بجنے شروع ہو گئے، اس بار یہ بتانے کے لیے کہ کورفرمان عمل میں لائے جانے کو ہے۔

دوسرے دن تک رضا کاروں کے پہلے دستے کے ناموں کی فہرست جاری کر دی گئی۔ اخباروں میں کورفرمان کے نفاذ کی اطلاع کی جلی شہ سرخیوں کے بالکل نیچے ان لوگوں کے خاندانی ناموں کی فہرست تھی جنھوں نے پہلے پہل خود کو کورآفسوں میں پیش کیا تھا، نقد انعامات اور تاعمر وظیفوں کی تفصیلات کے ساتھ جو انھیں دیے گئے تھے۔

کئی اخباروں نے دارالسلطنت کے ایک محل کے خدمتگار عبدالرحیم کا بیان شائع کیا: ''میں بڑی خوشی سے آنکھوں کی قربانی دے رہا ہوں۔ علاوہ اس فخر کے کہ میں سلطنت کے مفاد میں کام کرنے کا اہل ہوں، میں کورفرمان کا مشکور ہوں کہ اس کی وجہ سے میرے ضمیر کی یہ خلش دور ہو گئی کہ میری آنکھیں مزید مصائب کی وجہ بن سکتی تھیں۔''

اگلے منگل کو منادی کرنے والے پھر آ گئے، چشم بد کے حاملوں کو کورآفسوں میں طلب کرنے اور یہ بتانے کے لیے کہ وہ صرف اپنی جانب سے پہل کرنے کی صورت میں انعامات اور وظائف حاصل کر سکیں گے۔ ''پیغمبر کا قول ہے کہ چشم بد کے ساتھ پیدا ہونا کوئی گناہ نہیں،'' وہ کڑک کر بول رہے تھے۔ ''گناہ گار وہ ہے جو اس کو چھپاتا ہے۔''

اخباروں نے آزارِ چشم کے واقعات پر مبنی خبریں چھاپنی شروع کر دیں۔ سلیم نامی ایک شخص جھاڑیوں کے پیچھے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا؛ وہ اپنی چشم بد سے ایک زیرِ تعمیر پل کو گھورتے ہوئے اس کی محراب کو گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اینٹیں چننے والے مزدوروں نے راہ گیروں کی مدد سے اس کو زنجیروں سے باندھ کر موقعے پر ہی اندھا کر دیا۔ اخبار میں یہ اطلاع نہیں تھی کہ کون سا طریقہ استعمال کیا گیا؛ باور کیا جاتا ہے کہ تین سخت ترین طریقوں میں سے ایک رہا ہوگا، یا پھر اینٹیں چننے والوں نے خود کوئی بالکل مختلف اور زیادہ سفاک طریقہ ایجاد کیا ہو۔

کورفرمان کے متعلق اخباروں میں اکادکا خبریں ہی شائع ہوئیں، مگر کورآفسوں میں لوگوں کے اژدہام میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ رضا کار پیغام رسانوں کا آنا جانا لگا رہا۔ چشم بد کا شکار اب شباب پر

Scanned with CamScanner

تھا۔کورآفسوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ جاری تھا۔جب کسی آفس میں کارروائیاں سست پڑ جاتیں، کارکن رات کو دیر تک جان مارتے اور پھر ایک دوسرے کو اپنی اپنی گلی میں ایسے لوگوں کے ناموں کی فہرست تھماتے جن کی آنکھیں مشکوک ہوسکتی تھیں مگر جو اس وقت تک توجہ میں آنے سے بچ گئے تھے۔

اسی دوران ان لوگوں کے خلاف ناکام دھمکیوں کا سلسلہ چلتا رہا جو جلیل القدر کورفرمان کو برا کہتے تھے۔یہ لوگ اس کے باوجود اس پر لعنتیں بھیجتے، اس کے نام کو سیاہ فرمان یا طاغوتی فرمان یا ہلاکتی فرمان کہہ کر بگاڑتے رہے۔کورفرمان کے خلاف افواہوں کو روکنے کی کوششوں نے بھی صرف افواہوں کو اور زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔حالیہ دنوں میں، مثال کے طور پر، وزیراعظم سے متعلق ایک افواہ نے گردش کرنا شروع کیا تھا کہ اس پر، سلطان کا دستِ راست ہونے کے باوجود، چشم بد کا حامل ہونے کا شبہ ہو چکا ہے۔ایک گمنام مکتوب نگار اس کا نام تجویز کرنے کی گستاخی کر چکا تھا۔

ہر شخص پر واضح تھا کہ مخبری اور زہر آلود قلم سے لکھے خطوں کی لہر بلندی تک اُمڈ رہی ہے۔لوگ سڑک پر ڈاک گاڑی کی جھلک دیکھتے ہی خوف سے رک جاتے جیسے کہ انھیں معلوم تھا کہ اس کی کھیپ کا کم از کم آدھا حصہ صرف اسی طرح کے مراسلوں پر مشتمل ہے۔

اُن اداس دنوں میں سے ایک دن جب میری نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کیا اور کھڑکی کی طرف گئی، اس نے اپنے منگیتر کو باہر سڑک پر دیکھا۔وہ کسی ممکنہ خطرے سے بچتا ہوا اور شاید معمول سے زیادہ بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔دوپہر کے کھانے کے دوران، اس کے باپ کی ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوششوں کے باوجود، بات چیت بمشکل ہی آگے بڑھ سکی۔

وہ اپنے منگیتر کو سڑک پر آہستہ آہستہ جاتے ہوئے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ وہ روش کے درختوں کے سائے میں گم ہو گیا۔اور وہی خیال اسے پھر آیا: وہ ضرور کسی بات سے پریشان ہے۔

اس نے ممکن وجوہ کی ایک فہرست تیزی سے اپنے ذہن میں تیار کی — کام کی زیادتی، دفتری سازش، ضمیر کی خلش ... آخر میں وہ اس شک میں پڑنے لگی کہ یہ صرف اس کا تصور ہے؛ کسی کسی دن ہر آدمی پر بیزاری کا دورہ پڑتا ہے، اور اگر کوئی کہہ دے کہ آج تم کچھ ٹھیک نظر نہیں آرہے ہو، تو دورہ اور شدید ہو جاتا ہے۔ضرور ایسا ہی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔

Scanned with CamScanner

نیم ملبوس وہ آئینے کے پاس گئی اور اپنے آپ کو دیکھا، پہلے ایک زانو جھکاتے ہوے اور پھر دوسرا۔ دائیں ران کے اوپر اسے دو نیلی خراشیں نظر آئیں — پچھلے اتوار کی نشانیاں۔ تازہ ترین خراشیں دو تین دن تک نمایاں نہیں ہوں گی۔ اس نے ایک لمحے کو اپنے چکنے پیٹ کو دیکھا اور نیچے اس سیاہ ریشمی گچھے کو جو اس کی رانوں کے جوڑ کو ڈھانپے ہوے تھا۔ پھر وہ قالین پر اپنی ٹانگوں کو آدھا موڑ کر بیٹھ گئی اور اپنی اندامِ نہانی کو غور سے دیکھا۔ ''اب یہ بالکل غیر متلاطم ہے،'' اس نے سوچا، ''جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔''

7

''تمھارا وزن بہت کم ہو گیا ہے،'' میری نے اپنے منگیتر سے کہا، جب وہ خواب گاہ کا دروازہ بند کر چکے۔ ''کیوں؟ کیا یہ اس ڈھیر سارے کام کی وجہ سے ہے جو تمھیں کرنا پڑتا ہے؟''

''ہاں، میرے پاس بہت کام ہے... '' ایک توقف کے بعد اس نے پھر کہا، ''بہت زیادہ۔''

''چلو اب تم کام کو بھول جاؤ۔'' اب وہ شرم و حیا کو پوری طرح ترک کر چکی تھی۔ وہ بستر پر اس کے پاس لیٹ گئی اور اس کے جسم کو اپنے بازوؤں اور ٹانگوں میں لپٹا لیا۔

چند لمحوں بعد، جب وہ پرسکون ہو کر لیٹے ہوے تھے، صلاح دین کی نگاہ میری کی برہنہ ران کے نیلے نشانات پر پڑی جو اسے کسی سرکاری مہر کی طرح نظر آئے۔ میری نے سوچا شاید وہ کوئی شوخ سا تبصرہ کرے گا، مگر اسے بہت حیرت ہوئی کہ جو کچھ اس نے کہا اس کی نوعیت بالکل دوسری تھی۔

''کیا تم نے کبھی قوپرولو سے مدد مانگی ہے؟''

میری نے اپنے شانے حیرت سے جھٹکے۔ ''کیوں؟''

''کوئی خاص بات نہیں... یونہی میں نے دیکھا ہے کہ تم لوگ ان کے بارے میں شاید ہی کوئی بات کرتے ہو۔''

''یہ سچ ہے۔ وہ واقعی ہمارے رشتے دار ہیں، مگر صرف بہت دور کے... اور پھر، میرے والد کا جنگی مزاج...''

''اچھا،'' اس نے خراش پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا۔

میری نے اپنی انگلیاں اس کے سینے پر دوڑائیں۔
"تم پریشان لگتے ہو،" اس نے چہکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔
اس کے منگیتر نے اپنی آنکھیں دوسری طرف موڑلیں۔
"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
"کیا تم پر کام کا بوجھ ہے؟"
منگیتر نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "بالکل نہیں، میرے پاس کوئی وجہ نہیں... اس کے برخلاف..."
"اس کے برخلاف سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"
"غصہ دلانے والے سوال بند کرو!"
"ٹھیک ہے، اگر تم ایسا سمجھتے ہو۔" وہ واضح طور پر ناراض ہو کر بولی۔ اس نے اپنی پشت اس کی طرف کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا منگیتر اس چادر کو دبائے رکھے رہا جو وہ اپنے پیٹ کے اوپر ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے منگیتر کی آنکھوں میں ایک خاص، تقریباً غیر فطری چمک نے اس کی ناراضگی کو پل بھر میں دور کر دیا اور اس نے اپنے منگیتر کے چہرے کو بڑی توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔
اس کے منگیتر کی نگاہیں اس کی رانوں کے بیچ جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ انھیں پہلی بار دیکھ رہا ہے۔
"تین ہفتوں میں ہماری شادی ہو جائے گی اور ہم گھنٹوں ساتھ رہا کریں گے۔"
"ہاں... شاید مجھے اُس وقت جمع کی ہوئی چھٹیاں مل جائیں۔"
"سچ؟ کتنا اچھا لگے گا! ہم دیر سے سو کر اٹھیں گے، آدھی آدھی رات جاگیں گے، کتنا مزہ آئے گا۔ ہم اپنا کھیل دوبارہ شروع کریں گے، نیند میں ڈوبے ہوئے، بیچ رات، اندھیرے میں۔"
وہ کانپ اٹھا، جیسے جاگتے کے خواب سے ابھی ابھی اس کی آنکھ کھلی ہو۔ "بیچ رات... اندھیرے میں..." وہ تقریباً چیخ رہا تھا۔
"شش... آہستہ بولو... تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"
"بیچ رات... اندھیرے میں..." اس نے پھر کہا، اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔
میری نے آہستہ سے اس کی گردن اور ماتھے کو سہلایا۔

Scanned with CamScanner

''کوئی بات تمھیں تکلیف پہنچا رہی ہے،'' اس نے سرگوشی میں کہا، جیسے کسی سوئے ہوئے آدمی سے بات کر رہی ہو۔ ''پریشان مت ہو۔ تم صرف قانون کا اطلاق کر رہے ہو۔ پچھتاوے ان لوگوں کے لیے چھوڑ دو، جنھوں نے اس شیطانی آندھی کا بیج بویا ہے۔ . . . ضمیر کی خلش اُن کو ہونی چاہیے۔ . . . چلو ہم اپنا کھیل پھر شروع کریں، میرے محبوب . . .''

8

آخرکار یہ سن لیا گیا کہ وزیراعظم کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ اب وزیراعظم کے تمام قریبی شناسا اور ہمکار خوب جانتے تھے کہ ان کے آقا کی ڈراؤنی آنکھیں تھوڑی سی بھینگی تھیں۔ لوگوں کو حیرت اس پر تھی کہ سلطان نے، جس کی عقابی آنکھوں سے کچھ بھی اوجھل نہیں ہوتا، بہت پہلے ہی اس پر توجہ کیوں نہیں دی تھی۔

''یہ اتنا آسان نہیں،'' دوسرے لوگوں نے کہا، ''سب جانتے ہیں کہ تمام بھینگی آنکھیں شر نہیں پھیلاتیں؛ اس کے لیے دوسرے مخصوص خدوخال بھی ضروری ہیں۔''

وزیراعظم کے زوال کے فوراً ہی بعد، ابتدائی افواہوں نے پھر سے نئی شدت کے ساتھ پھیلنا شروع کیا۔

''ہم نے کہا نہیں تھا کہ سارے قتلِ عام کا مقصد صرف وزیراعظم کو ختم کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اگر یہی بات تھی،'' جواب آیا، ''پھر یہ بتلائیں کہ اب جب یہ مقصد پورا ہو چکا ہے تو مہم کو ختم کیوں نہیں کیا گیا؟''

''صرف لوگوں کو دکھلانے کے لیے۔ ویسے بھی، جیسے دہشت کے کارخانے کو کھولنے میں کچھ وقت لگتا ہے، اسی طرح اس کو بند کرنے میں بھی وقت چاہیے ہے۔''

9

وہ ایک ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ میری بالکل برہنہ تھی، اس کا منگیتر آدھے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے میری کو حقیقت چند لمحے پہلے بتائی تھی۔ میری نے چیخ نہیں ماری، زاروقطار رونا نہیں

Scanned with CamScanner

شروع کیا، جیسے کہ وہ اس اعتراف کا پہلے سے خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ اپنے منگیتر کی بات سن کر اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ صرف جب وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی تو منگیتر نے اس کے آنسوؤں کو اپنے گال پر محسوس کیا۔ شاید اسی راستے سے تیزاب میری آنکھوں کو جلانے کے بعد میرے گالوں کی ہڈیوں میں قطرہ قطرہ جذب ہوگا، اگر میری ازمنۂ وسطیٰ کے طریقے سے (یعنی تاریکی میں قید کے ذریعے) اندھا کیے جانے کی درخواست رد ہو جاتی ہے۔

''اس سے بھی بدتر پیش آ سکتا ہے،'' دفتر کے ایک ہم منصب نے کہا تھا۔ ''ذرا بازنطینی طریقے کے بارے میں سوچو۔ تبتی طریقے کا تو نام بھی مت لو، وہ تو سب سے زیادہ بھیانک ہے۔''

''یعنی جب تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم ہماری شادی کے بعد رخصت طلب کرنے والے ہو، تمھیں معلوم ہو چکا تھا؟'' میری نے پوچھا۔

''ہاں۔ اسی دن مجھے بتایا گیا تھا کہ مجھے دفتر سے علیحدہ کیا جا رہا ہے۔''

''اوہ!'' اس نے کہا۔ ''مگر تم نے کیسے یہ بات مجھ سے چھپائی؟ کیوں نہیں بتایا؟''

''میں تمھیں بالکل آخر میں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت تک امید تھی، کیونکہ کہا گیا تھا کہ میں دارالسلطنت ہی میں ٹھہروں، جب تک مخبری کا جائزہ مکمل نہیں ہو جاتا۔ مگر وہ تھوڑی بہت امید بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی... میرے خلاف اطلاع قبول کر لی گئی ہے۔''

''مگر کیوں؟ کیوں؟'' میری نے اپنی چیخ کو دباتے ہوئے دہرایا۔

''اور، میں خود کو خصوصی طور پر غیر مشکوک آنکھوں والا نہیں سمجھتا... مگر ہماری بینائی ختم کرنے کا ایک معقول سبب ہے۔ تمام نشانیاں مٹا دینی ہیں۔''

''کیا؟ میں نہیں سمجھی۔''

''بہت آسان ہے — ہم ان بہت سی چیزوں کے گواہ ہیں جنھیں مٹایا جانا ہے۔''

''تم کون؟''

''ہم تمام لوگ جنھوں نے گزشتہ رات تک کور مجلس میں کام کیا ہے۔ ہماری آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے جو انھیں دیکھنا نہیں چاہیے تھا۔ سمجھیں تم؟''

''چیزیں جو تمھیں نہیں دیکھنی چاہیے تھیں...'' اس نے دم توڑتی ہوئی آواز میں دہرایا۔

Scanned with CamScanner

''ہولناک چیزیں؟''

''کبھی کبھی ہم تک وہ فہرستیں لائی جاتی تھیں جو مقتدرہ اعلیٰ میں پہلے ہی منظور کی جا چکی ہوتی تھیں،'' اس نے کہا۔ ''تفتیش صرف پس دیدگی کے طور پر کی جاتی تھی۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے... یعنی بدلہ چکانے کے بارے میں وہ تمام افواہیں تقریباً سچ تھیں؟''

منگیتر نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اس سے اور زیادہ قریب ہو کر لپٹ گئی۔

''دوسروں کا کیا ہوا؟'' اس نے ایک لمحے کے بعد پوچھا۔ ''کیا وہاں کام کرنے والے ہر شخص کا یہی انجام ہوگا؟''

''ہوسکتا ہے نہ ہو۔ سب سے پہلے عتاب میں آنے والے وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں سمجھا جا رہا ہے کہ وہ زبان کھولنے کے اہل ہیں۔''

''زبان کھولنے کے اہل...'' میری نے دہرایا۔ ''تو اس میں آنکھوں کا کیا کام ہے؟ ضرورت تو زبان بند کرنے کی ہے۔''

''زبان کی باری شاید اگلی بار آئے،'' اس نے بات کاٹ کر کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی بات میں اضافہ کیا: ''اور کیا! اگر آنکھوں کا نکالا جانا کسی کو عبرت دلانے کے لیے کم پڑ جائے۔''

''یا خدا!'' میری نے سسکی بھری۔

''ہر صورت میں، اگر ہم میں سے کسی پر شبہ نہ بھی کیا جاتا، کچھ لوگ ضرور قربان کر دیے جاتے۔''

میری نے اسے پریشان نگاہوں سے دیکھا — وہ بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کہا گیا ہے۔

''ہمیں سزا دی گئی ہے تاکہ جو کچھ گزرا ہے اس کی دہشت کا ایک حصہ ہمارے سر ڈال دیا جائے۔ تم میرا مطلب سمجھیں؟ ہر شخص اپنی مصیبتوں کا الزام ہم پر ڈالے گا... ہماری ان غلطیوں پر جو ہم نے نہیں کیں۔

''جب سے لوگ مجلس کی غلطیوں کے بارے میں بولنے لگے،'' اس نے کہا، ''میرا دل ڈوبنے

لگا، مگر اس بات کو ذہن سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ پھر، شروع شروع میں جب افواہیں دوبارہ گردش کرنے لگیں، میرے شریک کار نے کہا، اب یہ ہماری باری ہے۔"

"کیا یہ صرف اتفاق تھا، یا اسی وجہ سے تم مجھ سے اُس دن قوپرولو کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟"

"نہیں، اتفاق کہاں تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم کیا جواب دو گی۔ قوپرولو خود اپنی مشکلات میں گرفتار ہیں۔ مگر ایک ڈوبتا ہوا آدمی ہر سہارا ڈھونڈتا ہے۔"

"اب میں سمجھی کیوں میرے بیچ رات، اندھیرے میں کہنے سے تم پر ایک طرح کا دورہ پڑ گیا تھا۔"

"ہاں، میں نے اس وقت محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اب میں رات کی دنیا کا باشندہ ہونے والا ہوں۔"

میری اس کے جسم کو بہت دیر تک چھوتی رہی۔

"جب تک میں یہاں ہوں، تم اسی دنیا میں رہو گے، روشنی کی دنیا میں —"

اس کے منگیتر کی آنکھوں میں بے پناہ تکلیف کے سرمئی سائے تھے۔

"کیا بالکل کوئی امید نہیں؟" اس نے کہا۔ "کیا بچاؤ کا کوئی راستہ ہے؟"

اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"تفتیش کہاں ہوتی ہے؟ کہاں فیصلہ ہوتا ہے، تمھارے معاملے میں؟"

"شاید کہیں بھی نہیں۔ شاید فیصلہ ایک دن میں ہو گیا، جیسے زہر آلود قلم سے لکھے ہوئے خطوط کے معاملے میں ہوتا تھا۔۔۔ تمام نشانیوں کو مٹا دینا ہے، بالکل!"

اس نے بے مقصد سوالات کو بند کرنے کا سوچا اور دوبارہ اسے پیار سے لپٹانے لگی۔ منگیتر نے مشکل سے اس کے غم خوارانہ بوسوں کا جواب دیا۔ مگر اس کی آنکھوں میں نہایت افسردہ چمک تھی۔ اس نے اس کی چھاتیوں کو گرسنہ نظر جما کر دیکھا، پھر اس کی بالائی ران کے نیلے نشانات کو، اس کے پیٹ کو، اور پھر اور نیچے اس کی ٹانگوں کے درمیان، جو اس نے کھول دیں تا کہ وہ اس کی اندام نہانی کو اور زیادہ آسانی سے دیکھ سکے۔

Scanned with CamScanner

''وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا ہے کہ وہ میرے جسم کو مکمل طور پر ذہن نشین کر سکے،'' اس نے سوچا۔

''میں اپنے ذہن میں تمھاری نقش کی ہوئی شبیہ کے ساتھ زندہ رہوں گا،'' اس نے کہا، جیسے کہ اس نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا ہو۔

''میں تمھارا انتظار کروں گی،'' میری نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ ''سمجھے تم؟ میں تمھارے اُس جگہ سے واپس آنے کا انتظار کروں گی۔۔۔۔ میں صرف تمھارے لیے زندہ رہوں گی۔ اور اگر تم مجھے اپنے ذہن میں اس طرح نہیں نقش کرو گے جو میں آج لگ رہی ہوں، میں مر جاؤں گی۔ میں اپنی زندگی، اپنی شکل وصورت کھو دوں گی۔۔۔۔ میں بالکل اسی جیسی رہوں گی جس طرح تمھیں یاد آؤں گی۔۔۔۔ اور جب تم جان بوجھ کر مجھے اپنے دل سے مٹا دو گے، میں سچ مچ غائب ہو جاؤں گی، کھرچی سے مٹائی ہوئی کسی تصویر کی طرح۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور صرف اس کے جسم کے اُس حصے کو جسے وہ چند منٹ پہلے تک اصرار کے ساتھ دیکھ رہا تھا، آہستہ آہستہ سہلانا جاری رکھا۔ میری نے محسوس کیا کہ جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ اس کے اوپر رکھا، اپنی آنکھیں موند لیں۔ ''وہ تصور کر رہا ہے کہ مجھے چھونا کیسا لگے گا جب وہ دیکھنے کے قابل نہیں رہ جائے گا،'' اس نے سوچا۔

وہ زار و قطار روتے روتے پاگل کی طرح چلانے والی تھی، صرف اس بدقسمتی پر نہیں جو اس پر نازل ہونے والی تھی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور وجہ سے جس کا وہ خود سے اعتراف نہیں کر سکتی تھی: صلاح دین سے ابھی ابھی کیے ہوے وعدے کو نبھانے کی اہل نہ ہونے کا خوف۔

''میں بھی اپنی آنکھیں نکلوا دوں؟'' اچانک اس نے سوال کیا، جیسے اس پر سرسام کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ''ہم دونوں ایک ہی دنیا کے باشندے ہو جائیں گے۔۔۔۔ پھر اگر میں چاہوں بھی تو تمھیں چھوڑ نہیں سکوں گی۔۔۔'' اس کے الفاظ اپنے آنسوؤں میں لتھڑ گئے تھے اور وہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر میں اس نے کیا کہا۔

''پاگل مت بنو،'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''تم نے ابھی تو اتنی اچھی باتیں کی تھیں، اب تمھیں کیا ہو گیا جو ایسی باتیں کر رہی ہو؟''

وہ پھر ہم آغوش ہو گئے، اور پھر اس نے کہا، ''ہم رات اور دن کی طرح ساتھ ساتھ ہوں گے، میں تمھاری رات بن جاؤں گا اور تم میرا دن بن جاؤ گی۔ ٹھیک ہے؟''

میری زور زور سے رونے لگی، وہ جواب نہیں دے سکی۔ اس نے آنسوؤں کو ضبط کرنا چاہا، مگر دلخراش ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

10

اب یہ بالکل واضح تھا کہ مہم کو سمیٹا جا رہا ہے۔ اگرچہ منادی کرنے والوں نے چوک پر آ کر حالات کے معمول پر آنے کا اعلان نہیں کیا تھا، مگر سب کو یقین تھا کہ مصیبت کے دن گزر چکے ہیں۔ یکے بعد دیگرے کور آفسوں کو بند کیا جا رہا تھا، اور بہت سے لوگوں کو تو ایسا لگا جیسے کبھی کوئی کور آفس تھا ہی نہیں۔ قہوہ خانے گاہکوں سے پھر بھرنے لگے جن کے چہرے اندھی تقدیر کا شکار نہ ہونے کی خوشی سے تمتما رہے تھے۔ وہ وحشت ناک الفاظ — جیسے آزارِ چشم، کور آفس، تجتی — جو محسوس ہوتا تھا کہ تاابد سننے میں آتے رہیں گے، اب متروک اور فراموش ہونے لگے تھے۔

میری کی سفید ران پر سے نشانات بھی دھیرے دھیرے مٹ گئے۔ اس نے سوچا شاید اسی طرح اس کی شبیہ بھی اس کے منگیتر کے ذہن سے محو ہو گئی ہو گی۔

خدا معلوم وہ کیا کر رہا ہے، کسی تاریک زمین دوز قید خانے میں، ہاتھ اور پیر بندھے — انھوں نے اسے اسی طرح باندھا تھا، لوگ کہتے، جیسے سزائے موت پانے والے کو باندھا جاتا ہے، تاکہ وہ اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کو نوچ کر اتار نہ پائے۔

ان کے ایک جاننے والے نے بتایا تھا زمین دوز قید خانے کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ قیدی ایک لمبی قطار میں، دن بھر، پہلو بہ پہلو نیم دراز پڑے رہتے تھے۔ کچھ بغیر رکے دعائیں مانگتے رہتے، کچھ خاموشی کے ساتھ اور کچھ بلند آواز میں روتے رہتے، کچھ خود سے گھنٹوں باتیں کیے جاتے۔ بہت سے پاگلوں کی طرح چلاتے، کورفرمان کو گالیاں دیتے، مگر آخر میں تھک کر معافیاں مانگنے لگتے اور خدا سے التجائیں کرتے کہ سلطان کی عمر دراز کرے۔ اور وہاں ایسے بھی تھے جو مذہبی لہر میں بہہ نکلے اور اپنے اندھے کیے جانے کے دن کا انتظار کرنے لگے تاکہ، ان کے اپنے الفاظ میں، اس نیم تاریک دنیا کو

دیکھنے سے آزاد ہو جائیں۔ کچھ ہذیان میں مبتلا ہو گئے اور وجد میں آ کر طویل تقریریں کرنے لگے۔ دنیا، وہ کہتے، اب زیادہ خوبصورت لگنے لگی ہے، اب جبکہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتے۔ بیشتر قیدی خاموش رہتے جیسے کہ ان کی گویائی چھن گئی ہو، اور اپنے بندھے ہوئے بازوؤں کو تھوڑی دیر بعد عجیب و غریب طرح سے ہلاتے جیسے وہ اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کے سامنے سے مکڑی کے جالے کو صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

اس کا علم صرف خدا ہی کو تھا کہ صلاح دین کیا کر رہا تھا۔ کیا اس نے میری کی شبیہ اپنے ذہن میں ثابت و سالم رکھی تھی یا وہ اب تک دھندلانا شروع کر چکی تھی۔

میری نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنے گال اور ہونٹوں پر رکھا جیسے کہ اس کی شبیہ کا دھندلانا اسے سچ مچ ختم کر دے گا۔ پھر اس نے اپنے بدن پر وہاں نظر ڈالی جہاں نیلے نشانات ہوا کرتے تھے، مگر اب وہ قریب قریب مٹ ہی چکے تھے۔

اس نے اپنے منگیتر سے کہا تھا کہ وہ انتظار کرے گی، مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ بات مکمل طور پر سچ نہیں ہے۔ وہ اس کا انتظار اپنے خیالوں میں کرے گی، وہ اسے کبھی نہیں بھولے گی۔

اس کے بعد والے پہلے اتوار جب گھر کے سب لوگ کھانے کی میز پر ایک ماتمی فضا میں جمع ہوئے، وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صلاح دین اُس جگہ جا چکا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اسے خود بھی یقین آ چکا تھا کہ اب اس کے اور اس کے منگیتر کے درمیان سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

اس کے بارے میں آخری اور واحد اطلاع جوان کے پاس تھی وہ یہ تھی کہ اس کی یوروپی طریقے سے اندھا کیے جانے کی درخواست منظور ہو گئی تھی۔

"اس کے بارے میں سوچنے سے کچھ حاصل نہیں،" اس کے باپ نے کہا۔ "ایک نابینا آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا تم جیسی کم عمر لڑکی کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ کسی بیماری سے یا خدا کی کسی مصلحت سے اندھا نہیں ہوا ہے بلکہ اسے سلطنت کے حکم پر اندھا کیا گیا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کمرے میں اپنی تنہائی پر رونے چلی گئی۔

اسے خوشی تھی کہ اس نے اپنے جسم کو اسے مکمل طور پر سپرد کر دیا تھا — اس کے بس میں اس سے زیادہ نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

11

سردی کا موسم شروع ہوتے ہی بینائی ضائع کردہ لوگ اچانک فٹ پاتھوں اور قہوہ خانوں میں اکٹھے ہونا شروع ہوے۔ ان کے ٹانک ٹوئیاں مارتے ہوے قدم گزرنے والوں کو رکنے اور حیرت سے دیکھتے رہنے پر مجبور کردیتے۔ شہر پر کورفرمان کا خوف مہینوں تک طاری رہا تھا، لیکن اس کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال نے لوگوں کو مفلوج ہی کردیا۔

لوگوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ کورفرمان کا نشانہ بننے والے گمنامی کی تاریک راتوں میں کھو گئے ہیں اور سڑکوں اور چوکوں میں صرف مانوس شکل وصورت کے اندھے ملیں گے، جو ان واقعات سے پہلے ہی اپنی آنکھیں کھو چکے تھے۔ مگر اب ان گنت نئے اور کہیں زیادہ مضحکہ خیز نابینا افراد باہر نظر آنے لگے۔ ان کی کچھ مخصوص باتیں تھیں جو انھیں عام نابیناؤں سے مختلف بناتی تھیں — ان کی زچ کردینے والی اکڑ چال اور ان کی چھڑیوں کی سڑک کے کھڑنجے پر دھمکاتی ہوئی ٹک ٹک ٹک کی آواز۔

سب سے نمایاں بات ان کا اجتماعی طور پر نمودار ہونا تھا۔ یہ شاید اتفاق نہیں تھا، اور نہ ان کے درمیان کسی خفیہ معاہدے کا نتیجہ تھا، جیسا کہ کچھ لوگوں کا، جو ہر بات میں سلطنت کے خلاف سازش ڈھونڈتے رہتے ہیں، خیال تھا۔ یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ زیادہ تر نابیناؤں کے لیے آنکھیں نکالے جانے کا زخم بھرنے یا اس سے پیدا ہونے والے اعصابی صدمے سے بحال ہونے کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

ان میں سے کچھ، اور خاص طور پر وہ جو اشرافیہ طریقے سے اندھے کیے گئے تھے، یعنی سورج کی شعاعوں کے ذریعے، وہ باوقار اور سنجیدہ انداز میں قہوہ خانوں اور چائے خانوں میں جاتے۔

دوسری طرف اور نابینا تھے جو چیتھڑوں میں ملبوس تھے اور پاؤں میں پہننے کے لیے ان کے پاس لکڑی کی کھڑاؤں کے سوا کچھ نہیں تھا، جس کی وجہ سے ان کے چلنے کی آواز خاص طور پر تنگ کرتی تھی۔

مگر صرف وہ لوگ ہی جو پرتشدد طریقوں سے اندھے کیے گئے تھے، آفت زدہ نظر آتے تھے۔ وہ بھی جنھوں نے خود کو کورآفسوں میں پیش کیا تھا اور تمام اعزاز کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا تھا،

Scanned with CamScanner

اب بوسیدہ کپڑوں میں زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چل رہے تھے۔

اسی طرح خوش پوش لوگوں کی بھی ایک تعداد تھی، پہلے سے بھی زیادہ عمدہ کپڑے پہنے ہوئے۔ جن لوگوں کی آنکھیں پر تشدد طریقے سے نکالی گئی تھیں وہ مجمعے کے بالکل روبرو، سرکشی کے ساتھ کھڑے ہوتے، جیسے کہ دنیا کو اپنی آنکھوں کے سیاہ اور خالی حلقوں سے للکار رہے ہوں۔

''وہ کیوں اپنی نمائش کرتے پھر رہے ہیں؟'' لوگ تعجب سے کہتے۔ ''انھیں کیوں نہیں باہر آنے سے روک دیا جاتا؟''

اندھوں نے اس طرح کی باتوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی۔ چائے خانوں کے کمروں اور قہوہ خانوں کی میزوں پر وہ نہ صرف گھنٹوں ڈٹے رہتے بلکہ قریب کی میزوں سے اخباروں کی بلند آواز میں پڑھی جانے والی خبروں کو سنتے اور بحث میں شریک ہوتے۔

ان میں کچھ چپ چاپ رہتے جبکہ دوسرے، اندھوں کی روایات کی پاسداری میں، کسی ایک ساز کو اٹھائے پھرتے اور اس پر اپنے موزوں کیے ہوئے رزمیہ اشعار یا عشقیہ نغمے گاتے۔

افواہ گشت کر رہی تھی کہ مستقبل میں ایک حکم جاری ہونے والا ہے جس کے بعد ان میں سے زیادہ تر کو سلطنت کے کسی دور دراز صوبے میں از سر نو آباد کیا جائے گا، تاکہ کم از کم غیر ملکیوں کی نظریں ان پر نہ پڑیں۔

مگر افواہوں کے برعکس، دسمبر کے آخری جمعے کو، عین اسی دن جب ایک خصوصی اعلان کے ذریعے ان لوگوں کو مکمل معافی دے دی گئی تھی جو پر تشدد طریقوں سے اندھے کیے گئے تھے، سلطنت نے ایک مفاہمتی ضیافت (جسے مقامی محاورے میں صدقہ کہتے ہیں) کا اہتمام کیا۔

اندھوں نے دعوت میں جانے کے لیے دارالسلطنت کے تمام محلّوں سے اپنی چھڑیاں کھٹ کھٹ کرتے نکلنا شروع کیا اور ایسی لبڑ دھگی مچائی کہ شہر کی انتظامیہ کو پورے علاقے میں کئی گھنٹوں کے لیے گاڑیوں کی آمد و رفت بند کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

درجنوں اہلکار انھیں خوش آمدید کہنے اور انھیں ان کی نشستوں تک لے جانے کے لیے موجود تھے، مگر جب اندھے بابِ عالی میں داخل ہوئے اور انھوں نے اپنی مخصوص کردہ نشستوں تک جانے کی کوشش کی، ایک طرح کا بلوہ مچ گیا۔

اندھوں کے مجمعے میں سے کسی نے کھڑاؤں پہنے خستہ حال آدمی کو ایک میز کی طرف ٹکراتے ہوئے جاتے دیکھا— یہ سابق وزیر اعظم کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

ایک طویل میز کے سامنے عدالت کے اعلیٰ حکام، سلطنت کے اراکین اور شیخ الاسلام کے خدم وحشم کے درمیان، بیٹھے تھے۔ اخبار نویسوں اور سفارت کاروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

حکام میں سے ایک نے ان سے خطاب کرنے کی کوشش کی، مگر زیادہ تر اندھے کھانے پر پل پڑے تھے اور مقرر کے الفاظ چھری کانٹوں اور برتنوں کے ٹکرانے کے شور میں غرق ہو چکے تھے۔

''ہر خرابی میں ایک تعمیر کی صورت مضمر ہوتی ہے،'' آسٹریا کے قونصل نے اپنے فرانسیسی ہم منصب سے کہا۔

''ہاں، ضرور،'' فرانسیسی نے جواب دیا۔

''کورفرمان کی وجہ سے ایک اور شگفتہ زبانی شاعری کو فروغ ملا ہے۔''

''آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں؟'' فرانسیسی قونصل نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اسے یاد آیا کہ ایک بار آسٹروی قونصل نے اسے بتایا تھا کہ وہ زبانی شاعری پر تحقیق کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے اسے آسٹروی قونصل کی یہ بات اسے سفاکانہ کے بجائے بے موقع سی لگی۔

''صرف اس مجمعے کو دیکھیں، آپ کو ثبوت مل جائے گا،'' آسٹروی نے مزید کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے،'' فرانسیسی قونصل نے ایوان کے اندر نظر ڈالتے ہوئے آہستہ سے کہا، جہاں اندھوں کا بے سرا پن چھت کو چھو رہا تھا۔

❁❁

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول ودوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید وتحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید وتحقیق)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید وتحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

وِجے تینڈولکر

سَکھارام بائنڈر

(تین باب میں کھیل)

مراٹھی سے ترجمہ:

وقار قادری

Scanned with CamScanner

وجے تینڈولکر (Vijay Tendulkar) نہ صرف مراٹھی زبان کے نمایاں ترین ڈراما نگار ہیں بلکہ انھیں بادل سرکار، گریش کرناڈ، حبیب تنویر اور موہن راکیش کے ساتھ ہندوستان بھر کے تھیٹر کی اہم ترین شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ تینڈولکر کے ایک کھیل کا اردو ترجمہ خاموش! یہ عدالت ہے کے عنوان سے آج کے شمارہ 16 (گرما 1994) میں شائع کیا گیا تھا۔ اس باران کے ایک اور کھیل سکھارام بائنڈر کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو براہ راست مراٹھی سے کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ وقار قادری نے کیا ہے جو اس سے پہلے دلت کتھا کے عنوان سے دلت مراٹھی ادیبوں کی کہانیوں کا ایک انتخاب مرتب کر چکے ہیں۔

وجے تینڈولکر 1928 میں مہاراشٹر کے شہر کولھاپور میں پیدا ہوئے اور 2008 میں پونا میں وفات پائی۔ ان کی تحریروں نے سماج کی مسلمہ اقدار اور منافقانہ اور انسان دشمن رواجوں کا ہمیشہ پردہ چاک کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی کھیل بڑے تنازعوں کا باعث بنے۔ سکھارام بائنڈر میں انھوں نے ایک غیر منصفانہ معاشرے میں مرد عورت کے رشتے اور اس میں مضمر عورت پر مرد کی بالادستی کی پرتیں کھولی ہیں۔ مسلمہ اقدار اور حاکمیت کو چیلنج کرنے کا یہ رویہ تینڈولکر نے صرف اپنی تحریروں میں نہیں اپنایا بلکہ ایک ایکٹوسٹ کے طور پر فاشزم کی عملی طور پر مزاحمت بھی کی۔ ایک موقعے پر ان کے اس بیان نے سخت ہلچل مچا دی تھی کہ اگر انھیں کوئی پستول ہاتھ لگ جائے تو وہ گجرات کے 2002 کے مسلم مخالف فساد کے بانی وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ کسی سماج میں موجود رویوں اور رجحانات کے بارے میں ایک واضح موقف اختیار کرنا اور اس کا برملا اظہار کرنا اس سماج کے ادیبوں کا حق ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔

Scanned with CamScanner

پہلا باب

پہلا منظر

(شام کا وقت۔ کسی محلے میں پرانے طرز کا ایک مکان۔ باہر کا کمرہ اور اس کے عقب میں دکھائی دینے والی رسوئی، یا کچن کہہ لیں۔ باہر بچوں کا شور وغل۔)

سکھارام : (باہر شور مچاتے بچوں پر چلّاتے ہوئے) اے کیا ہے؟ ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا کوئی ننگا ناچ ہو رہا ہے؟ بھاگو یہاں سے چلو۔ نہیں تو اتنا ماروں گا کہ چڈی گیلی ہو جائے گی۔

(خوفزدہ سی عورت چھاتی سے پوٹلی چمٹائے کھڑی ہے، اس پر لرزہ طاری ہے۔)

سکھارام : آؤ... گھر کو برابر دیکھ لو، اب اِدھر ہی رہنا ہے۔ اور یہ گھر بھی میرے ہی جیسا ہے۔ بعد میں کھِٹ کھِٹ نہیں چلے گی۔ (عورت جیسے تیسے پورے گھر پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لیتی ہے۔) برابر سے دیکھ لو، ٹھیک لگے تو پوٹلی کو نیچے ڈال دو، نہیں تو ایسے ہی باہر چلی جاؤ۔ یہ کوئی راجا کا محل نہیں، یہ سکھارام بائنڈر کا گھر ہے۔ سکھارام بائنڈر تمھارے پرانے والے مالک جیسا نہیں ہے۔ وہ کیسا ہے، یہ تمھیں الگ سے سمجھنا پڑے گا۔ سب گھوڑے بارہ ٹکے والا معاملہ یہاں نہیں چلے گا۔ اپنا دماغ بہت گرم ہے، بھڑک جائے تو بہت مارتا ہوں۔ منہ پھٹ ہوں، منہ میں بیڑی اور گالی ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ سارا گاؤں یہی کہتا ہے۔ حالت بہت اچھی تو نہیں، پن کھانے کو دو ٹیم مل جائے گا۔ دو ساڑیاں شروع میں، بعد میں سال کو ایک۔ وہ بھی مہنگی والی نہیں، معمولی۔ بعد میں کھٹ کھٹ نہیں چلے گی۔ گھر میں سب کام برابر کرنے کا، بھول چوک ہونے لگی تو باہر کا رستہ دکھاؤں گا۔ کوئی چھوٹ نہیں۔ بعد میں الزام نہیں دینے کا۔ اپنے گھر میں اپن راجا کی طرح رہتا ہے۔ میاں بیوی کی طرح رہیں نہ رہیں، مگر گھر میرے کو گھر کے جیسا چاہیے، سمجھی؟ (وہ جوں توں سر ہلاتی ہے۔) اس گھر کے پیچھے ایک کنواں ہے، پاخانہ دور ہے، گرمی میں کنواں سوکھ جاتا ہے، پانی ندی سے لانا پڑتا ہے، ندی سوا میل پر ہے۔ بارش میں اودھر بچھو نکل آتے ہیں۔ بنا کام کے باہر نکلنا بھی مجھے منظور نہیں ہے، گھر میں

کوئی آجائے تو گردن اوپر کر کے بات نہیں کرنے کا، جان پہچان نہیں ہو تو منہ پر آنچل لے کر صرف کام کی بات کرنے کا۔ میں نہ رہوں تو کسی کو گھر میں لینے کا نہیں۔ میں بھنگیوی، گنجیڑی، رنڈی باز، غریب، جو بھی ہوں۔۔۔ بلکہ ہوں، ہاں، شراب بھی پیتا ہوں، مگر اپنے گھر میں اپنی قدر ہونی چاہیے۔ اس گھر کا مالک میں ہوں، میرا لحاظ کرنا پڑے گا۔ کیا سمجھی؟ ساری باتیں منظور ہیں؟ یا کچھ کہنا ہے؟ اگر کچھ کہنا ہو تو باہر کا رستہ ناپو۔ اس گھر میں صرف میرا حکم چلے گا۔ دوسرا رہنے والا میرے حساب سے چلتا ہے۔ کیوں اور کیا پوچھنے کا نہیں۔ آخری بات جو کہنے کا ہے، شادی شدہ عورت کی طرح رہنا پڑے گا۔ اب سمجھدار کے لیے اشارہ کافی ہے۔ (وہ گھر دیکھتی ہے۔) میری بات قبول ہے تو ابھی جا کر چائے بنانا شروع کر۔ چولھے کے پاس دودھ وغیرہ ہے۔ (وہ جلدی سے اندر جاتی ہے۔ پوٹلی ایک جگہ رکھ کر چولھے کے قریب آتی ہے۔) ادھر کسی سے ڈرنے کا نہیں۔ یہ سکھارام بائنڈر سب کا وقت ہو کر رہ گیا ہے، پرمیشور کے باپ سے نہیں ڈرتا۔ (وہ اندر رسوئی گھر میں گھبرا جاتی ہے۔) اپن نے سب کیا مگر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ بتا تو دیا کہ رنڈی بازی کیا، دارو پیا، جو کچھ کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا، کون سے کوٹھے پر کتنی بار چڑھا، جس کو بولو بتا دوں۔ ہاں، مگر اب اُدھر نہیں جاتا۔ گاؤں میں سب چھپ چھپا کر جھک ماری کرتے ہیں، تیری بھی چپ میری بھی چپ۔ ارے ہمت ہو تو کرو کھلم کھلا، اس میں کیا ہے؟ سالا یہ جسم ہوس کا بھنڈار ہے، اسے بنایا کس نے؟ اُسی نے۔ پھر کیا اسے مالوم نہیں؟ باپ ہے وہ باپ سب کا، تمھارا ہمارا۔ (بیڑی جلا کر اسٹول پر بیٹھتا ہے۔) مگر اپن تھوڑے ہی کوئی سادھو سنت ہیں۔ انسان ہیں۔ یہ بھی قبول کہ اپنی پچھلی پوجا پاٹ سے تھوڑے ہی مٹنے والی ہے۔ کوئی چیز چاہیے تو سمجھو چاہیے۔ پھر چھپانا کیا؟ اور کس سے چھپانے کا؟ اپنے سب کے باپ سے؟

(وہ چائے بنانے کے لیے چولھے کے پاس بیٹھتی ہے، مگر اسے کسی چیز کی تلاش ہے، آخر کار رسوئی گھر کے دروازے پر آتی ہے۔ تھوڑا کھنکھارتی ہے۔)

سکھارام : (کچھ مطمئن ہو کر) ہاں بولو۔ میں بڑا منہ پھٹ ہوں، یہ سب سن کر بڑی تکلیف ہو رہی ہو گی۔ میں جنم سے ایسا ہی ہوں، ننگا پیدا ہوا، ماں کہا کرتی تھی اسے جنم سے شرم حیا ہے ہی نہیں، ہمیشہ کہتی کہ برہمن کے گھر میں مہار نے جنم لیا ہے۔ اب اگر مہار بن کر جنم لیا ہے تو تم جانو، وہ کیا

میرے کرم تھے؟ (وہ پریشان حال کھڑی ہے۔) لگتا ہے تم برہمن کے گھر کی ہو، اسی لیے تمھیں تکلیف ہورہی ہے۔ (وہ انکار میں سر ہلاتی ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے۔) لو! یعنی تم برہمن کے گھر کی نہ ہوتے ہوئے بھی برہمن، اور میں برہمن کے گھر جنم لے کر بھی مہارڈا۔ سالا مزہ ہے! گیارہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ باپ کی مار کھا کھا کر تنگ آ گیا تھا۔ میرا ہر کام اسے برا لگتا تھا، جیسے میں اس کا دشمن تھا۔ بہت مارتا تھا۔ تمھیں شاید کچھ چاہیے؟

عورت : وہ ماچس کی پیٹی اندر نہیں ہے۔

سکھارام : (اپنے پاس کی ڈبیا پھینکتے ہوئے) تو یہ لے لو۔ اور شرمانے کا نہیں، جو چاہیے وہ اس گھر میں مانگ کر لینے کا، نہ ملے تو شکایت نہیں کرنے کا، یہ راجا کا محل نہیں سکھارام بائنڈر کا گھر ہے۔ (وہ اندر جانے لگتی ہے، پھر ٹھہرتی ہے۔) اب اور کیا چاہیے؟ اس ٹین کے ڈبے میں چائے کی پتی ہوگی، یا ختم ہوگئی؟ پہلی والی نے بہت ساری کھپادی۔ بہت چائے پیتی تھی، ابھی شکروار ہی کو تو گئی ہے۔

عورت : دیو (بھگوان) کہاں ہیں؟

سکھارام : اچھا اچھا دیو! ہوں گے اندر کہیں، کباڑ میں پڑے۔ اُس سے پہلی والی کو ان کا شوق تھا، دو تین تصویریں تھیں شاید، لے گئی یا چھوڑ گئی مالوم نہیں۔ اس کے بعد دوسری آئی، اس کا ایسا کچھ شوق نہیں تھا۔ وہ پتی کے کُرتے کی پوجا کیا کرتی تھی، وہی جو اس کی جان لینے نکلا تھا۔ مگر اس کا بھگوان وہی تھا۔ جو جان لیتا ہے وہ ان کا بھگوان، جو جان بچاتا ہے وہ انسان۔ اُس کے کرتے کی پوجا دو سال تک یہاں کرتی رہی۔ ٹی بی ہوئی، اس لیے شکروار کو میرج کے ہسپتال پہنچایا۔ وہیں مرگئی۔ کُرتا تب بھی سرہانے دھرا تھا۔ اور سنو، چائے میں مجھے شکر بہت لگتی ہے۔ اور پتی بھی زیادہ ڈالنا، چائے بھی کڑک چاہیے مجھے۔ جاؤ جلدی کرو۔

(وہ اندر جاتی ہے۔ چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کی نظر الگنی پر پڑی ساڑی پر جاتی ہے۔ اسے تھوڑی دیر دیکھ کر، چولھا جلا کر چائے رکھتی ہے، پھر کچھ دیر کے لیے خیالوں میں گم ہو جاتی ہے۔ باہر سکھارام جیکٹ نکال کر کھونٹی پر لٹکاتا ہے۔ کھڑکی کی جانب اسے کچھ دکھائی دیتا ہے۔)

Scanned with CamScanner

سکھارام : ابے اے! تیری ماں کی، وہ دیکھ، جانور تیری باڑھ توڑ رہے ہیں۔ تیری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟ تھوڑا دھیان دیا کر، باڑھ بنوانے میں پیسے خرچ ہوئے ہیں۔

(اب وہ عورت یہ سب کچھ ناقابل برداشت جان کر آنکھیں زور سے بند کر لیتی ہے۔
سکھارام کھونٹی پر ٹنگا مردنگ اتار کر بیٹھ جاتا ہے اور اسے بجانا شروع کرتا ہے۔)

سکھارام : بہت اچھے۔ (وہ چائے لے کر آتی ہے، کھنکھار کر سکھارام کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔) ہاں دو مجھے۔ (وہ دیتی ہے۔ سکھارام چائے پیالی میں انڈیل کر چسکی لیتا ہے) آہاہاہا! (وہ یہ سن کر ڈر جاتی ہے۔) بہت اچھے۔ (وہ ڈری سہمی ہوئی سی ہے۔ سکھارام چائے پی کر پیالی میں کپ رکھ دیتا ہے، وہ اٹھا کر جانے لگتی ہے۔) تم بھی چائے پیو۔ جو چاہو لے لیا کرو، پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ایسے لاڈ نہیں ہوتے۔

(وہ اندر چلی جاتی ہے، اندر جا کر ایک کٹوری میں چائے انڈیل کر پینا چاہتی ہے کہ باہر سے آواز سنائی دیتی ہے: ''سکھارام ہو کیا؟'')

سکھارام : کون... داؤد میاں؟ آؤ اندر آؤ۔ (داؤد اندر آتا ہے۔)

داؤد : سلامالیکم... سکھارام۔

سکھارام : (اونچی آواز میں) باہر اور چائے دینا۔ (داؤد سے مخاطب ہو کر) الیکم سلام داؤد... آؤ بیٹھو۔

داؤد : سنا، نیا پنچھی لایا ہے؟

سکھارام : ہاں ابھی چلا ہی آرہا ہوں۔ ایک آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا۔ تمہارا کیسا؟ کیا چل رہا ہے؟

داؤد : ہمارا کیا؟ چل رہا ہے جیسے تیسے۔ (اندر رسوئی میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے) کہاں سے لایا؟

سکھارام : سوناونے سے۔ خبر ملی تھی، اس لیے سویرے ہی سے چلا گیا تھا۔ دھرم شالے میں تھی۔

داؤد : دکھاؤ تو ذرا! (نگاہیں اندر جھانکنے کی کوشش میں لگی ہوئی۔)

سکھارام : اب کی بار دیکھنے جیسا کچھ بھی نہیں ہے۔ چہرہ مہرہ کبھی ٹھیک ٹھاک رہا ہوگا، مگر شوہر

کی مار کھا کھا کر سارا رنگ اتر گیا ہے۔ (وہ چائے کی پیالی لے کر دروازے میں کھڑی ہے۔) تمھیں کیا بتاؤں داؤد میاں، اپن نے دیکھا ہے، یہ شوہر سالے پونے آٹھ ہوتے ہیں، اس لیے انھیں بچے نہیں ہوتے، اور غصہ نکالتے ہیں عورت پر۔ سالے اٹھتے بیٹھتے ڈھلائی کرتے ہیں۔ نامرد سالے! ارے وہ تو ٹھہری مٹی کی مورت۔

(داؤد اُسے دیکھ کر سکھارام کو چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ سکھارام دروازے کی طرف جا کر اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر واپس آتا ہے۔)

شوہروں جیسی نامرد جمات میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ ارے ان سے تو ہم بھلے۔ (داؤد چائے کی پیالی لے کر غمزدہ چہرہ بناتا ہے۔) ایسا نہیں کہ اپن ڈھلائی نہیں کرتے، وخت پڑنے پر دو چار ہاتھ اپن بھی لگا دیتے ہیں، یہ بات قبول ہے۔ مگر مردانگی جتانے کے لیے نہیں۔ اب اس مردنگ کو دیکھو، تپنے کے بعد کیسے بڑھیا بجنے لگتا ہے، ہے نا؟ اپنا بھی ویسا ہی ہے۔ اچھا ہوا یار، اپن کسی کے شوہر نہیں بنے۔ جو چل رہا ہے مست چل رہا ہے۔ ملتا سب کچھ ہے، اور بندھن کسی کے ساتھ نہیں۔ ایک دوسرے سے اُوب گئے، راستہ کھلا، کھیل ختم۔ سالی کوئی مگج ماری نئیں۔ اُس کے لیے آسرا اور اپنے لیے گھر کا بنا کھانا۔ سستے میں بھوک مٹ جاتی ہے۔ اٹھ کر کسی کے دروازے پر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور پھر وہ بھی گھر میں دب کے رہتی ہے۔ سمجھداری سے سارے کام کرتی ہے۔ ایمانداری سے رہتی ہے۔ کیونکہ اسے مالوم ہے، غلطی ہوئی تو باہر جانا پڑے گا۔ ویسے عورت ذات بڑی ہشیار ہوتی ہے، شادی ہونے پر اسے مالوم ہے، اب کہاں جائے گا شوہر؟ مگر شوہر بڑا لالچی، وہ عورت کو تو اپنا دیوانہ بنا لیتا ہے مگر خود نہیں بنتا۔ وہ آوارہ بھنورے کی طرح گاؤں بھر گھومنے لگتا ہے۔ نئیں... اپن تو کھلم کھلا بات کرتے ہیں میاں۔ اپنا اندر اور باہر کچھ الگ نہیں۔ لگی لپٹی رکھنے سے دکھ کے سوا کیا ملنا ہے اپن کو؟ اپن کسی کے لگتے ہی کیا ہیں؟

(مردنگ کے پاس بیٹھتا ہے۔ آگے بڑھ کر مردنگ اٹھا کر گود میں رکھتا ہے۔)

یہ مردنگ ہے نا؟ آج گود میں ہے۔ وقت آیا تو اسے اٹھا کر چھپر پر پھینک دوں گا، برا نہیں لگے گا، دوبارہ دیکھوں گا بھی نہیں۔ (مردنگ پر تھاپ مارتا ہے۔) ساری چیزیں جب تباہ ہونے والی ہیں، پھر بھلا ان میں جان لگا کر کیوں رہیں؟ اپنے ہاتھ سے کسی کا کچھ برا نہ ہو، زندگی خوشی سے گزر جائے بس،

Scanned with CamScanner

مگر دوغلا پن نہیں ہونا چاہیے۔ پاپ کرو تو ڈنکے کی چوٹ پر کہو کہ ہاں میں پاپی ہوں۔ سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اُدھر اوپر کیا چھپاؤ گے؟ اس نے جیسا پیدا کیا ہے، ویسے ہی تو سامنے آؤ گے۔ ایسا کام کرو کہ شرمانا نہیں پڑے۔ شرم بری ہے۔

داؤد: ہاں سکھارام، ہاں۔ (تکلف برتتے ہوئے) لیکن وہ نکالو نا...

سکھارام: کیا؟ چلم؟ (داؤد اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔) تو نام لینے سے کیوں شرماتے ہو؟ (کونے میں جا کر چلم اور دوسرا سامان نکالتا ہے۔) ارے میاں، گانجا کیا کسی رئیس کی رکھیل ہے جو سارا معاملہ گپ چپ چلے گا؟ ارے یہ تو رنڈی ہے، کوئی چوری چکاری کا معاملہ نہیں، جس کا جی چاہے جم کر کش لگالے، دو دم مار لے۔ تم سے کہتا ہوں میاں، رنڈی جتنی جلدی بھگوان کے قریب پہنچے گی دوسرا کوئی نہیں پہنچے گا، کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا، کیونکہ اسے ذرا بھی شرم نہیں ہوتی، سارا معاملہ کھلم کھلا۔ بھگوان کے سامنے بھی وہ گردن اونچی کر کے بولے گی، پیٹ کی خاطر زندہ رہی، مگر کسی کو دھوکا نہیں دیا، تکلیف نہیں پہنچائی، اپنے جال میں پھنسا کر فریب نہیں دیا۔ دیا ہے تو کسی کو سکھ ہی دیا ہے، آدم جاد کی کھجلی ہی مٹائی ہے۔ کھاج کھجلی، چھوٹا بڑا، امیر غریب، روگی نیروگی نہیں دیکھا، سب کو برابر برتا ہے۔ ہے بھگوان، پاپ کیسے ہوں گے دوسروں نے، میں پاپی نہیں ہوں۔

(اس بیچ اس عورت نے کباڑ سے دو تین تصویریں نکال کر، جھاڑ پونچھ کر، ایک جگہ پر سجا کر رکھی ہیں۔)

ٹھہرو انگارا لے کر آتا ہوں۔ (اندر آتا ہے، اسے بھگوان کی تصویروں کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھتا ہے۔) آگ چاہیے۔ (وہ چونکتی ہے، اٹھ کر چولھے کے پاس جاتی ہے۔) مجھے کھانا سات بجے لگتا ہے، جوار کی چار روٹیاں، ساتھ میں ہری مرچ اور لہسن کی چٹنی۔ لہسن اور مرچیں اس ڈلیا میں ہیں، جوار کے آٹے کا بڑا ڈبا ہے۔ (وہ ایک تھالی میں انگارا دیتی ہے۔) ایسے نہیں دیتے چلم کی آگ۔ (کونے میں پڑی پرانی دھوپ دانی اٹھاتا ہے۔) اس میں دیا کرو۔ (وہ دیتی ہے۔) تمھیں چاول چاہیے تو بنا لینا، اندر ہوں گے۔ پہلی والی کھاتی تھی۔ دیکھو کہیں دال بھی ہوگی۔ میں چاول نہیں کھاتا۔

(عورت سن لیتی ہے۔ سکھارام اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر، انگارے لیے باہر آتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد وہ کھانا بنانے کی تیاری میں لگ جاتی ہے۔ پھول دانی ملنے

Scanned with CamScanner

پر اسے بھگوان کی تصویروں کے سامنے لا کر رکھ دیتی ہے۔ باہر دور کہیں مندر کی گھنٹی بجنے کی آواز آتی ہے۔ وہ اس سمت ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتی ہے۔ باہر کے کمرے میں سکھارام اور داؤد گانجے کا دم مارنے میں مست ہیں۔)

سکھارام :او... ہوہو... بم بھولے، داؤد میاں، مزہ آگیا یار...

(اور یہ منظر اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔ مردنگ بجنے لگتا ہے۔)

دوسرا منظر

(روشنی ہونے پر، مردنگ بج رہا ہے۔ سکھارام باہر کے کمرے میں اسے بجا رہا ہے، اور وہ رسوئی گھر میں کچھ پھٹا پرانا بچھا رہی ہے۔ اس کے بعد بھگوان کو نمسکار کر کے، جسم سمیٹ کر، ہاتھ کا سرہانا بنائے سو جاتی ہے، سکھارام مردنگ ایک طرف رکھ دیتا ہے۔)

سکھارام :بم بھولے... (انگڑائی لے کر زور سے جماہی لیتا ہے، اور پھر دروازہ کھول کر باہر جاتا ہے۔)

(مردنگ بجنا بند ہوا اور دروازہ کھل کر سکھارام کے باہر جانے کا احساس ہوا تو وہ اٹھ بیٹھی۔ دور کہیں بھجن چل رہا ہے۔ وہ اٹھ کر دھیرے سے باہر آتی ہے، چاروں جانب دیکھتی ہے، چلم کا سامان اٹھا کر ایک طرف کرتی ہے، وہاں جھاڑو مارنے لگتی ہے۔ سکھارام داخل ہوتا ہے، وہ چونک کر ایک طرف سمٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

سکھارام :کرو، کرو، صفائی کرو۔

(وہ کھونٹی کے پاس آ کر اپنی قمیص اتار کر نیم برہنہ ہو جاتا ہے۔ پھر رسوئی گھر میں جا کر منھ پر پانی کے چھینٹے مارتا ہے۔ اس وقت اس کا بچھونا دیکھتا ہے۔ باہر کے کمرے میں آتا ہے۔ وہ اس کا بستر بچھا رہی ہے۔)

اُدھر نہیں، اِس طرف۔ (وہ گھبرا کر جلدی جگہ بدل کر بستر بچھانے لگتی ہے۔ سکھارام گانجے کے نشے میں بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھتا ہے۔ وہ سکھارام کا بستر بچھا کر اٹھتی ہے۔) اٹھو مت، بیٹھی رہو۔ (وہ ایک طرف ہو کر نیچی گردن کیے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔) میں نے کیا کہا؟ اٹھو مت۔ (وہ

Scanned with CamScanner

خاموش۔) آج یہیں سو جاؤ۔ (وہ تھکی سی لگ رہی ہے، کسی طرح اٹھ کر اندر جانے لگتی ہے۔) سن رہی ہو؟ سونے سے پہلے پیر دبانے کی ریت ہے یہاں کی۔ کئی آئیں اور چلی گئیں مگر یہاں کی ریت نہیں بدلی، آج بھی نہیں بدلے گی۔ (بستر پر آ کر بیٹھتی ہے۔) بم بھولے... (وہ ایک طرف کھڑی ہے۔) اِدھر کوئی اردو بول رہا ہے کیا؟ سمجھی نہیں؟ پیر!... (وہ گھبرائی ہوئی سی کسی طرح سے آ کر اس کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے۔) ہاں دباؤ پیر۔ (پہلے سے دھیمے لہجے میں) پاؤں دباؤ۔ (وہ اس کے پاؤں دبانے لگتی ہے۔) اوپر تک دباؤ۔ (وہ ڈرتے ہوئے پاؤں اوپر تک دبانے لگتی ہے۔) ٹھیک طریقے سے دباؤ، یہ پاؤں تمھیں کھائیں گے نہیں۔ آج تھک گیا ہوں، صبح سوناوونے گیا تھا، آتے وقت بھی اتنا ہی پیدل آنا پڑا، بہت چلنا پڑا۔ (وہ خاموشی سے پاؤں دبا رہی ہے۔) اب ذرا اپنا نام بتاؤ۔

عورت : لکشمی۔

سکھارام۔ لکشمی؟ (اسے نظر بھر دیکھتے ہوئے) اچھا نام ہے۔ تمھارے آدمی کا کیا نام تھا؟ (وہ کچھ نہ کہتے ہوئے پیر دباتی رہتی ہے۔) اچھا اچھا، نام نہیں لیا جاتا اپنے مرد کا! مجھے عادت نہیں ہے نا! (وہ ساڑی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہے۔) کیا ہوا؟ اب نہیں پوچھوں گا بس؟ تم سب نکال باہر کی ہوئی عورتیں، باقی سب مالموں میں بھلے ہی ایک جیسی نہ رہو مگر ایک بات میں سب ایک جیسی ہوتی ہو، اِدھر شوہر کا نام لیا اُدھر آنکھ میں آنسو۔ جبکہ وہی لوٹ کر، لات مار کر، گھر سے باہر کر دیتا ہے۔ وہ جان لینے پر تلا ہوگا، لیکن پھر بھی وہ تمھارا دیوتا کہلائے گا۔ ایسے دیوتا کی تو کسی چوک میں جوتے چپل سے پوجا ہونی چاہیے۔ یہ کاہے کے دیوتا؟ (وہ پاؤں دبا رہی ہے۔) تم بھی سب ایک جیسی ہی ہو، مری ہوئی ماں کا دودھ پیے ہوئے، مُردار، جس کی لات کھاؤ گی پھر اسی کے پاؤں پکڑو گی۔ (وہ خاموشی سے پاؤں دبائے جا رہی ہے۔) کھانا کھایا؟ (وہ پاؤں دبا رہی ہے۔) میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ سوال کا جواب نہ ملے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کھانا کھایا؟ (وہ نفی میں سر ہلاتی ہے۔) کیوں نہیں کھایا؟ (وہ پیر دبا رہی ہے) میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ (جسم پر پڑی ہوئی چادر دور پھینکتا ہے۔)

لکشمی : (کچھ سہمی ہوئی) آج چتر تھی ہے، اور پھر بھوک بھی نہیں تھی۔

سکھارام : اُپواس رکھا ہے؟ (لکشمی اثبات میں سر ہلاتی ہے۔) کل صبح بھی تو کچھ کھایا نہیں

ہوگا؟ (لکشمی نفی میں گردن ہلاتی ہے۔)

سکھارام : تو کیا بھوکے مرنا ہے؟

لکشمی : مجھے عادت ہے۔

سکھارام : عادت ہے؟ اس گھر میں یہ سب نہیں چلے گا۔ یہاں دو وقت بھر پیٹ کھانے کا، جی کھول کر سیوا کرنے کا۔ یہ سارے اُپواس وپواس بند، بول دیتا ہوں۔ (لکشمی خاموش۔)

سکھارام : جاؤ اب سو جاؤ۔

لکشمی : (ہچکچاتے ہوے) ایک بات پوچھوں؟

سکھارام : پوچھو۔

لکشمی : روئی کہاں ہے؟ بھگوان کے پاس دیا جلاتا ہے۔

سکھارام : پہلے والی کہاں رکھتی تھی مجھے مالوم نہیں۔ میں نے کبھی دلچسپی بھی نہیں لی۔ چلم کی جگہ کہاں ہے، مردنگ کہاں رہتا ہے، یہ پوچھو تو بتا دوں۔ روئی چاہیے تو کل لا دوں گا، بس؟

لکشمی : (ہچکچاتے ہوے) پہلی والی کیسی تھی؟

سکھارام : پہلی والی؟ یہ سوال آتا ہی ہے۔ بعد والی کو پہلی والی کے بارے میں جاننا ضروری ہوتا ہے۔ چھ ہو گئی ہیں اب تک۔ پہلی والی کیسی تھی؟ بستر پر بھی زیادہ نہیں ٹکی، دن بہ دن سوکھتی ہی چلی گئی، گوشت تو تھا ہی نہیں، ساری ہڈیاں۔ مگر بہت ایماندار تھی، اوپر گردن کر کے تو کبھی دیکھا ہی نہیں اس نے۔ پلٹ کر جواب دینا تو بڑی بات۔ میرج کے ہسپتال میں چل بسی، ابھی ہفتہ ہوگا۔

لکشمی : بچے کتنے تھے؟

سکھارام : دو تھے۔ انھیں شوہر نے رکھ لیا تھا، اسی لیے تو، سوکھتی چلی گئی، آخری سانس تک شوہر اور بچوں کے نام کی مالا جپ رہی تھی۔ منھ میں پانی کی آخری بوند میں نے ٹپکائی، مگر آخر دم تک نام اپنے شوہر کا ہی لے رہی تھی۔ (لکشمی ٹھنڈی سانس بھرتی ہے۔) کیا ہوا؟ سب رسم رواج کے حساب سے کیا۔ اگنی میں نے دی، کوا پنڈ چھونے کو تیار ہی نہ تھا۔ تب اسے بہت ساری گالیاں دیں۔ میں نے کہا، وہ حرام خور جس نے تمھیں گھر سے نکال باہر کیا، اس کی تکلیف تم مجھے کیوں دے رہی ہو؟ میں تمھارا کیا لگتا ہوں؟ تمھیں گھر میں سہارا دے کر کیا میں نے غلطی کی؟ تم مجھے جلدی سے چھٹکارا دلا

دو۔ میری گالیاں سن کر کوے نے جھٹ سے پنڈ کو چھو لیا۔ نہا دھو کر چھٹی پالی۔ اس گھر کی دہلیز کو پھلانگ کر اندر آنے والا اس گھر کا ہو جاتا ہے۔ دوبارہ باہر گیا تو اس سے رشتہ ختم۔ تکلیف نہیں چاہیے۔ مگر باہر بھیجتے وقت بھی اصول کے مطابق ساڑی چولی اور پچاس روپے دے کر ہی بھیجتا ہوں۔ اوپر سے جدھر جانا ہو اُدھر کا ٹکٹ بھی۔۔۔ ہاں یہ بتانا رہ گیا تھا۔ اچھا ہوا یاد آ گیا۔ اس کے علاوہ یہاں جو کچھ ملتا رہتا ہے وہ لے جانے کی اجازت بھی ہے۔ یعنی کپڑا، چپل، چوڑیاں، وغیرہ۔ رواج میں کمی نہیں آئے گی۔ سکھارام بائنڈر کسی کا شوہر نہیں ہے جو انسانیت کو چھوڑ دے۔ جاؤ اب سو جاؤ، اونگھو مت۔ اُپو اس سے تھک گئی ہو۔ مگر آگے اس گھر میں یہ سب نہیں چلے گا، کہے دیتا ہوں۔ اپنی بھوک مامولی نہیں ہے۔ بعد میں شکایت نہیں چلے گی۔ صبح سات بجے مجھے پریس پہنچنا ہوتا ہے۔ دوپہر بارہ بجے گھر آتا ہوں، پھر دو بجے نکلتا ہوں اور چھ بجے واپس آتا ہوں، اوور ٹائم اور جس دن کام ارجنٹ دینا ہوتا ہے تب دیر ہوتی ہے۔ صبح ٹھیک ساڑھے چھ بجے دو روٹیوں کا ناشتہ مجھے تیار چاہیے۔ آج کا دن سوناونے جانے میں ڈوب گیا، اب کل اوور ٹائم کرنا پڑے گا۔

(کروٹ بدل کر دوسری جانب منھ کر کے سو جاتا ہے۔ وہ اندر چلی جاتی ہے۔ دور کہیں بھجن ہو رہا ہے۔ اندھیرا ہو جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(جب روشنی ہوتی ہے، رات کافی بیت چکی ہے۔ سکھارام گہری نیند میں خراٹے لے رہا ہے۔ باہر خاموشی طاری ہے۔ لکشمی اس کے قدموں میں بیٹھی ہے۔ آنکھیں میچتی ہے، پھر کھولتی ہے، دھیرے دھیرے اندھیرا ہوتا ہے۔)

چوتھا منظر

(روشنی جب دوبارہ آتی ہے، لکشمی کھانا بنانے کے کمرے میں بیٹھی دکھائی دیتی ہے۔ اب وہ کچھ کم اداس ہے۔ باہر کے کمرے میں کوئی نہیں ہے۔)

لکشمی :(جھک کر زور سے ہنستے ہوئے کہہ رہی ہے:) بدمعاش، مجھے پھنساتے ہو؟ نکال

باہر کروں تو پھر واپس آتے ہو؟ تم کو روزانہ کھانے کو چاہیے؟ کیوں؟ عادت پڑ گئی ہے؟ اب کچھ نہیں ملے گا۔ کہہ دیا نا! اب کچھ نہیں ملے گا۔ بالکل نہیں۔ ایسے منھ اٹھا کے مت دیکھو۔ اُدھر ہو جاؤ۔ پہلے اُدھر ہو جاؤ۔ ارے کہہ دیا نا، اُدھر ہو جاؤ۔ میرے انگ پہ مت چڑھو۔ منع کیا نا! (یوں ہنستی ہے جیسے کسی نے گدگدایا ہو۔) نہیں، نہیں! گود میں چڑھے تو ماروں گی۔ دور ہو، چپکو نہیں کے! آج تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ بھلا یہ روز روز کی مصیبت کیوں؟ پہلے میرے اوپر سے اترو۔ (کھلکھلاتی ہے۔) اُتر پہلے میرے انگ پہ سے۔ اوئی میری ماں! کتنا ستاتا ہے تو مجھے۔

(سکھارام کام سے لوٹ کر آیا ہے اور دروازے میں کھڑا یہ سب کچھ سن رہا ہے۔ اس کا پارہ چڑھنے لگتا ہے، وہ تیزی سے اندر آتا ہے۔ لکشمی تنہا بیٹھی ہنس رہی ہے۔ سکھارام دیکھ کر خاموش رہ جاتا ہے۔ لکشمی ہنسی دبا کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے۔ سکھارام چاروں جانب شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔)

سکھارام : کیا ہو رہا ہے؟

لکشمی : (گردن نفی میں ہلاتے ہوئے) کچھ نہیں۔

سکھارام : پھر تمھیں اتنا ہنسنے کو کیا ہوا تھا؟ (شک سے نظریں اب بھی گھوم رہی ہیں۔) کس کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں؟ (لکشمی ہنسی روکتی ہے۔)

سکھارام : (ذرا غصے سے) کیا پاگل ہو گئی ہو؟ (لکشمی نفی میں سر ہلاتی ہے۔ سکھارام جیکٹ اتارتے ہوئے باہر آتا ہے۔) اکیلے میں باتیں کر رہی تھی، ہاں؟ (شک کی نظر پھر چاروں جانب دوڑاتا ہے۔ سکھارام باہر جاتا ہے۔ جہاں وہ بیٹھی تھی وہاں کچھ تلاش کرتی ہے۔) دوبارہ یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ کہے دیتا ہوں۔ اکیلے میں یہ ہنسنا، سمجھی؟ ہاں!

(لکشمی چولھے پر سے چائے اتارتی ہے، پھر بالٹی میں سے ایک لوٹے میں پانی لے کر باہر آتی ہے۔ سکھارام ایک جگہ کھڑا ہے۔ وہ اسے پانی دیتی ہے۔ سکھارام ہاتھ، پاؤں اور منھ دھوتا ہے۔ لکشمی کے دیے ہوئے تولیے سے منھ پونچھتا ہے، اور پھر دونوں اندر آتے ہیں۔ سکھارام آگے ہے اور لکشمی پیچھے۔ سکھارام آکر دیوان یا صوفے پر دراز ہوتا ہے۔ لکشمی اس کے قریب بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگتی ہے۔ وہ اس کی جانب دیکھتا ہے،

Scanned with CamScanner

دونوں کی نظریں ٹکراتی ہیں، لکشمی اپنی نگاہیں جھکا لیتی ہے۔)

سکھارام :(اس کا ہاتھ پکڑ کر) ہنسنے کو کیا ہوا تھا؟

لکشمی :(ہاتھ چھڑا کر) کوئی دیکھ لے گا۔

سکھارام :کوئی چوری ہے کیا؟

لکشمی :چائے لے کر آتی ہوں۔

سکھارام :(اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے، مگر کچھ سوچ کر چھوڑ دیتا ہے۔) جلدی آؤ۔(لکشمی اندر جا کر چائے لے آتی ہے اور اسے دیتی ہے۔وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر اسے ایک جانب اشارہ کر کے کہتا ہے۔) بیٹھو۔(وہ کھڑی ہے۔) میں کہتا ہوں، بیٹھو یہاں۔(وہ کچھ فاصلے پر کسی طرح بیٹھ جاتی ہے۔)یوں نئی دلہن کی طرح نہیں، قریب بیٹھو۔(اسے کھینچ کر قریب کرتا ہے، اور اپنی پیالی سے چائے پیش کرتا ہے۔) لو چائے پیو۔

لکشمی :میرے لیے اندر ہے۔

سکھارام :دوبارہ ایسا کہا تو منھ توڑ دوں گا۔میرے اس میں سے دے رہا ہوں تو کہتی ہے اندر ہے۔ہوں۔

(وہ ایک گھونٹ پیتی ہے اور ''بس'' کہتی ہے۔وہ اسے زبردستی مزید پینے کا اصرار کرتا ہے، بعد میں وہ پیتا ہے۔وہ چائے کی پیالی لے کر جانے لگتی ہے۔وہ اسے روک کر۔)

کس کے ساتھ ہنسنا بولنا چل رہا تھا ابھی؟

لکشمی :کسی کے ساتھ نہیں۔

سکھارام :پھر میں نے جو سنا وہ کیا میرے من کی آواز تھی؟

لکشمی :نہیں ایسا کچھ بھی نہیں۔

سکھارام :پھر؟

لکشمی :ایسے ہی۔

سکھارام :ایسے ہی مطلب؟

لکشمی :(ہچکچاتے ہوئے) چیونٹے کے ساتھ۔

Scanned with CamScanner

سکھارام :کیا؟(لکشمی ''ہاں'' کہتے ہوے سر ہلاتی ہے۔) چیونٹے کے ساتھ بات کر رہی تھی؟

لکشمی :ہاں۔سچ سچ۔

سکھارام :چیونٹا تم سے بات نہیں کر رہا تھا کیا؟

لکشمی :ہاں... (بعد میں جھٹ سے:) نہیں۔(سکھارام اسے حیرت سے دیکھتا ہے۔) مطلب چیونٹے کی طرف سے بھی میں ہی بول رہی تھی۔

سکھارام :چیونٹے سے بات کر رہی تھی؟ یہ کیا ہے؟ کہیں کچھ اور معاملہ تو نہیں؟ (لکشمی خاموش کھڑی ہے۔) تمھارے دماغ کا علاج تو نہیں کرانا پڑے گا؟ کہتی ہے، چیونٹے سے بات کر رہی تھی! وہ چیونٹا تمھارا پہچان والا ہوگا؟

لکشمی :ایک بار بات کرنے لگو تو پہچان ہو ہی جاتی ہے، میں اسے شکر کھلاتی ہوں تو وہ آتا ہے۔

سکھارام :کیا اس گھر میں صرف ایک ہی چیونٹا ہے؟ کئی ہوں گے، ان میں سے کوئی ایک چلا آتا ہوگا۔

لکشمی :نہیں، میں اس چیونٹے کو پہچان لیتی ہوں۔

سکھارام :بھلا وہ کیسے؟

لکشمی :اس کے آنے پر میں جان جاتی ہوں۔

سکھارام :مگر تمھیں سمجھتا کیسے ہے؟

لکشمی :اس کی چال سے۔

سکھارام :چیونٹے کی چال سے؟

لکشمی :ہاں اس کی چال سے۔وہ دوڑتا ہوا نہیں آتا، دھیرے دھیرے آتا ہے۔شکر کے دانے کو منھ لگانے سے پہلے، دانے کے چاروں جانب ایک چکر لگاتا ہے۔

سکھارام :اور کچھ نہیں کرتا؟

لکشمی :ایک بار شکر کھالے تو پھر ایک پاؤں سے اپنا منھ صاف کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سکھارام :واہ واہ، منھ صاف کرتا ہے! اور پھر کیا کرتا ہے آپ کا یہ چیونٹا؟

لکشمی :دانہ لے کر دیوار کے پاس جاتا ہے۔

سکھارام :اور؟

لکشمی :پچھلے کچھ دنوں سے بڑا نڈر ہو گیا ہے۔ شکر کا دانہ چھوڑ، میرے پیچھے آنے لگا ہے۔

سکھارام :ارے واہ، ایسا کیا؟ اور...؟

لکشمی :میرے انگ پہ چڑھ جاتا ہے۔

سکھارام :ارے واہ، انگ پر چڑھ جاتا ہے۔ اور پھر...؟

لکشمی :کچھ بھی کرو، اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ (اٹھ کر) لا کر دکھاؤں؟

سکھارام :کیا؟ چیونٹا؟ ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ کہتی ہے، چیونٹا بولتا ہے! یہ سب پاگل پن نہیں چلے گا یہاں۔ ادھر سیانے کی طرح رہنا ہوگا، یاد رکھ، کیا سمجھی! ٹھیک ہے نا؟ اب جاؤ اندر۔

(وہ چائے کی پیالی لیے اندر جاتی ہے۔ سکھارام اسے اندر جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ بے سری آواز میں لاونی کا ایک بند گنگنانے لگتا ہے۔)

یہ مالمہ کچھ الگ ہی ہے۔ وہ پہلی والی اپنے شوہر کا کرتا چپکائے پھرتی تھی تو یہ چیونٹے سے باتیں کرتی ہے۔ سالے یہ شوہر ان عورتوں کی کیا حالت کر دیتے ہیں۔

(وہ چولھے کے پاس جا کر جھک کر اِدھر اُدھر کچھ دیکھ رہی ہے۔ پھر وہیں بیٹھ جاتی ہے۔ سکھارام ''آج داؤ نہیں آیا'' کہتا ہوا کونے میں رکھا ہوا چلم کا سامان لینے لگتا ہے۔)

لکشمی :(دھیمی مگر سنائی دے ایسی آواز میں) تمھاری وجہ سے مجھے آج باتیں سننی پڑیں۔ تم کھائے جاؤ اور باتیں میں سنوں۔ چیونٹے، چیونٹیاں، چڑیاں، کوّے، یہ سب مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ میری یہ بات کسی کو سچی نہیں لگتی۔ تم لوگ مجھ سے کیوں باتیں کرتے ہو؟ ہاں بولو، مجھ سے کیوں بولتے ہو؟ بول میرے بدھو، بول نا!

(بیچ کے دروازے میں چلم کی آگ لینے کے لیے کھڑا سکھارام یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔)

سکھارام :(چلا کر) ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ گھر ہے یا پاگلوں کا ہسپتال؟ (وہ گھبرا کر کھڑی ہو

Scanned with CamScanner

جاتی ہے۔) خبردار اگر دوبارہ ایسا ہوا! یہ سارا پاگل پن بالکل بند کرو۔ سمجھی؟ (وہ خوف سے لرزنے لگتی ہے۔) اگر دوبارہ یہ سب کچھ ہوا تو گھر سے نکال دوں گا۔ مجھے چلم کے لیے آگ دو۔ (وہ خاموشی سے لوبان دانی اٹھا کر اس میں کچھ انگارے رکھ کر دیتی ہے۔) رونا بند! کیا کوئی مر گیا ہے؟ کوئی مر جائے تو بھی اس گھر میں رونے کا نہیں۔ (وہ جلدی سے آنکھیں پونچھنے کی کوشش کرتی ہے، ایسا کرنے میں، لوبان دانی سے ایک انگارا اس کے پیر پر گر جاتا ہے۔ یہ پیر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے، سکھارام جلدی سے انگارا ہٹا دیتا ہے۔) جل جانے دو پیر، مجھے کیا؟ (لکشمی کا پیر کافی جل گیا ہے۔ کسی طرح وہ آگ سمیٹ کر لوبان دانی میں جمع کرنے لگتی ہے۔) برتن ٹھیک طرح سے پکڑنا نہیں آتا؟ نالائق کہیں کی! لگتا ہے لاتوں سے ہی مرمت کرنی پڑے گی۔ آگ دو ادھر، اور اندر جا کر کچھ پاؤں پر لگاؤ۔ نہیں تو جا کر مرو۔ (لوبان دانی میں آگ لے کر وہ چلم کے پاس آتا ہے۔ وہ اندر چولھے کے پاس بیٹھ کر پیر سہلاتی ہے۔)

سکھارام : (چلم بناتے ہوئے) یہ داؤد بھی آج نہیں آیا۔ جانے کدھر جاتا ہے۔ (لکشمی چولھے کے پاس بیٹھی پاؤں پر پھونک مار رہی ہے، باہر سکھارام انگارے کو پھونک کر آگ کو تیز کر رہا ہے۔ اور پھر چلم کا دم مار کر:) بم... بھولے...

لکشمی : (پاؤں سہلاتے ہوئے، زمین کی جانب دیکھ کر مغموم لہجے میں) تو کیا پوچھ رہا ہے منھ اٹھا کر؟ اِدھر کا ہے کی قیمت ہے؟ آخر کسی نے باہر نکال دیا ہے نا مجھے! پاؤں جل کر راکھ بھی ہو جائے تو کسی کو کیا؟ تم کیا دیکھ رہے ہو؟ شرم نہیں آتی تمھیں؟ جاؤ اُدھر، مجھے اپنا کالا منھ نہ دکھاؤ۔ جاؤ پہلے، ورنہ مار دوں گی۔

(اس منظر پر اندھیرا ہوتا ہے۔)

پانچواں منظر

(رسوئی گھر میں چھوٹی بتی کے سبب نہایت کمزور روشنی، باہر کا کمرہ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔ صرف آواز سنائی دیتی ہے۔)

سکھارام : اے... اٹھ... اے... اب اٹھتی ہے یا... جاگ جا نہیں تو... کمر میں ایک

لات دوں گا۔ اٹھ، کہا نا؟

لکشمی :(نیند میں ڈوبی آواز) کیا ہے؟ بعد میں اٹھوں گی۔۔۔

سکھارام :بعد میں نہیں، ابھی اٹھ۔۔

لکشمی :اوئی، کیا ہے؟ ابھی تو رات بہت ہے۔۔۔

سکھارام :اسی لیے جگا رہا ہوں۔۔۔

لکشمی :کیا؟

سکھارام :ویسے ہنسو۔۔۔

لکشمی :کیسے؟

سکھارام :ویسے، جیسے رات میں۔۔۔

لکشمی :مجھے بہت نیند آرہی ہے، دو راتوں سے نیند نہیں ملی۔

سکھارام :ارے بعد میں سو جانا۔ پہلے ویسے ہنس کے دکھا، جیسے شام میں چیونٹا چڑھنے پر ہنس رہی تھی۔ (ٹھہر کر) ارے ہنسو۔۔۔

لکشمی :بعد میں ہنسوں گی۔۔۔ اوئی! پاؤں دکھ رہا ہے نا میرا۔۔۔ اوئی۔۔۔

سکھارام :پہلے ہنسو۔۔۔

لکشمی :مجھے نہیں آتا۔

سکھارام :چیونٹے کے واسطے ہنستی ہے، میں بولوں تو انکار کرتی ہے؟ دیکھ، یہ تیرا جلا ہوا پیر مروڑ کر رکھ دوں گا۔ پہلے ویسے ہنس کے دکھا۔ سونے کا نہیں، اٹھ۔۔۔

لکشمی :سچ سچ نہیں آتا مجھے۔ چھوڑ دو، سونے دو نا مجھے۔

سکھارام :بعد میں سو جانا۔ پہلے اٹھ کر ہنسو۔ ہنسو ورنہ گلا دبا دوں گا۔ ہنسو۔۔۔ ہنسو۔۔۔ پہلے ہنسو۔

(لکشمی پہلے ہنسنے کی کوشش کرتی ہے، پھر بالکل شام کی مانند ہنسی سنائی دیتی ہے۔ دونوں کی ہنسی جاری رہتی ہے۔ پھر ہنسی ٹھہر جاتی ہے، خاموشی۔)

لکشمی :اوئی میری ماں۔۔۔ تھک گئی میں۔ اب نہیں ہنسا جاتا۔ اب مجھے سونے دو نا! پاؤں میں

جلن ہو رہی ہے۔

سکھارام : کہاں؟ دیکھوں۔ پھر پاگل پن کیا تو پاؤں توڑ دوں گا۔ کہے دیتا ہوں، نالائق ذات!

(مکمل اندھیرا ہو جاتا ہے۔)

چھٹا منظر

(روشنی ہوتی ہے۔ کھانے کے کمرے میں لکشمی جلدی سے کچھ بنانے میں مصروف ہے۔ گھر کے باہر سے آوازیں آتی ہیں: "منگل مورتی موریا"، "بچہ لوگ آواز لگاؤ، منگل مورتی موریا"۔ یہ آواز سکھارام کی ہے۔ بچے زور سے آواز لگا رہے ہیں: "منگل مورتی موریا"۔ سکھارام گنیش جی کی مورتی اٹھائے ہوئے ہے۔ پیچھے داؤد تال بجاتے ہوئے۔)

سکھارام :(دروازے میں آکر) منگل مورتی...

داؤد :موریا۔

(لکشمی جلدی سے باہر آتی ہے، مورتی کی پوجا ہوتی ہے اور پھر مورتی کے لیے بنائی ہوئی جگہ پر سکھارام مورتی کو بٹھا دیتا ہے۔)

سکھارام :بیٹھیے... منگل مورتی جی۔ اپنے باپ دادا کا تو مجھے نہیں مالوم، مگر اپنے گھر میں تم پہلی بار آئی ہو۔ چلو اب کھاؤ پیو، آرام کرو۔ تمھارے ساتھ یہ چوہے راجا تو ہیں ہی بیٹھے ہوئے۔ کیوں چوہے راجا جی، آپ اچھے تو ہیں نا؟ ٹھیک ہی ہوں گے۔ جب تک یہ گنپت راؤ پیٹھ پر بیٹھ کر سواری نہ کریں، تب تک تو سب ٹھیک ہے۔ گنپت راؤ جی نے بھی بڑی اچھی سواری پسند کی ہے۔

لکشمی :کیا ہے یہ سب؟ ایسا بولنا اچھا نہیں...

سکھارام :کیا ہوا؟ داؤد، کیا میں نے کچھ غلط کہا؟ تو ہی بول، کیا میں نے اس کے پیٹ کی بات کی؟ اس کے دانتوں کا یا اس کی سونڈ کا مذاق اڑایا؟ بول...

لکشمی :اب بہت ہو گیا...

سکھارام :میں نے کچھ غلط کہا ہو تو بتاؤ، داؤد!

Scanned with CamScanner

داؤد :رہنے دے نا! نہیں بولنا تو نہیں بولنے کا، ارے منگل مورتی تو سب جانتا ہے۔ وہ بھگوان ہے نا؟

سکھارام : نہیں مگر یوں آتے ہی اس طرح باتیں سننا۔ کبھی نہیں، پر آج خود جا کر گنپتی گھر لے آیا۔

داؤد :رہنے دے یار، اب پرساد کی کچھ بات کر، ہمیں اپنے دھندے پر جانا ہے۔

لکشمی : آرتی ہوئے بغیر کسی نے جانا نہیں ہے۔ میں ابھی تیاری کر کے آتی ہوں۔ (اندر چلی جاتی ہے۔)

داؤد :نہیں جاؤں گا۔ پاپ نہ لگے اس لیے سارے دھرموں کے دیوتاؤں کا مان رکھتا ہوں۔ نہ جانے کونسا بھگوان ناراض ہو کر برا کر دے...

سکھارام :اپنا دل صاف ہے نا، تو داؤد، دنیا کے کسی بھی دیوتا کے باپ کی ہمت نہیں ہے کہ وہ اپنا کچھ بانکا کر سکے۔

داؤد :مگر سکھارام، اپن صاف نہیں۔ زندگی جیتے ہوئے بھگوان کا کورٹ یاد ہی نہیں رہتا۔ ہر بار ایک نیا گناہ...

سکھارام :وہ چھوٹے کورٹ کا، داؤد! بھگوان کے کورٹ میں صرف ایک ہی گناہ ہے، جھوٹ، بس۔ جھوٹ بولنے والے کو ساری زندگی جیل، کالا پانی۔ جھوٹ سب سے بڑا گناہ ہے۔ باقی جس نے یہ ہاڑ ماس کا شریر بنایا ہے، وہ کیا اس کی کھجلی نہیں جانتا ہوگا؟ وہ بھی جب اوتار لے کر آتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ ذرا کرشن کو یاد کرو داؤد!

(لکشمی آرتی کی تھالی لے کر آتی ہے۔)

لکشمی :(سکھارام سے) یہ لو۔

(سکھارام تھالی ہاتھ میں لیتا ہے۔ وہ دیا جلاتی ہے۔ داؤد مدد کے لیے آگے بڑھتا ہے۔)

لکشمی :تم الگ رہو بھائی صاحب۔ (داؤد دور ہو جاتا ہے۔ اب لکشمی سکھارام سے مخاطب ہو کر) ہاں اب آرتی شروع کرو۔

سکھارام :داؤد، بولو: "سکھ کرتا دکھ ہرتا وارتا ودھنا چی..."

(داؤد تال بجاتے ہوئے ساتھ دینے لگتا ہے۔ دونوں کا گانا دیکھ کر لکشمی ناپسندیدگی سے وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔)

لکشمی :(داؤد کو اشارے سے) تم مت بولو۔ (داؤد خاموش ہو جاتا ہے۔)

سکھارام :(آرتی بولتے ہوئے خاموش ہو جاتا ہے) کیا ہوا؟ داؤد، ارے بول... (داؤد خاموش ہے۔) ارے یار تال بجا، چپ کیوں ہو گیا؟ (داؤد لکشمی کی جانب دیکھ رہا ہے۔) کیا ہوا؟ تم آرتی کیوں نہیں بول رہے ہو؟ (داؤد خاموش۔) کیوں نہیں بول رہے ہو، کہو؟ (داؤد خاموشی سے لکشمی کی جانب دیکھتا ہے۔) اس نے تم سے کہا ہے کہ مت بولو؟ (داؤد خاموش۔ سکھارام لکشمی کی طرف مڑ کر) اچھا؟ داؤد بھلا کیوں نہ پڑھے آرتی؟

لکشمی :کیونکہ... وہ مسلمان ہے۔

(سکھارام اچانک آرتی کی تھالی نیچے رکھ دیتا ہے۔ داؤد اور لکشمی خوفزدہ۔)

سکھارام :داؤد کو آرتی پڑھنے سے کس نے منع کیا؟

داؤد :جانے دو سکھارام۔

سکھارام :تم چپ رہو! (لکشمی سے مخاطب ہو کر) بھلا وہ کیوں آرتی نہ بولے؟

لکشمی :وہ مسلمان اور ہم... ہندو۔

(سکھارام لکشمی کو زوردار طمانچہ مارتا ہے۔ وہ اپنا گال پکڑ کر سہلانے لگتی ہے۔)

سکھارام :پھر بول!

لکشمی :میں نے کیا غلط کہا؟ گنپتی کی پوجا میں مسلمان کی آرتی کیسے چلے گی؟

سکھارام :کیوں نہیں چلے گی؟ جب میری آرتی چل سکتی ہے تو اس کی کیوں نہیں چل سکتی؟

لکشمی :مسلمان کے ہاتھ سے... (سکھارام ایک اور طمانچہ رسید کرتا ہے۔)

داؤد :سکھارام، چھوڑ یار... (سکھارام کھونٹی پر لپٹی ہوئی بیلٹ نکال لاتا ہے۔)

سکھارام :بول، تو پھر بول، چل پھر بول...

لکشمی :جو سچ ہے وہ بول رہی ہوں۔ میرے گھر کے گنپتی کو مسلمان کی آرتی؟

(سکھارام بیلٹ سے ایک زوردار وار لکشمی پر کرتا ہے۔)

داؤد :سکھارام...

لکشمی :(تکلیف سے بلبلاتے ہوئے مگر سخت ہوکر) مارنا ہوتو اندر چل کر مارو، مگر بھگوان کے سامنے نہیں۔آج ہی آیا ہے وہ۔

داؤد :سکھارام، یار سن...

سکھارام :(لکشمی کا سخت لہجہ سن کر مزید غصے سے) چل اندر، آج تجھ سے نپٹ ہی لیتا ہوں۔

(وہ مڑ کر اندر جاتی ہے۔اس کے پیچھے سکھارام بیلٹ لے کر اندر چلا جاتا ہے۔داؤد جہاں تھا وہیں ہے۔اندر ایک کے بعد ایک بیلٹ سے مارنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔لکشمی کا بلبلانا داؤد سے برداشت نہیں ہوتا، وہ تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔اندر سے مارنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔اور اندھیرا ہوجاتا ہے۔)

ساتواں منظر

(دھیما اجالا ہوتا ہے۔سکھارام نہیں ہے۔کھانے کے کمرے سے لکشمی کی کراہیں سنائی دے رہی ہیں۔وہ کسی طرح اٹھ کر گنیش جی کی مورتی کے پاس آتی ہے۔آرتی کا بکھرا پڑا سامان اکٹھا کرتی ہے۔مورتی کے سامنے دیا جلا کر بیٹھ جاتی ہے۔پھر کسی طرح اٹھ کر لنگڑاتی ہوئی اندر جا کر سو جاتی ہے۔چند لمحوں بعد:)

سکھارام :(باہر سے) کہتی ہے، مسلمان آرتی نہیں اتار سکتا۔تم سچے ہو داؤد۔اچھا اب جاؤ دوست، اب تم چلے جاؤ۔کل آنا، آرتی کے لیے۔دیکھتا ہوں سالی کیسے منع کرتی ہے۔ہاں...دیکھتا ہوں...

(نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا اندر آتا ہے۔خود کلامی۔کھونٹی پر اپنا جیکٹ اتار کر رکھتا ہے۔وہیں رکھی اس بیلٹ پر نظر جاتی ہے۔پھر مورتی کو دیکھتا ہے۔)

نہیں، تمھارا کوئی دوش نہیں ہے... کوئی دوش نہیں ہے تمھارا۔

(مورتی کے پاس آکر پوجا کی تھالی تلاش کرتا ہے، تیلی جلا کر دیا جلاتا ہے۔تھالی پکڑ کر کسی طرح کھڑا ہوتا ہے۔)

آج پی ہے، معاف کرنا...

(بے سری آواز میں آرتی گانے لگتا ہے۔تھالی ہاتھ میں ہے۔اور نشے میں دھت ہے۔ اندھیرا۔)

آٹھواں منظر

(باہر کے کمرے میں دیے کی ہلکی روشنی، مگر رسوئی میں اندھیرا۔صرف مکالمے سنائی دیتے ہیں۔)

سکھارام: ہنسو۔ہنسو گی یا نہیں؟

لکشمی: (کراہتے ہوئے) نہیں...

سکھارام: ہنسو گی یا نہیں؟

لکشمی: میرا بدن، بہت دکھ رہا ہے۔(کراہتے ہوئے) سارے بدن میں جلن ہو رہی ہے۔

سکھارام: ہونے دو، مگر پہلے ہنس دو... سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اس گھر میں میرا ہی حکم چلتا ہے۔جو میں کہوں گا وہی ہوگا، تم ہنستی ہو یا تمھیں اس گھر سے باہر نکال دوں؟ نکال دوں؟ چل اٹھ۔

لکشمی: مجھے چھوڑ دو... اوئی ماں...

سکھارام: جب تک ہنسو گی نہیں میں تمھیں چھوڑوں گا نہیں...

لکشمی: میں مرجاؤں گی...

سکھارام: مرجاؤ... مگر ہنستے ہوئے۔(لکشمی کی کراہیں سنائی دیتی ہیں۔) پہلے ہنسو... ہنستی ہو یا مروڑوں تمھارا ہاتھ؟ کہو، مروڑوں؟ یا لے آؤں صبح والا بیلٹ؟ پہلے جیسے ہنس دو۔سنو میں کیا کہہ رہا ہوں۔

(لکشمی ہنسنے کی کوشش کرتی ہے۔اس کی ہنسی میں تکلیف جھلک رہی ہے۔پھر اس کی ہنسی بڑھتی ہے، جیسے کوئی گدگدی کر رہا ہو۔تکلیف کے اظہار کے ساتھ۔سکھارام حواس باختہ اپنی ہنسی اس کی ہنسی میں شامل کیے ہوئے ہے۔باہر کے کمرے کا دیا بجھ جاتا ہے۔اندھیرا

ہوتا ہے اور مردنگ بجنے لگتا ہے۔)

نواں منظر

(مردنگ تھوڑی دیر بجتا رہتا ہے۔ روشنی ہوتی ہے۔ سکھارام مردنگ بجانے میں کھویا ہوا ہے۔ لکشمی پانی کا ایک گھڑا سر پر اور ایک کمر پر رکھے داخل ہوتی ہے۔ کسی سہارے کو پکڑ کر اپنی سانسیں درست کرتی ہے۔)

سکھارام :(چلا کر) جلدی سے ایک کپ چائے بناؤ۔

(لکشمی وہیں کھانا بنانے کے کمرے میں ابھی اپنی سانسیں درست کر رہی ہے، اب اس سے یہ کام نہیں ہو پاتا ہے۔)

ہاں بولنے کو کیا ہوا؟ کیا گلے میں کچھ اٹک گیا ہے؟ مجھے جلدی سے چائے دو۔

(لکشمی چولھے کے پاس جاتی ہے۔)

لکشمی :(منھ ہی منھ میں بدبداتے ہوے) بناتی ہوں۔ پانی لانے میں میرا جی گھبرا گیا ہے۔ یہ جسم ہے پتھر نہیں۔ ایک بار مر جاؤں تو چھٹکارا ملے گا۔

سکھارام: (اٹھ کر کھانا بنانے کے کمرے کی جانب آتا ہے۔) کیا کہا؟

لکشمی :چائے بنانے کو رکھی ہے۔

سکھارام :ابھی تو نے کیا کہا؟ بول! (لکشمی ان سنی کر کے چائے بنانے میں لگی ہے۔) پھر سے بول، کیا بول رہی تھی ابھی تو؟

لکشمی :(ایک دم غصے سے پھٹ پڑتی ہے۔) تو پھر میں کیا کروں؟ آخر کوئی کتنا سہن کرے؟ گھر میں آ کر آج سال بھر ہو گیا، ایک دن آرام نہیں۔ نہ بیماری میں، نہ تیج تہوار پر۔ صرف کام اور کام۔ دن میں تکلیف، رات میں تکلیف۔ ایسے میں ایک آدھ دن میری جان جائے گی، پھر ختم...

سکھارام :جائے جان۔ میں سب انتم سنسکار کروں گا۔ ارے شوہر نے جب چھوڑ دیا تھا، تب تھا کوئی پوچھنے والا؟ میں گھر لے آیا نا! کھانا کھلایا، کپڑا دیا، سہارا دیا۔ کیا میرا پیسہ فالتو تھا؟

لکشمی :جدھر راہ لے جاتی میں چلی جاتی۔ یا پھر ندی میں جان ہی دے دیتی۔ تمھارے

Scanned with CamScanner

دروازے پر کون آیا تھا کہ مجھے اپنے گھر میں لے لو؟ ندی میں ڈوب جاتی تو کم از کم معاملہ تو ختم ہو جاتا!

سکھارام :پھر ابھی جا کر دے دے۔ ابھی ندی پر سے ہی تو آئی ہے، کس نے روکا تھا تجھے؟

لکشمی :میری جان بھاری نہیں ہوئی ہے۔ ماں نے مجھے نو مہینے تک اپنے پیٹ میں سنبھالا ہے، تو کیا میں ایسے ہی اپنی جان گنوا دوں؟ بھلے ہی شوہر کی چھوڑی ہوئی ہوں، مگر ہوں خاندانی۔ میرا باپ منصف تھا۔

سکھارام :منصف گیا تیل لینے۔ شوہر جسے چھوڑ دے اس کو کوئی خاندانی عورت نہیں کہتا۔ میں نے اسی لیے تجھے گھر میں سہارا دیا تھا۔

لکشمی :میں ہی تھی جو رہ گئی۔ کوئی اور ہوتی تو بھاگ گئی ہوتی۔

سکھارام :اب تک چھ رہ چکی ہیں، تم تو ساتویں ہو ساتویں۔

لکشمی :ان میں سے کوئی ایک بھی ٹک جاتی تو مجھے کیوں لے آتے!

سکھارام :یعنی تجھے کیا لگتا ہے؟ مجھے ضرورت تھی اس لیے تجھے لے آیا؟

لکشمی :نہیں تو کیا میرے اوپر مہربانی کی ہے؟

سکھارام :چائے رہنے دو، تم ابھی کے ابھی نکلو۔ (لکشمی چائے کپ میں انڈیل رہی ہے۔) سنو، ابھی چلتی بنو.... چلو نکلو! سال بھر رہ کر چربی چڑھ گئی ہے۔ (بیٹھ کر چائے پینے لگتا ہے۔) جاؤ، چلی جاؤ یہاں سے۔ پھر مجھے منہ نہیں دکھانا!

لکشمی :نہیں دکھاؤں گی۔ امل نیر میں میرا بھتیجا رہتا ہے، اس کے پاس جا کر رہوں گی۔

سکھارام :نکل جاؤ، منہ کالا کرو یہاں سے۔

لکشمی :(دوسرے کسی کام میں مگن) مجھے جب جانا ہوگا میں چلی جاؤں گی۔

سکھارام :ارے واہ، بڑی ڈھٹائی دکھا رہی ہے!

لکشمی :مری ہوئی مرغی آگ سے نہیں ڈرتی۔ اب میرا اس سے اور برا کیا ہوگا؟ اس گھر میں بھی کیا ہونے سے رہ گیا ہے؟ ساری دنیا جانتی ہے، یہاں کیا چلتا ہے۔ چھوکرے بالے بھی اب بولنے لگے ہیں۔

سکھارام :(چائے ختم کر کے) کیا بولتے ہیں؟

Scanned with CamScanner

لکشمی :تم خود پوچھ لو۔

سکھارام :میں بچوں کی باتیں نہیں سنتا... مگر کہتے کیا ہیں؟

لکشمی :میں اپنی زبان کیوں گندی کروں؟ کیا مار کھانا ہے مجھے؟

سکھارام :ایسے ہی تھوڑے کوئی کسی کو مارتا ہے۔ اپنی غلطی پہچانا کرو۔

لکشمی :پہچان لی ہے۔ یہاں آئی، یہی سب سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔

سکھارام :اے! منھ سنبھال کر بات کر۔

لکشمی :صرف مارنا ہی تو آتا ہے تمھیں۔ صرف مار ہی تو کھاتی ہوں، اور کھاتی کیا ہوں؟ اب مار کھانے کی عادت پڑ گئی ہے۔

سکھارام :اے لکشمی... مجھے غصہ نہ دلا!

لکشمی :کبھی پیار کے دو بول نہیں... ہمیشہ جھڑکیاں اور گالیاں۔ باہر نکال دینے کی دھمکی، لاتوں کی مار۔ (پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے) پٹے کی مار سے جسم ادھڑ گیا، مگر کہتے ہیں، ہنسو... بس ہنسو... اور ہنسو۔ اس سے اچھا تو نرک ہے نرک۔ (سسکیوں کی آواز۔) مر جاؤں تو اس جیون سے چھٹکارا ملے۔

سکھارام :تم کو میں نے پہلے ہی بتایا تھا کہ میں ایسا ہوں۔ اپنے یہاں چھپانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ جو کچھ ہے کھلم کھلا، جو ہے سو ہے، یہ بھی بتایا تھا۔ جسے تو رہنا، نہیں تو باہر نکل جانا۔ بولو، کیا نہیں بتایا تھا؟ تب کیا تمھارے کان پھٹ گئے تھے یا پاؤں ٹوٹ گئے تھے؟ کیا میں نے پچھلے سال سے دارو پینا کم نہیں کیا؟ بولو! پی لیتا ہوں کبھی کبھی، مگر کیا کم نہیں کیا؟ سنکراشٹی کو پیتا ہوں؟ چترماس کے دن پیا؟ بولو؟ گئے مہینے میں گانجا صرف دو بار چڑھایا ہے۔ اب پوجا کرنے لگا کہ نہیں؟ روز نہا کر پوجا کرتا ہوں۔ بولو کرتا ہوں کہ نہیں؟ جواب دو، نہیں تو منھ توڑ دوں گا۔ اب میرے کپڑے بھی صاف ہوتے ہیں کہ نہیں؟ بولو، اب منھ کیوں بند ہوا تمھارا؟ اب رو کیوں رہی ہو؟

لکشمی :مجھ پر احسان کیا۔

سکھارام :پہلی چھ ہو چکی ہیں۔ میں نے کسی کی ایک نہیں سنی۔ اپنے باپ کو باپ ماننے والا آدمی نہیں ہوں میں۔ لیکن تمھاری باتیں سنیں کہ نہیں؟ بولو۔

Scanned with CamScanner

لکشمی :اس کے بدلے میں، مار پیٹ، گالیاں، اور ظلم...

سکھارام :پھر کیا کروں؟ تیری خدمت اور تعریف کروں؟

لکشمی :میرے جانے پر مالوم ہوگا۔

سکھارام :تم چلی جاؤ۔ جب کتے کے مافک جینا پڑے گا نا، تب مالوم ہوگا۔

لکشمی :اب بھی تو ویسا ہی جی رہی ہوں۔

سکھارام : کیوں، اس گھر میں تمھیں اچھا نہیں لگتا؟ تو پھر نکل جاؤ ادھر سے۔ چلو... (اسے رسوئی گھر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لاتا ہے اور پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اندر آتا ہے۔) دوبارہ گھر میں آئی تو جان سے ماردوں گا، بھلے ہی پھانسی چڑھ جاؤں۔ نمک حرام سالی! (آگے کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔) جاؤ! ہمیشہ کے لیے بلا ٹل جائے۔ (ایک جگہ پر جا کر بیٹھ جاتا ہے، کوئی ہلچل نہیں۔) واپس نہیں آنا۔ چلی جاؤ اُدھر جدھر تمھیں کوئی رانی کی طرح سنبھال کر پوس سکے۔ جاؤ، اس کے ساتھ گھر جیسا ماحول بنا کر رہو۔ میں تمھارے لیے مرگیا۔ بدنظر سالی، لالچی، احسان فراموش۔ مستی چڑھی ہے، اوپر سے کہتی ہے میں ہی برا ہوں۔ سہارا دیا نا، اس کا انعام! واہ رے واہ! (گھر میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز۔) جاؤ! تم میرے لیے مرگئی ہو۔ گھر میں نہیں لوں گا۔ چلی جاؤ!

داؤد :(دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔) سکھارام! ابے اے سکھارام!

سکھارام :کون؟ داؤد؟ (دروازے کے قریب جا کر اسے کھولنا چاہتا ہے، مگر پھر رک جاتا ہے۔) داؤد، باہر تم اکیلے ہونا؟

داؤد :ایک دم اکیلا ہوں یار۔

سکھارام :وہ سالی حرامزادی رنڈی چلی گئی نا؟

داؤد :دروازہ تو کھول یار۔ (سکھارام دروازہ کھولتا ہے، داؤد اندر آتا ہے۔) کیا یار تو نے تماشا بنا رکھا ہے؟ (پیچھے سے لکشمی آ کر رسوئی میں چلی جاتی ہے۔)

سکھارام :تو پھر آگئی؟

داؤد :جانے دے یار سکھارام...

سکھارام :اب کیوں آئی؟ ضرورت کسے ہے؟ (لکشمی چولھے کے پاس جا کر کام کرنے لگتی

ہے۔) مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، اکیلے رہ لوں گا۔ مرد میں ہمت ہو تو پچاس عورتیں اور ملیں گی۔ اس کو کیا سونا لگا ہے؟ دوسری عورتوں کو کیا پیتل لگا ہوتا ہے؟ سارے دانت توڑ دوں گا۔

داؤد :یار تو روز خالی پیلی کتنی گرما گرمی کرتا ہے؟ چھوڑ دے نا یار، عورت لوگ کا ایسا ہی چلتا رہتا ہے۔

سکھارام :میں نے آج تک کسی کی بات نہیں سنی، اور یہ ڈیڑھ دمڑی کی، گھر سے نکال باہر کی ہوئی عورت مجھ پر رعب جمارہی ہے۔ الٹوا کروں گا۔ تم بیٹھو میں انگار لے کر آتا ہوں۔

سکھارام :انگار چاہیے۔

لکشمی :تو لے لو۔

سکھارام :میں کہتا ہوں مجھے آگ چاہیے۔

لکشمی :اگر تمھارا کام کرنے کے لیے کسی کی ضرورت نہیں ہے، تو اپنے ہاتھ سے لے لو۔

سکھارام :(غصے سے) آگ چاہیے مجھے!

لکشمی :میں تو رنڈی ہوں نا؟ ڈیڑھ دمڑی کی عورت ہوں۔ . . مار دو مجھے، مارو، چپ کیوں ہو؟ مار دیا جلا دو۔ میرا کوئی نہیں ہے اس لیے میری جان فالتو ہے۔

(سکھارام اپنے آپ پر قابو رکھتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے آگ لے کر باہر داؤد کے پاس جاتا ہے اور خاموشی کے ساتھ چلم بنانے لگتا ہے۔ لکشمی مسلسل آنکھیں پونچھتے ہوئے کھانا بنارہی ہے۔ اندھیرا۔ اور پھر مردنگ بجنے لگتا ہے۔).

دسواں منظر

(مردنگ زور زور سے بجنے لگتا ہے۔ رسوئی گھر اور باہر کے کمرے میں ہلکی روشنی پھیلی ہے۔ اندر لکشمی سوئی پڑی ہے، باہر سکھارام دانت ہونٹ بھینچے ہوئے اپنے آپ میں کھویا، بے تحاشا مردنگ بجائے چلا جارہا ہے۔)

باہر سے کسی کی آواز: بند کراے بابا، رات کو اس وقت یہ شور کیوں مچایا ہے؟

دوسری آواز: اے! ڈھولک کیوں بجا رہا ہے؟

(باوجود اس کے سکھارام بجائے چلا جا رہا ہے۔ پھر اچانک بند کر کے اٹھتا ہے اور اٹھ کر رسوئی میں چلا جاتا ہے۔)

سکھارام : جاگ رہی ہو؟ (کوئی جواب نہیں ملتا۔) کچھ پوچھ رہا ہوں۔ جاگ رہی ہے کہ سو گئی؟ (اب بھی کوئی جواب نہیں۔) مادر چو... سالی... کوئی جواب نہیں؟ اٹھ پہلے... اٹھ... سن جو میں کہہ رہا ہوں۔ (اسے جبراً اٹھا کر بٹھاتا ہے۔ جس چٹائی یا کپڑے پر وہ سوئی ہے اسے پھینک دیتا ہے۔) سن، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ایک تو ویسے بھی میرا دماغ گرم ہے، اوپر سے تو الٹا سیدھا بول کر اور بھڑکاتی ہے۔ اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ میں نے سال بھر میں دارو پینا کم کر دیا ہے؟ پوجا کرنے لگا ہوں؟ اتنا سب کچھ میں نے کیا ہے، کیا یہ سب کچھ بھی نہیں؟ (وہ آنچل میں منہ لیے بیٹھی ہے۔) اب تک چھ آ کر چلی گئیں، کسی کی ایک کی بات نہیں مانی۔ جیسے رکھا ویسے رہیں۔ جاؤ کہا، تو نکل گئیں۔ تم عجب نکلی ہو۔ اوپر سے تو بڑی سیدھی مگر اندر سے بہت پہنچی ہوئی۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ نیند کا ڈھونگ کر رہی ہے۔ اب سیدھی طرح کان کھول کر سن۔ سن رہی ہے یا نہیں؟ ہاں بول... پہلے ہاں بول...

لکشمی :(نیند سے بوجھل آواز میں) ہاں...

سکھارام :تو نے مجھے بہت ستایا ہے۔ میں نے بھی تجھے کم نہیں ستایا۔ اب میں تجھ سے اُوب گیا ہوں، تو بھی مجھ سے اُوب گئی ہے، ہے کہ نہیں؟ پہلے ہاں بول...

لکشمی :(اسی طرح) ہاں...

سکھارام :اب تجھے میرا ستانا برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے بھی اب تیری عادتیں اچھی نہیں لگتیں، دماغ پھٹنے کو ہوتا ہے۔

لکشمی :(سوئے ہوئے) ہاں...

سکھارام :ارے کیا ہاں ہاں کر رہی ہے؟ سالا میں پاگل ہو جاؤں گا۔

لکشمی :ہاں...

سکھارام :بند کر یہ ہاں ہاں... اب بہت ہو گیا۔ تیرا میرا کوئی بیاہ نہیں رچا ہے، کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے کی کوئی زبردستی بھی نہیں ہے۔ تیرے لیے تیرا راستہ الگ

اور میرے واسطے میرا الگ۔ ہم دونوں کو کسی کا کچھ لینا دینا بھی نہیں ہے۔ اب ہم ایک دوسرے سے الگ ہوں گے۔ تم بولی تھیں تمھارا کوئی بھتیجا بھی ہے۔ کل تم اس کے پاس چلی جاؤ۔ ٹکٹ وکٹ میں نکال دوں گا، اس کے ساتھ ساڑی چولی بھی برابر ملے گی۔ جو لے آئی تھی وہ بھی سب ساتھ میں لے جا۔ انگ پر جو کپڑے ہیں وہ بھی تیرے۔ دس پانچ خرچے کو بھی دے دوں گا تاکہ بعد میں بولنے کو نہ رہے کہ کچھ کیا نہیں۔ جہاں جانا ہو آرام سے چلی جا۔ میں کوئی الزام بھی نہیں لگاؤں گا۔ مگر ہمارا سمبندھ اب یہاں سے ختم ہو گیا۔ سمجھ گئی کچھ؟

لکشمی :(غیر واضح آواز میں) ہاں...

(اندھیرا۔)

گیارھواں منظر

(دروازے کے پاس ایک گٹھری بندھی رکھی ہے۔ قریب ہی ایک ٹرنک یا بکسا رکھا ہے۔ لکشمی رسوئی میں سامان سمیٹ رہی ہے۔ سکھارام دروازے کے پاس کھڑا ہے۔)

سکھارام :کام ختم ہوا کہ نہیں؟ گاڑی کا ٹائم ہو گیا۔

لکشمی :بس بھگوان کو نمسکار کر کے آتی ہوں۔

(مورتی کے سامنے دیا جلاتی ہے، جھک کر بھگوان کو نمسکار کرتی ہے۔ اچانک اسے کچھ یاد آتا ہے۔ پھر لوٹ کر کچھ سامان ٹھیک کرتی ہے۔)

سکھارام :چلو جلدی۔

(لکشمی باہر آتی ہے۔ سکھارام ٹرنک اور گٹھری اٹھاتا ہے۔)

لکشمی :سامنے والوں کو بتا کر آتی ہوں۔ یوں ہی چلے جانا اچھی بات نہیں ہے۔

(وہ باہر جاتی ہے۔ سکھارام کھڑا ہے۔ لکشمی لوٹ کر آتی ہے۔)

سکھارام :سب ہو گیا؟

لکشمی :کوئی باہر جائے تو گھر میں فوراً جھاڑو نہیں لگانا چاہیے۔ ایسا کرنے سے غریبی آتی ہے۔ جانے سے پہلے میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو مار کر جاتی ہوں۔

Scanned with CamScanner

سکھارام :ارے مگر گاڑی چھوٹ جائے گی۔(لکشمی جلدی جلدی جھاڑو لگاتی ہے۔) اب چلو جلدی۔

لکشمی :چلو... (اچانک) ارے ایک رہ گیا!

(سکھارام ٹھہرتا ہے، لکشمی واپس آتی ہے۔)

سکھارام :اب کیا رہ گیا؟

لکشمی :چیونٹے کو شکر دینا بھول گئی تھی، اچھا ہوا یاد آیا۔(کھڑکی کے پاس پہنچنے پر کوّوں کی کائیں کائیں سنائی دیتی ہے۔) جاتی ہوں کوّے راجا! روز آتا تھا، اب اسے کون کھانا دے گا؟

سکھارام :میں کھلا دیا کروں گا، مگر اب چل۔

لکشمی :پاؤں اٹھتے نہیں ہیں۔

سکھارام :وہ مجھے دکھائی دے رہا ہے۔

لکشمی :(گھر کی جانب دیکھتے ہوئے) سال بھر رہی، سارے گھر کی عادت سی ہو گئی تھی، اب پھر... (آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے) مایا بری چیز ہوتی ہے۔

(سکھارام بے چینی سے اس کے چلنے کا انتظار کر رہا ہے)

سکھارام :اب چلو۔(لکشمی اس کے پاؤں چھوتی ہے، وہ جھٹ اپنے آپ کو الگ کرتا ہے۔) یہ کیا ہے؟ کس لیے؟

لکشمی :اب دوبارہ نہیں مل سکیں گے اس لیے۔ بھگوان نے جسے دیا وہ نصیب میں نہیں رہا، اُس کو میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہاں تمھارے پاس آئی۔ تم کو اپنا مانا تھا، اپنا مان کے سب کچھ دیا، اپنے پاس کچھ نہیں رکھا۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ زیادہ مت پینا۔ ٹھیک وقت پر کھانا کھا لیا کرنا۔ پوجا کرنے کو مت بھولنا۔ اس سے پنیہ ملتا ہے۔ دیوی کی بھبوت اندر پڑیا میں چھینکے پر رکھی ہے، پریس کو جاتے ٹائم لگا لیا کرنا۔

سکھارام :سب کرلوں گا، مگر پہلے یہاں سے چلو۔

(سسکتی ہوئی لکشمی کو باہر دھکیل کر خود بھی باہر جاتا ہے، دروازہ بند کر کے تالا لگاتا ہے۔

دونوں چلے جاتے ہیں۔ اندھیرا۔)

بارھواں منظر

(دھیرے سے روشنی ہوتی ہے، سکھارام اور داؤد چرس پی رہے ہیں۔)

سکھارام :داؤد! اتنی آئیں، گئیں، مگر اس کے جانے سے کچھ دھکا سا لگا ہے۔

داؤد :(نشے میں کچھ بدبداتا ہے۔) ہاں، ایسا ہوتا ہے...

سکھارام :مگر اب اسے چلائے رکھنے میں کوئی مطلب نہیں تھا۔ روز کے روز اٹھ کر بے مطلب کی کھچ کھچ سالی... پھر تکلیف تو اسی کو زیادہ ہوتی تھی۔ شوہر کی مار کھا کھا کر پہلے سے کمزور ہوئی تھی۔ عمر بھی زیادہ ہونے سے کچھ تھک گئی تھی، اور پھر اوپر سے اپن تو ایسے... اور یہ جسم ہوس کا بھنڈار ہی تو ہے داؤد، قابو نہیں رہ پاتا۔ اس لیے سوچا اب بیچاری کو تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔ رہے گی اپنے بھتیجے کے پاس، بچا کھچا جیون پوجا پاٹ میں گزار لے گی۔

داؤد :(نشے کی پینک میں) اچھا کیا۔

سکھارام :تم بھی اس بات کو ٹھیک مانتے ہو؟

داؤد :ہاں ہاں... بالکل... میں بھی آج کل یہی سوچتا تھا۔

سکھارام :کیا؟

داؤد :یہی کہ اب تمھارا یہ لفڑا ختم ہونے کا ٹائم آ گیا ہے۔

سکھارام :لفڑا مت بولو یار۔

داؤد :ٹھیک ہے، نہیں بولوں گا۔ (دونوں چلم سے کش لگاتے ہیں، نشے میں دھت ہیں۔ لمحے بھر کی خاموشی کے بعد داؤد بول اٹھتا ہے۔) سکھارام، اب اگلے کا کیا سوچ رکھا ہے؟

سکھارام :اگلے کا، مطلب؟

داؤد :مطلب، نیا۔

سکھارام :نیا؟

داؤد :یعنی اب نیا پنچھی کب آنے والا ہے؟

سکھارام :(سوچتے ہوئے) آں... اچھا اچھا... ابھی دو دن پہلے جھگھورے نام کے گاؤں

Scanned with CamScanner

کے کسی ڈمس پولیس فوجدار کے بارے میں ایک خبر کان میں پڑی ہے۔ سنا ہے آٹھ پندرہ روز میں اُس کی بیوی شاید نکلے گی۔ اس عورت کی ماں سوتیلی ہے۔ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ کل پرسوں ہی میں شاید کوئی بات بن جائے۔

داؤد :تب تو اچھا ہے۔

سکھارام :اب کل سے اسی کے چکر میں رہوں گا۔

داؤد :بالکل لگے رہنا۔ لو، اب چلم لو۔

(دونوں اسی طرح بیٹھے رہتے ہیں، اندھیرا ہوتا ہے، پردہ گرتا ہے۔)

❁

دوسرا باب

پہلا منظر

(سکھارام چلاّ رہا ہے: "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کتنی بار کہا، سنائی نہیں دیتا کیا؟ ادھر سے سب چلے جاؤ... جاؤ اِدھر سے، کیا سنیما چل رہا ہے؟ کہ تماشا ہو رہا ہے؟ مار مار کر ایک ایک کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔" باہر سے دروازہ کھلتا ہے۔ سکھارام اندر داخل ہوتا ہے۔ ہاتھ میں، بہت پرانی نہیں مگر ایک اٹیچی ہے۔ اس کے پیچھے کچھ دیر بعد گدرائے بدن کی ایک عورت داخل ہوتی ہے۔ لکشمی کی بہ نسبت کچھ جوان ہے۔ یہ چمپا ہے۔)

سکھارام :آجاؤ۔ گھر دیکھ لو، اب تمھیں اسی گھر میں رہنا ہے، کچھ میں آیا؟ (نگاہوں سے نگاہیں ملا کر) گھر میری طرح ہے۔ ہاں، بعد میں شکایت نہیں چلے گی۔ اچھی طرح سے دیکھ لو۔ پسند ہو تو اپنا سامان نیچے رکھ دو۔ یہ کسی راجا کا محل نہیں، سکھارام بائنڈر کا گھر ہے۔ سکھارام بائنڈر تمھارے پرانے مالک کی طرح نہیں ہے۔ وہ کیسا ہے، یہ تمھیں سمجھنا پڑے گا۔ سب گھوڑے بارہ ٹکے والا معاملہ یہاں نہیں چلے گا، کیا؟ (وہ گھر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ نگاہیں ملنے پر سکھارام اس کے جسم کے خدوخال میں کھو جاتا ہے۔ لمحہ بھر بعد ہوش ٹھکانے آنے پر) اپنا سب کچھ الگ ہے۔ دماغ

گرم ہونے پر، بہت مارتا ہوں، منھ میں گالی اور بیڑی ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ حالت کچھ بہت اچھی نہیں ہے، مگر دو ٹیم کا کھانا ضرور ملے گا۔ دو ساڑیاں شروع میں، پھر سال میں ایک، وہ بھی مہنگی نہیں۔ گھر میں سلیقے سے سب کچھ کرنا پڑے گا، صاف صفائی دکھائی نہ دی تو باہر کا راستہ دکھاؤں گا۔ بعد میں کچھ بولنے کا نہیں۔ باہر بھلے ہی پھٹی چپل کی قیمت کے کیوں نہ ہوں، مگر اپنے گھر میں اپن راجا کی طرح رہتے ہیں۔ گھر گھر کی طرح ہونا چاہیے، کیا جی؟ (وہ گھر کا معائنہ کرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملاتی رہتی ہے، کچھ ہنستی ہے، وہ اس میں کھو جاتا ہے، پھر سنبھل کر) گھر کسی بیاہتا جوڑے کی طرح دکھنا چاہیے۔ کنواں ادھر ہے، گھر کے پیچھے۔ پیخانہ دور ہے، اُدھر۔ (وہ یوں ہی کسمساتی ہے۔) کیا ہوا؟ گرمی کے دنوں میں کنواں سوکھ جاتا ہے۔ پانی ندی پر سے لانا پڑتا ہے۔ ندی سوا میل پر ہے۔ بارش میں بچھو نکل آتے ہیں۔ مجھے کام کے بغیر گھر سے باہر نکلنا اچھا نہیں لگتا، کوئی آیا...

(وہ دروازے کی جانب دیکھتی ہے۔)

نہیں، کوئی آیا نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی آجائے تو گردن نیچی کر کے بات کرنے کا۔ آنے والا انجانا ہو تو منھ پر پلو لے کر بات کرنے کا۔ میں گھر میں نہ رہوں تو کسی کو گھر میں نہیں لینے کا۔

چمپا :بچھو کو؟

سکھارام :آں...؟ (دھیمی آواز میں) نہیں، اسے بھی نہیں۔ کاٹتا ہے نا؟

چمپا :بہت۔

سکھارام :میں برا ہوں، گانجا پیتا ہوں، رنڈی باز ہوں۔ (وہ گال پر انگلی رکھے اسے دیکھنے لگتی ہے۔) نہیں اب نہیں ہوں۔ غریب ہوں، جیسا بھی ہوں، دارو بھی پیتا ہوں، مگر اپنی عزت ہونی چاہیے۔ (دروازے میں داؤد ہے۔)

داؤد :یا ہو... (سکھارام اور چمپا اسے حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔) معاف کرنا یار، مگر...

سکھارام :نہیں کوئی بات نہیں...

داؤد :ایسا کبھی کچھ دیکھا نہیں تھا نا!

سکھارام :ایسا یعنی کیسا؟

Scanned with CamScanner

داؤد :کیا یار، خالی پیلی شرماتے ہو۔لیکن سکھارام... (آنکھ مار کر انگلی سے ''مست ہے'' کا اشارہ کرتے ہوے) تو بڑا قسمت والا ہے! کسی اور کا تھا، تمھیں مل گیا مفت میں۔ چلتا ہوں، آؤں گا بعد میں۔

(چمپا کی طرف پھر ایک مرتبہ دیکھ کر چلا جاتا ہے۔سکھارام اور چمپا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر یوں ہی ہنستے ہیں۔پھر سکھارام کی نظر جب اس کے جسم کے ابھار پر جاتی ہے،وہ گھائل ہو جاتا ہے۔)

سکھارام :(نرم لہجے میں) گھر پسند آیا؟

چمپا :اس میں پسند آنے کی کیا بات ہے؟

سکھارام :اب یہ جیسا ہے۔

چمپا :بہت پرانا لگتا ہے۔

سکھارام :(اپنے آپ پر قابو پاتے ہوے) پسند نہ ہو تو یہاں سے باہر نکلو۔

چمپا :باہر کوئی دوسرا گھر بھی ہے؟

سکھارام :نہیں، یہی ایک گھر ہے۔اور یہ کسی راجا کا محل نہیں، سکھارام بائنڈر کا گھر ہے۔

چمپا :کون ہے سکھارام بائنڈر؟

سکھارام :(ہڑبڑاتے ہوے) کون مطلب؟ میں۔

چمپا :ایسا کیا؟ میں سمجھی کوئی دوسرا ہے۔

سکھارام :(چمپا کے جسم کے اثر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہوے) بات جمتی ہو تو چولھے کے پاس جا کر چائے بناؤ۔ چولھے کے پاس دودھ وغیرہ ہے... اور ہاں، آخری بات تو کہنے کی رہ گئی، یہاں پر شادی شدہ بیوی کی طرح رہنا پڑے گا۔

چمپا :بہت بھوک لگی ہے، کچھ کھانے کو ملے گا؟

سکھارام :چولھے کے پاس کچھ ہوگا۔

چمپا :(بیٹھتے ہوے) پھر دیکھ لونا!

سکھارام :(ہڑبڑا جاتا ہے، مگر پھر) اس گھر میں عورت ذات کو عزت سے کام کرنے کا، اپنی

اس گھر میں قدر ہونی چاہیے۔

چمپا :ہاں، کل سے پیٹ میں کچھ نہیں گیا۔ گھر سے چلتے وقت صرف ایک امرود ہاتھ آ گیا تھا۔ وہی کھا کر چلی ہوں۔

سکھارام :(چمپا کے جسم سے مجبوراً نظریں ہٹاتے ہوئے) اِدھر رہنے کا تو کوئی ڈر نہیں رکھنے کا۔ یہاں سکھارام بائنڈر سب کا وقت بن کر رہتا ہے۔

چمپا :ڈر؟ میں کس سے ڈروں گی؟ شوہر سے؟ (تھوکتی ہے۔) وہ میرا کیا کرنے والا ہے؟ اُس گھر میں اور رہتی تو اسے ٹھیک کر کے رکھ دیتی۔ مگر میں ہی اس سے تنگ آ گئی تھی۔ دارو پی کر اٹھتے بیٹھتے جان دینے کی دھمکی دیتا تھا۔ جان کا ہے کی دیتا، منہ جلا کہیں کا... ذرا کچھ کھانے کو ہو تو دیکھ لوںا۔ (سکھارام کچھ دیر ٹھہر کر اندر جاتا ہے۔) ہاں۔

(سکھارام رسوئی میں جا کر کچھ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ چمپا باہر مردنگ کے ساتھ کھیلنے لگتی ہے۔)

لگتا ہے ڈھولک بجاتے ہو۔

سکھارام :ڈھولک نہیں، مردنگ۔ بجاتا ہوں، مردنگ۔

چمپا :دونوں ایک جیسے دِکھتے ہیں، ہمارے اُن کے منہ کی طرح۔ کہنے کو فوجدار تھا، مگر چور بھی اس کے منہ پر پیشاب نہ کرتا۔ پستول چوری گیا، اس لیے سرکار نے نوکری سے ڈسمس کر دیا۔ چوری ہونے کے بعد بھی اس مردار کو دوسرے دن مالوم ہوا۔ اتنی پیتا ہے۔

(سکھارام کھانے کے لیے تھالی میں کچھ لے آتا ہے۔)

سکھارام :اس گھر میں عورت ذات کو تمیز سے بات کرنی پڑتی ہے۔ بدتمیزی بالکل برداشت نہیں ہوگی۔

چمپا :ہاں... (کھانے لگتی ہے، مگر یاد آنے پر دماغ کا کیڑا اٹھ جاتا ہے۔) مجھے دھندے سے لگانے کو نکلا تھا۔ وہ مجھے اس جنم میں تو دھندے سے نہیں لگا سکتا۔ (کھانا کھا کر انگلیاں چاٹتی ہے۔) پھر کیا، میں ایسی ویسی عورت ہوں کیا؟ اب اچھی سی چائے بناؤ۔

سکھارام :اس گھر میں ایسے سب کام عورت کو کرنے پڑتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

چمپا : پھر بلا لو اسے۔

سکھارام : یہاں نوکر نہیں رہتے۔عورت، مطلب اس گھر میں آئی ہوئی عورت۔

چمپا : یعنی کون؟ میں؟ مگر مجھے تو چائے بنانی نہیں آتی۔

سکھارام : کیا؟ چائے بنانی نہیں آتی؟

چمپا : ہاں۔ادھر شوہر کے گھر میں میری ساس تھی، اور میکے میں میرا باپ چائے اور کھانا بناتا تھا۔ماں پان تمباکو کی دکان سنبھالتی تھی۔اچھا بزنس تھا ہمارا، دارو بھی بیچتے تھے۔وہیں دکان پر یہ مردار شوہر ملا تھا۔ریٹ مارنے آیا اور دوسری ہی ریٹ مار کر چلا گیا۔بار بار آتا تھا۔کہتا شادی کر، میں نے کر لی۔مجھے کیا مالوم تھا یوں نکتا نکلے گا حرامی۔نہیں، ویسے میں کچھ برا نہیں بولوں گی۔وہ چائے کا ذرا دیکھ لو۔

(سکھارام کی نگاہیں اس کے جسم ہی پر ٹکی ہوئی ہیں۔ایسے میں داؤد جھانکتا ہے۔)

سکھارام : داؤد، یہاں آؤ۔(اسے ایک طرف لے جا کر) ذرا چائے بناؤ گے؟

داؤد : ہاں ہاں سکھارام، کیوں نہیں؟ ایسے معشوق کے لیے تو... معاف کرنا...

(وہ کچن روم میں جا کر برتن ڈھونڈ کر چائے بنانے لگتا ہے، مگر اس کا دھیان باہر کی طرف لگا ہوا ہے۔)

سکھارام : (یاد آنے پر) تم سے پہلے جو یہاں تھی، وہ ساتویں تھی۔کل ہی چلی گئی ہے۔

چمپا : وہ کیوں؟

سکھارام : گئی مطلب، میں نے بھیج دیا۔ضرورت تک یہاں رکھتا ہوں۔پھر یہاں سب کچھ بیوی کی طرح کرنا پڑتا ہے۔دونوں کلیا کسی ایک کا دل بھر گیا، تو پھر اسے جدھر جانا ہوتا ہے بھیج دیتا ہوں۔ٹکٹ میں نکال کر دیتا ہوں، اوپر سے ساڑی چولی بھی، یہاں ملنے والی سب چیزیں اس کو ساتھ لے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔(جیسے اچانک کچھ یاد آنے پر) مگر یہاں کے اصولوں کے مطابق رہنا پڑے گا۔

چمپا : (آواز لگاتے ہوئے) داؤد! (داؤد اندر سے دوڑا چلا آتا ہے۔) میرے لیے ذرا ایک تمباکو پان لے کے آنا۔

Scanned with CamScanner

داؤد :(خوشی کے مارے) آں... ہاں ہاں، لے آتا ہوں۔(باہر دوڑ لگاتا ہے۔)

سکھارام :اے... (داؤد غیر ارادی طور پر ٹھہرتا ہے۔) الو کی طرح کہاں بھاگ رہا ہے؟ یہ پیسے لے، دو پان لے آ۔ اور اس چائے کا کیا کیا؟

داؤد :بن گئی ہوگی... آیا۔ (دوڑتا ہوا جاتا ہے، چمپا کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے۔)

چمپا :اچھا ہے۔

(سکھارام داؤد سے کچھ کہنے کے لیے دروازے تک جاتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے۔ سکھارام اور چمپا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے رہتے ہیں۔ سکھارام پر اب اس کا جسم اثر انداز ہو چلا ہے۔)

سکھارام :(چمپا کے قریب آتے ہوئے) ہاں، اچھا تو ہے وہ...

(اب سکھارام اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ داؤد دروازے پر دستک دیتا ہے۔ داؤد کی آواز: ''سکھارام بھیا، دروازہ کھولو۔'' سکھارام دروازہ کھولتا ہے۔)

داؤد :یار اتنے میں دروازہ بھی بند کر لیا؟

(چمپا کو پان دیتا ہے۔ وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکراتی ہے۔ داؤد دوڑتا ہوا کچن روم میں جا کر چائے انڈیلنے لگتا ہے۔)

چمپا :(داؤد کو جاتے ہوئے دیکھ کر) اچھا ہے۔

سکھارام :ہاں، مگر اس گھر کی عورت پرائے مرد کے ساتھ زیادہ بات چیت کرے، یہ پسند نہیں کیا جائے گا۔ شروع میں جو کچھ میں نے بتایا ہے وہ سب ضروری ہے۔

چمپا :ہاں...

(بیگ کھول کر اندر سے ساڑی چولی باہر نکالتی ہے اور ایک طرف ہو کر کپڑے بدلنے لگتی ہے۔)

سکھارام :(اسے کپڑے بدلتے دیکھ کر) ادھر نہیں، داؤد باہر جائے، پھر رسوئی میں جا کر بدلنا۔

چمپا :مگر جب اِدھر ہی رہنے کا ہے تو شرمانا کس سے؟

(بلا جھجک ساڑی بدلنے لگتی ہے، مگر اس انداز سے کہ جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہ دے۔ داؤد چائے کے دو کپ لے کر آتا ہے۔ چمپا کی جانب نظر جانے پر زبان دانتوں تلے دباتا ہے اور اُدھر سے نگاہیں پھیر لیتا ہے۔)

داؤد :سکھارام، چائے لایا ہوں۔

(سکھارام اس کے جسم میں کھویا ہوا ہے۔ داؤد بھی چمپا کی جانب چور نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔)

سکھارام :داؤد، آج کے بعد میں خود تمھاری دکان پر آیا کروں گا۔ ہم وہیں ملا کریں گے۔ یہی اچھا ہوگا۔

داؤد :(نگاہیں کپڑے بدلتی چمپا کی طرف) ہاں ... واقعی یہی ٹھیک رہے گا۔ (ناقابل برداشت ہونے پر) اوہو ہو ...

سکھارام :کیا ہوا؟

داؤد :غضب ... (اسی رنگ میں ڈوبا ہوا) سکھارام اب میں چلتا ہوں ... (ٹھہر کر) بعد میں آؤں گا۔

سکھارام :نہیں، تم مت آنا، میں ہی آ جاؤں گا۔

داؤد :ہاں ... آؤ ... (چمپا سے مخاطب) بھا ... (آگے ''بی'' منھ سے نکل نہیں پاتا۔) میں چلا ... چائے رکھی ہے۔ (تیزی سے چلا جاتا ہے۔)

چمپا :اچھا ہے۔

سکھارام :ارے ایک بات کتنی بار کہے گی؟ چائے پی۔

(دونوں چائے پینے لگتے ہیں۔)

چمپا :(چائے کا گھونٹ لے کر) میٹھا ہے۔

سکھارام :بار بار ایک ہی بات کائے کو بولتی؟ اچھا ہے، بہت اچھا ہے، میٹھا ہے۔

چمپا :چائے میٹھی نہیں ہے کیا؟

سکھارام :(اپنی غلطی کا احساس ہونے پر) چائے کے بارے میں بول رہی ہو، میں سمجھا ...

چمپا :(پان منہ میں رکھتے ہوئے) فرسٹ کلاس ہے۔(سکھارام سے) کھاؤ...

سکھارام :کوئی ہاتھوں سے کھلائے تو اچھا لگتا ہے۔

چمپا :اچھا؟(لے کر اس کے منہ میں ٹھونس دیتی ہے۔) کھاؤ، نیند اچھی آتی ہے۔ چار دن چار راتیں سونے نہیں دیا کلموہے نے۔ دن رات بس جان دے دوں گا کی دھمکی دیتا تھا۔ (جماہی لیتے ہوئے) اب گھنٹہ بھر سوتی ہوں۔

سکھارام :دن میں؟

چمپا :اور نہیں تو کیا رات میں؟ کھانا بن جانے پر مجھے جگا دینا۔ یہاں کوئی کھٹیا وٹیا بستر وستر نہیں ہے کیا؟

سکھارام :نہیں۔

چمپا :نہیں؟ پھر کیسا گھر ہے یہ؟

سکھارام :اور سنو، کھانا خود ہی بنانا ہوگا۔ عورتوں کے کام عورتوں کو ہی کرنے پڑتے ہیں، یہ یہاں کا قاعدہ ہے، نامنظور ہو تو ابھی چلتی بنو۔

چمپا :(لمبی جماہی لیتے ہوئے) مجھے بڑی نیند آئی ہے۔(پاس میں پڑا ہوا کپڑا بچھانے لگتی ہے۔)

سکھارام :اِدھر نہیں، اندر جا کر سونا۔ کوئی آیا تو کیا بولے گا؟

چمپا :(کپڑا اٹھائے اندر چلی جاتی ہے۔) کوئی کیا بولے گا؟ نیند آئی اس لیے سوگئی۔ نیند کسی کے باپ کی تھوڑے ہی ہوتی ہے۔

(رسوئی میں جا کر، کپڑا بچھا کر، ہاتھ کا تکیہ بنا کر سو جاتی ہے۔ اس کے سو جانے پر سکھارام رسوئی کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور پھر اس کے ارد گرد چکر کاٹنے لگتا ہے۔ سوئی ہوئی چمپا کو مسلسل دیکھ رہا ہے، اب اس میں ہوس جاگ گئی ہے۔ باہر ایک کوا کائیں کائیں کرنے لگتا ہے، سکھارام اسے بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔)

سکھارام :اے بھاگ!

(کوا چلاتا رہتا ہے۔ سکھارام بے چین ہو کر باہر کا دروازہ آ کر لگا لیتا ہے اور جہاں چمپا سوئی

Scanned with CamScanner

ہے وہاں اپنا جیکٹ اتار پھینکتا ہے۔ غصے سے:)

سو کیوں رہی ہے؟ چل اٹھ... سو رہی ہے!

(باہر کوے کی کائیں کائیں اور بڑھ جاتی ہے۔ کوے کی آواز کو وہ اپنے کام میں خلل محسوس کرتا ہے۔)

اے، تیری ماں کا...

(پھر چمپا کی جانب دیکھتا ہے، بے قابو ہو کر اس پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ وہ شور مچاتے ہوئے اٹھ بیٹھتی ہے۔ سکھارام خوفزدہ ہو کر دور ہو جاتا ہے۔)

چمپا : کیا ہے؟ ہاں، کیا ہے؟... تو ہے کیا؟ میں سمجھی وہ مردار میرا شوہر ہے۔ کیا ہوا؟ کھانا تیار ہوا؟ کیوں جگایا مجھے؟

(سکھارام کوئی جواب نہیں دیتا، غصے سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔)

ایسا کیا؟ اب میں سمجھی... یہ بات ہے۔ سمجھ گئی۔ اچھا ہوا میں اٹھ گئی۔ ارے اے! سن، میں نے مرد کا گھر ضرور چھوڑا ہے، لیکن کوئی ایسی ویسی عورت نہیں ہوں میں۔ گھر بھی میں نے اپنی عزت ہی کے واسطے چھوڑا ہے۔ وہ مردار دھندے پر لگانے کی سوچ رہا تھا۔ تم تھوڑا سمجھدار رہو... سڑک کے کتے کے مافق مت کرو۔ نیند تو خراب کردی، اب کچھ جلدی سے کھانے وانے کا تو دیکھو۔

(ایک لمبی جماہی لیتی ہے۔ سکھارام جلدی سے جیکٹ نکال کر پہنتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔ وہ نیند میں ڈوبی بیٹھی رہتی ہے۔ سرہانے رکھی ہوئی ایک ڈبیا لے کر اس میں سے تمباکو نکال کر ہتھیلی پر ملتی ہے، پھر نیچے کے ہونٹ تلے دبا لیتی ہے۔ اندھیرا۔)

دوسرا منظر

(اجالا۔ دن۔ دھوپ۔ سکھارام باہر کے کمرے میں بستر پر اوندھا پڑا پہلو بدل رہا ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ گھر میں اور کوئی نہیں۔ خاکی وردی پہنے ایک شخص سامنے آتا ہے۔ سر پر رکھی ترچھی فوجداری ٹوپی، بڑھے ہوئے داڑھی کے بال، کثرتِ شراب نوشی سے بگڑا چہرہ، مگر اس وقت وہ نشے میں نہیں ہے۔ کمر میں بندھی ایک تھیلی۔ گھر میں جھانک کر دیکھتا

ہے، پھر تیزی سے اندر داخل ہوتا ہے۔ چپل اتار کر تھیلی ایک جانب رکھتا ہے۔ سکھارام کے گرد چکر لگا کر اسے دیکھتا ہے اور پھر ایک کنارے جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہتا ہے، پھر اٹھ کر رسوئی میں جھانک کر دیکھتا ہے، پھر اندر جا کر منھ دھوتا ہے۔ وہاں رکھے ہوئے کھانے کے برتن کھول کر دیکھتا ہے۔ باہر آ کر تھیلی سے بوتل نکال کر ایک گھونٹ چڑھاتا ہے اور بوتل اسی طرح تھیلی میں رکھ کر خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے۔ اب سکھارام کے جسم میں حرکت ہوتی ہے اور وہ جاگ جاتا ہے۔)

سکھارام :ارے... اے... یہ دھوپ کہاں سے آ رہی ہے۔ دیکھو، اس کی ماں کا... (ایک کپڑا منھ پر اوڑھ کر دھوپ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکام۔ وہ شخص اس کی حرکتوں کو بڑے مزے سے دیکھ رہا ہے۔) اے... کان پھٹ گئے ہیں کیا تیرے؟ (تنگ آ کر آنکھیں میچتے ہوئے) ارے اس گھر میں کوئی ہے کہ صرف دیواریں ہیں؟ کب سے چلا کر کھڑکی بند کرنے کو بول رہا ہوں... (اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے، آنکھیں چندھیانے کے سبب کھول نہیں پا رہا ہے۔) کہاں گئی یہ صبح صبح اٹھ کر؟ (کسی طرح کوشش کرتا ہے، سامنے وہ خاکی وردی والا شخص دکھائی دیتا ہے۔) کون؟ کون ہے یہ؟ (وہ شخص ان دیکھی کرتا ہے۔) کون ہو تم؟ اور سیدھے گھر کے اندر؟ اور یہ دروازہ کھلا رکھ کر کہاں چلی گئی؟ (تیزی کے ساتھ اٹھتا ہے۔) دھوپ بھی بہت آئی ہے۔ اے بھائی... مگر پہلے تو یہ بتا کہ تو ہے کون؟ اور سیدھے گھر میں کیسے گھسا چلا آیا؟ (وہ خاموش ہے۔) کیا کام ہے؟ یہ گھر ہے یا دھرم شالا؟ فوراً کھڑا ہو، کون چاہیے؟ ارے جلدی بول! (وہ شخص نہ چاہتے ہوئے کھڑا ہو کر ''کوئی نہیں'' کے معنوں میں گردن ہلاتا ہے اور پیار بھری مسکراہٹ بکھیرتا ہے۔) پھر گھر میں چور کی طرح کیوں گھس آئے ہو؟ (وہ شخص نفی میں گردن ہلاتا ہے۔) تمھیں پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔ (بغور دیکھ کر) مگر تم تو خود پولیس کے فوجدار کی طرح دکھ رہے ہو۔ ہاں... بولو، فوجدار کا یہاں کیا کام؟ تم نے اس سکھارام بائنڈر کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کوئی راستے کا آدمی؟ چل نکل یہاں سے... چلتا بن۔ باہر سے بات کر، چل باہر نکل! (وہ شخص دوبارہ وہیں بیٹھ جاتا ہے۔) اب بیٹھ مت، کھڑا ہو جا۔ (وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ سکھارام اسے بغور دیکھ کر) کون ہے تو؟

شخص: (اس کے چہرے پر نروس ہنسی۔ نمسکار کرتا ہے۔) میں چمپو کا شوہر۔ فوجدار شندے کہتے

ہیں مجھے۔ ڈسکس ہوں۔

سکھارام :اچھا تو وہ تو ہے؟ اور یہاں کیسے؟ گھر میں کس نے آنے دیا؟ اور چمپا کہاں ہے؟ کہیں تم نے اس کا برا۔۔۔؟ (وہ شخص نفی میں گردن ہلاتا ہے۔) پھر وہ کہاں چلی گئی؟

شخص :بھگوان جانے۔ جب میں آیا تب وہ یہاں نہیں تھی۔ تم سوئے تھے اس لیے میں بیٹھا رہا۔ (پھر آدھا نمسکار کرتے ہوئے) پہچان ہوئی، اچھا ہوا۔

سکھارام :تمھارا یہاں کیا کام ہے؟ کیا اسے واپس لینے آئے ہو؟ وہ نہیں آئے گی، جاؤ۔

شخص :میں بھی اسے واپس لینے نہیں آیا ہوں۔ اِدھر ہی اچھی ہے، سکھی ہے، اچھا ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے؟

سکھارام :پھر ادھر کائے کو آئے؟

شخص :سوچا، کیسی ہے دیکھ آؤں، رہا نہیں گیا۔

سکھارام :بڑا دل ہے تمھارا اس پر!

شخص :بیوی ہے، گھر سے چلی گئی تو کیا ہوا؟

سکھارام :کہاں گئی، کچھ مالوم نہیں۔ چائے بھی بنا کر گئی ہے کہ نہیں؟

شخص :نہیں۔

سکھارام :کیا نہیں؟

شخص :چائے بنا کر نہیں گئی ہے۔

سکھارام :تمھیں کیسے مالوم؟

شخص :(تھوڑا اسٹپٹا کر) مجھے چاہیے تھی، اس لیے اندر دیکھا۔

سکھارام :واہ بیٹا! تم نے گھر بھی چھان مارا؟

شخص :صرف چائے کا برتن دیکھا۔

سکھارام :یہاں سے چلتے بنو۔ باہر نکلو۔۔۔ نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا۔

شخص :چلاؤ مت، خواہ مخواہ بدنامی ہوگی۔

سکھارام :اب تمھارا اس سے کیا سمبندھ ہے؟

Scanned with CamScanner

شخص :سمبندھ تو جنم جنم کا ہوتا ہے، جو اوپر طے ہوتا ہے۔ (اوپر دیکھ کر نمسکار کرتا ہے۔)

سکھارام :اب وہ یہاں میرے پاس رہتی ہے۔

شخص :اسی لیے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک چلا آیا۔

سکھارام :وہ تمھارے پاس واپس نہیں آئے گی۔

شخص :نہ آئے، بس سکھی رہے۔ یہ کافی ہے۔

سکھارام :وہ تو تمھیں پوچھے گی بھی نہیں۔

شخص :قسمت ہوتی ہے۔

سکھارام :پھر تمھیں کیا چاہیے؟ کیوں آئے ہو یہاں؟

شخص :(معصوم چہرہ بناتے ہوئے) یوں ہی، چمپی کے بغیر چین نہیں آتا۔

سکھارام :چپ رہو! اس نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔

شخص :پر چمپی بہت اچھی ہے، یہ چوڑا اپٹھا، یہ بڑی چھاتی، یہ اتنے—

سکھارام :چپ رہ! تیرا تھوبڑا توڑ دوں گا۔ یہاں سے نکل، چل! اپنی بیوی کے بارے میں ایسی باتیں کر رہا ہے! سؤر کہیں کا۔ (اس کی گردن پکڑ کر اسے دروازے تک لے جا کر چھوڑ آتا ہے۔) نکل... نکل...

شخص :تھیلی رہ گئی۔ (پھر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔) میں رک جاتا ہوں، چمپی ملے گی۔ اس کی بہت یاد آ رہی ہے۔

سکھارام :(اس کی بے حیائی سے پریشان) اس کی ماں کا... منھ بھی دھونے نہیں دے رہا ہے! ٹھہر ابھی منھ دھو کر میں تجھے ٹھیک کر دیتا ہوں۔

(کچن روم میں جاتا ہے، کلّی کر کے کھڑکی ہی سے منھ کا پانی باہر پھینک دیتا ہے، پھر چمپا کے شوہر کے پاس آتا ہے۔ وہ اپنی بوتل منھ کو لگا کر پھر ایک گھونٹ بھرتا ہے، سکھارام کو دیکھ کر وہ پھر اپنا چہرہ معصوم بناتا ہے۔)

ابھی یہاں سے چلتے بنو۔

(وہ اب آرام سے پاؤں پھیلائے بیٹھا ہے۔ سکھارام اور بے چین ہو جاتا ہے۔)

داؤد :(باہر سے آوازیں) سکھارام! اے سکھارام! (اندر آکر) پنچھی کہاں ہے؟
(فوجدار شندے کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ ''یہ کون ہے؟'' اشارے سے سکھارام سے پوچھتا ہے۔)

سکھارام :چمپا کا شوہر۔

داؤد :(اسے دیکھ کر) مجھے تو دیکھ کر ہی لگا تھا... تو یہ اُس پنچھی کا پنجرہ ہے؟ (اس سے مخاطب ہو کر) سلام الیکم۔ (چمپا کا شوہر معصوم چہرہ بناتا ہے۔) پنچھی آیا تو پنچھی کا پنجرہ بھی پیچھے آیا... وہ پنچھی بغیر اکیلا کیسے جیے گا سکھارام؟

سکھارام :دِکھنے کو غریب ہے، مگر ہے بڑا پہنچا ہوا۔ اپنی بیوی کے بارے میں ایسا گندہ بول رہا تھا...

داؤد :اچھا؟ کیا بول رہا تھا؟

سکھارام :چھوڑ، جانے دے۔ ہنکال رہا ہوں، مگر جا بھی نہیں رہا ہے، حرام خور...

داؤد :جہاں اس کا پنچھی وہاں یہ! (چمپا کے شوہر کو) کیوں حضت، برابر ہے نا؟ (چمپا کا شوہر پھر معصوم سکراہٹ پھیلاتا ہے۔)

سکھارام :ہاں ہاں، جیسے بیوی پر بڑا دلُ ہے نا اس کا! (اس سے مخاطب ہو کر) چل اے... اٹھ، دفع ہو میری نظروں سے، سالا...

داؤد :سکھارام، اب کیا تمھیں اس پنچھی کے ساتھ اس کا پنجرہ بھی سنبھالنا پڑے گا؟ یار... مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ (دھیرے سے) پرندے کے شکاری کو پنجرے سے کیا گھبرانا دوست؟ مارو گولی۔
(چمپا کا شوہر اس بیچ بوتل نکال کر ایک گھونٹ بھر لیتا ہے۔)

سکھارام :(دانت پیستے ہوئے) جی کرتا ہے، چیر کے رکھ دوں سالے کو۔

داؤد :چھوڑ و یار... مگر پنچھی کہاں ہے؟

چمپا :(باہر سے) ہاں بائی جاؤ، مگر کل بھی جاتے وقت آواز دینا۔
(چمپا اندر آتی ہے، اس کے کندھے پر دھلے کپڑے رکھے ہیں۔)

چمپا :(سکھارام سے) اٹھ گئے؟ ندی پر جاتے ہوئے کتنی بار آواز دی، پر کوئی جواب

Scanned with CamScanner

نہیں۔(شوہر پر نظر جاتے ہی) کون؟ ارے یہ ڈھونگی اِدھر؟ (چمپا کا جسم اینٹھ جاتا ہے، پھر ساڑی کا پلو کمر میں ٹھونستے ہوئے) یہ آ گیا؟

سکھارام :میرے جاگنے سے پہلے ہی اندر آ بیٹھا تھا...

چمپا :مگر اندر کیوں لیا؟ باہر ہنکال دینا تھا۔

سکھارام :مجھے نہیں مالوم وہ اندر کب آیا۔ میں جاگا تو یہ تھا۔ پھر جاتا ہی نہیں...

چمپا :نہیں جاتا؟ کیسے نہیں جاتا۔ میں ابھی دیکھتی ہوں... (آگے بڑھ کر شوہر کا کالر پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اسے کھڑا کرتی ہے۔) کیا ہے رے مردے؟ (اس کے منھ پر ایک طمانچہ مارتی ہے۔) تیرا یہاں کیا ہے؟ بول! (اس کے بعد اسے ہاتھ اور پاؤں سے مسلسل مارنے لگتی ہے۔) تیرے کو اِدھر سے کسی نے دعوت بھیجی تھی؟ بول!

(سکھارام اور داؤد حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے ہیں۔ چمپا دروازے سے چپل اٹھا لاتی ہے، اور اب اپنے شوہر کو چپل سے مارنے لگتی ہے۔ سکھارام اور داؤد چمپا کی برہمی دیکھ کر خوفزدہ سے ہیں۔ اب وہ شوہر کو کسی بورے کی طرح گھسیٹ کر دروازے میں پھینک آتی ہے۔)

جا، اب پھر یہ منھ لے کر آیا تو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میرے راستے میں دوبارہ مت آنا، کہے دیتی ہوں... میرا تیرا اب کوئی سمبندھ نہیں ہے۔

شخص :(کسی طرح اٹھ کر) جاتا ہوں... اب جان ہی دے دیتا ہوں... دے ہی دیتا ہوں اب جان...

چمپا :ارے دے دے! میں ہمیشہ کے لیے چھوٹ تو جاؤں گی۔ جا، جلدی دے۔

(چمپا کا شوہر مڑتا ہے، پھر گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ چمپا اسے دھکا دے کر باہر نکال دیتی ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ چمپا پھر ایک لات رسید کرتی ہے۔)

مر... جلدی جا کے مر...

داؤد :مگر چمپا بائی، وہ سچی مر گیا تو؟

چمپا :ارے نہیں مر رہا ہے نا... یہی تو دکھ ہے۔ جلدی مرے تو چھٹکارا ملے... مجھے بھی، اسے بھی۔

Scanned with CamScanner

(آگے بڑھ کراس کے منھ پر کس کے ایک چانٹا مارتی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگتا ہے۔)

شخص :(کسی طرح اٹھ کر پھراندر آنے کی کوشش کرتا ہے۔) تھیلی... میری تھیلی...

(چمپا آگے بڑھنے لگتی ہے، داؤدا سے روک دیتا ہے۔ چمپا کا شوہر ڈگمگاتا ہوا تھیلی کی طرف بڑھتا ہے اور وہیں بیٹھ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگتا ہے۔)

جان دے دیتا ہوں میں... جان دے دیتا ہوں...

(کسی طرح تھیلی سے بوتل نکال کر منھ کو لگالیتا ہے۔)

چمپا :(آگے بڑھ کر اسے لات مارتے ہوے) لے اور لے، مردار... اور لے...

(سکھارام اسے پیچھے کھینچتا ہے۔)

سکھارام :(چمپا سے مخاطب) عورت ہو یا کوئی جانور؟ کتنا مارا ہے اسے؟ ارے وہ تمھارا شوہر ہے، تمھارے پاس دل ہے کہ نہیں؟

چمپا :نہیں، میرے پاس دل ہے ہی نہیں، یہ کب کا کچا چبا کر کھا گیا۔ ارے ابھی میں نے پلو لینا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ ماں سے خرید کر مجھ سے شادی کر لی۔ مجھے تو اس وقت کچھ بھی سمجھتا نہیں تھا۔ رات رات بھر پریشان کرتا تھا۔ مجھے داغ دیتا تھا، سوئیاں چبھاتا تھا۔ گندے گندے کام کرنے کو مجبور کرتا تھا۔ ایک دن میں بھاگ گئی تو پکڑ کر لے آیا اور باندھ کر میری غلط جگہ پر مرچی پاؤڈر ڈال دیا بھڑوے نے... میرے پاس دل رہا ہی کہاں ہے؟ اس نے دانتوں سے کتر ڈالا۔ میرا خون پی گیا ہے یہ... اٹھ رے سؤر، اب میں مرچی پاؤڈر بھرتی ہوں تیری...

(وہ آگے بڑھ کر پھر اس پر حملہ کرنا چاہتی ہے۔ سکھارام آگے بڑھ کر روکتا ہے، مگر اس کو چمپا کی طاقت کا احساس ہوتا ہے۔)

سکھارام :داؤد، اس کو باہر لے جا یار، جلدی سے... جلدی کر...

(داؤدا آگے بڑھ کر چمپا کے شوہر کو پکڑ کر کھینچتے ہوے کسی طرح باہر لے جاتا ہے، چمپا دیکھ رہی ہے۔ شوہر کی جانب دیکھ کر زور سے اس کی طرف تھوکتی ہے۔)

چمپا :تو پھر ادھر آ تو سہی پھر دیکھ کیسے مرچی پاؤڈر... (اس کے جانے کے بعد سکھارام

سے) میرا ہاتھ چھوڑو، اندر بہت کام باقی ہے۔

(سکھارام ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ چمپا اندر چلی جاتی ہے۔ سکھارام اسے دیکھے جا رہا ہے، تھوڑا خوفزدہ ہے۔ تھوڑی دیر میں داؤد آتا ہے۔)

داؤد :(دھیمی آواز میں) چھوڑ آیا، لیکن سکھارام... او ہو ہو... کیا مارا پنچھی نے۔ یار اس کی مار یاد آنے پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... یار دیکھ، تو سنبھل کر رہنا... سمجھا؟ یہ پنچھی پہلے والے پنچھی جیسا نہیں ہے... یہ ڈفرنٹ ہے۔ ہائے ہائے... ایک دم غضب...

(سکھارام خاموش کھڑا ہے۔ اندھیرا۔)

تیسرا منظر

(رات۔ رسوئی میں دھیمی روشنی ہے۔ چمپا پھٹا کپڑا بچھائے سو رہی ہے۔ ایک سایہ باہر کے کمرے سے داخل ہوتا ہے، یہ سکھارام ہے۔ سوئی ہوئی چمپا کے پاس کھڑا ہو کر اسے دیکھے جا رہا ہے، پھر باہر کے کمرے میں جاتا ہے۔ بے چینی کے عالم میں چکر کاٹ رہا ہے۔ سوئی ہوئی چمپا کے جسم پر جھکتا ہے، پھر سیدھا کھڑا ہوتا ہے، پھر وہیں اس کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ وہ سکھارام کی حرکتوں سے بے خبر کروٹ بدل کر سو جاتی ہے۔ سکھارام کی سانسیں تیز چل رہی ہیں۔ وہ اسے ہاتھ لگاتا ہے۔ وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھتی ہے۔)

چمپا :(اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوے) کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ تو؟ پھر تجھے وہی خیال آیا؟ میں نے کہا تھا نا؟ تیرے کو سمجھتا نہیں ہے کیا؟ میں بہت بری عورت ہوں، بپھر جاؤں تو... (اپنا آنچل درست کرتے ہوے) مجھے خراب مت کر، کہتی ہوں۔ یہ سب عورت مرد والا معاملہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ (سکھارام دور ہو کر کھڑا ہے۔) جاؤ ادھر باہر جا کر سو جاؤ...

سکھارام :اپنا کیا طے ہوا ہے؟ یہاں رہنے والی عورت کو بیوی کے ما فک سب کچھ کرنے کا ہے۔ اسی شرط پر میں یہاں رکھتا ہوں، اب تک چھ ہو گئی ہیں، کسی نے نا نہیں بولا۔

چمپا :وہ ہوں گی ویسی، میں نہیں ہوں۔ مجھے سونے دے۔

سکھارام :گھر میں ہو کر ملتا نہیں، یعنی کیا؟ میرے کو ملنا چاہیے۔

چمپا : مجھے نہیں جچے گا۔ باہر جا، نہیں تو میں نہیں سوتی۔ (سکھارام کچھ دیر وہیں کھڑا رہتا ہے۔ پھر ''جا، مرجا!'' کہہ کر باہر کے کمرے میں آتا ہے۔ رسوئی میں چمپا بیٹھی ہے۔ سکھارام باہر کے کمرے میں کونے میں رکھی شراب کی بوتل باہر نکال کر منھ کو لگاتا ہے۔)

سکھارام : جا، تو مرجا! (اور پیتا ہے، پھر دھیمے لہجے میں چلا کر) مرجا تو ایک بار! (دروازہ کھول کر اندھیرے میں چلا جاتا ہے۔ چمپا یوں ہی بیٹھی ہے، پھر کسی خیال کے آنے پر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ باہر جا کر ساتھ میں سکھارام کی گردن پکڑ کر اسے اندر لے آتی ہے۔)

چمپا : چپ رہ، میں تجھے سب کچھ دیتی ہوں، مجھے دارو پلا۔ (سکھارام حیرت زدہ سا کھڑا ہے۔) مردار، مجھے دارو دے۔ کہاں ہے؟ بتا، بوتل کہاں ہے؟ (پھر وہ کونے میں رکھی بوتل نکالتا ہے، چمپا اس سے بوتل چھین لیتی ہے۔) بیٹھ اِدھر۔ (اس کے بعد بوتل سے غٹا غٹ شراب پینے لگتی ہے۔ سکھارام اسے حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ یہ سب کچھ دھیمے اجالے میں ہو رہا ہے۔ اندھیرا۔ پھر دھیمی روشنی۔)

چمپا : (خمار آلود لہجے میں) تھوڑی دیر کے بعد میرے ساتھ جا، ہے جو کرنا ہے کر...

(سکھارام حیران سا بیٹھا ہے۔ اندھیرا۔)

چوتھا منظر

(روشنی ہوتی ہے۔ صبح کا منظر۔ دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ سکھارام چمپا کی بغل سے ہڑبڑا کر اٹھتا ہے اور انگڑائی لیتے ہوئے باہر کے کمرے میں آکر دروازہ کھولتا ہے۔)

دروازے میں کھڑے شخص کی آواز: چل رہے ہو نا یار؟ پریس جانے کو دیر ہو جائے گی۔ دروازہ کتنا بجانے کا؟ اتنی گہری نیند لگی تھی کیا؟

سکھارام : (اس پر ابھی نیند کا خمار باقی ہے۔) ابھی آیا، ذرا ٹھہرو۔

(دروزے کے کواڑ بند کر کے رسوئی میں آتا ہے۔ گہری نیند میں پڑی چمپا کو دیکھتا ہے۔ جھک کر اس کے جسم پر کپڑا ڈالنے کے بہانے اس کے جسم کو چھوتا ہے۔ موری کے پاس جا کر اپنے منھ پر پانی کے چھینٹے مارتا ہے، کلّی کرتا ہے۔ باہر جانے سے قبل پھر چمپا کو دیکھتا

Scanned with CamScanner

ہے اور کچھ گنگناتا ہوا آتا ہے۔ شرٹ، جیکٹ اور پھر چپل پہن کر باہر آتا ہے۔ جاتے وقت دروازہ ٹھیک طرح سے بند کرتا ہے۔ چمپا رسوئی میں سوئی پڑی ہے۔ اندھیرا۔)

پانچواں منظر

(روشنی ہوتی ہے۔ چمپا رسوئی میں کھانا کھا رہی ہے۔ سکھارام گھر میں داخل ہوتا ہے۔ چپل اتار کر، جیکٹ اور ٹوپی کھونٹی پر لٹکاتا ہے۔)

سکھارام :میں آگیا ہوں۔

چمپا :آج اتنا جلدی؟ پریس سے چھٹی مل گئی کیا؟

سکھارام :(اندر جاتے ہوئے) نہیں میں خود ہی چلا آیا، پوچھو کیوں؟

چمپا :میرے کو کیا مالوم؟

سکھارام :میرے کو چین نہیں آرہا تھا۔

چمپا :یہ اچھی بات نہیں۔

سکھارام :(اس کے اور قریب ہوتے ہوئے) مگر یہ سچ ہے...

چمپا :دور ہٹو، مجھے کھانا کھانے دو۔ ابھی تک تو میں نہائی بھی نہیں ہوں۔ صبح بہت دیر سے جاگی تھی۔

سکھارام :رات میں مزہ آیا؟

(چمپا بغیر کچھ کہے کھانا کھا رہی ہے۔)

چمپا :مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

سکھارام :چل چل...

چمپا :جھوٹ نہیں بولتی۔

سکھارام :بہت مزہ آیا۔ دن بھر اس رات کے مزے کی یاد آتی رہی... سوچا گھر چلا جاؤں۔

چمپا :اُدھر باہر بیٹھ۔ مجھے کھانا کھانے دے۔

سکھارام :نہیں۔

Scanned with CamScanner

چمپا :پھر؟

سکھارام :پہلے یہ... (پیچھے چھپائی ہوئی شراب کی بوتل دکھاتا ہے۔)

چمپا :مجھے کھانے دے۔

سکھارام :نہیں... (اس کا ہاتھ پکڑتا ہے۔وہ غیر متوقع طور پر جھٹک دیتی ہے۔) اچھا یہ گھمنڈ؟

چمپا :مجھے کھانا کھاتے وقت ایسے پریشان مت کر، کہتی ہوں۔

سکھارام :اس گھر میں میرا حکم ہی چلتا ہے، جو میں بولوں وہی ہوگا۔ (چمپا کھاتی رہتی ہے۔) میرا حکم پورا ہونا چاہیے، ورنہ میں بہت برا آدمی ہوں، بہت مارتا ہوں، آگے پیچھے نہیں دیکھتا۔

چمپا :تو میرے کو بول رہا ہے؟

سکھارام :تم کون الگ ہو؟ میرے کو چاہیے، مطلب چاہیے۔

چمپا :جا اُدھر یا باہر، میرے کو کام ہے۔

سکھارام :(ہاتھ پکڑ کر) چمپا۔

چمپا :(سکھارام کو سمجھانے کے انداز میں) میری سنو، میرے کو تکلیف مت دو۔

(سکھارام ہاتھ چھڑا کر باہر کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔وہ بہت بے چین ہے۔)

سکھارام :جب اس گھر سے باہر جا کے کتّی کی طرح جینا پڑے گا نا، تب مالوم پڑے گا۔جو بھی ملے گا، اس کے ساتھ دکان سجانی پڑے گی دکان، سمجھی؟

(چمپا کھانا کھا رہی ہے، مگر اب وہ پریشان ہوگئی ہے۔تھوڑی دیر یوں ہی گزر جاتی ہے، پھر جانے کیا سوچ کر ہاتھ کی تھالی اچھال کر دور پھینک دیتی ہے۔تھالی گرنے کا بڑا شور ہوتا ہے۔سکھارام اس آواز سے سہم جاتا ہے۔چمپا اٹھ کر موری میں ہاتھ دھوتی ہے، انھیں ساڑی سے پونچھ کر، تھالی اٹھا کر موری کے پاس رکھتی ہے، سکھارام کو نمسکار کر کے باہر آتی ہے۔سکھارام کے قریب جا کر:)

چمپا :چل، دارو دے۔ (سکھارام لمحے بھر کے لیے اس کا یہ انداز دیکھتا ہے۔) میں نے کہا مجھے دارو دے۔

(سکھارام خاموشی سے بوتل اس کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ چمپا منھ سے ڈھکن کھول کر شراب پینے لگتی ہے۔)

لے تو بھی پی۔ (بوتل اس کے منھ سے لگاتی ہے، پھر خود پیتی ہے۔) ٹھہر، تیرے کو اب مزہ دلاتی ہوں۔ (پیتی رہتی ہے، سکھارام کے منھ کو بھی بوتل لگاتی ہے، کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے۔) مزہ دلاتی ہوں، جو آئے گا اسے مزہ دلاتی ہوں، کتے کو بھی اور مُردے کو بھی...

(باہر کے دروازے سے داؤد اندر داخل ہوتا ہے اور وہیں کھڑا رہ کر یہ منظر دیکھتا رہتا ہے۔)

کون؟ داؤد؟ آ تیرے کو مزہ چاہیے؟ آ، لے مُردے... ارے آرے مُردے، آ مجھے لے...

(داؤد خاموش کھڑا ہے۔ چمپا کا ہاتھ سکھارام کی گردن پر ہے۔ وہ ہنس رہی ہے۔ اندھیرا۔)

چھٹا منظر

(باہر اندھیرا ہے۔ گھر کے باہر سے کھڑکی کے راستے روشنی اندر آتی ہے۔ باقی گھر میں اندھیرا ہے۔ تھوڑی دیر چمپا کی نیم مدہوشی کے عالم میں غیر واضح آوازیں۔)

چمپا :کون ہے وہ؟ آؤ مزہ لو مزہ... اے مردار... دور ہو... (نشے میں ڈوبی ہنسی۔) مجھے دارو چاہیے۔ دارو... (ہنسی اور کراہیں۔) مجھے دارو چاہیے... دارو...

(اندھیرا۔)

ساتواں منظر

(سورج کی روشنی۔ چمپا گھر میں نہیں ہے۔ داؤد اور سکھارام۔ سکھارام کے چہرے پر نئی زندگی کے آثار۔ اب وہ پرانا سکھارام نہیں لگتا۔)

داؤد :لیکن سکھارام، تو کام پر نہیں جائے گا تو کیسے چلے گا یار؟ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ گھر سنسار ہے کہ نہیں؟ گئے ہفتے سے تو کام پر گیا ہی نہیں۔

سکھارام :جائیں گے یار، جب مرضی ہوگی جائیں گے۔

داؤد :اور نوکری سے نکال دیا تو؟

سکھارام :ارے نوکری سے ان کا باپ نہیں نکال سکتا یار! اپن ابھی فٹ ہیں۔ ایک نوکری گئی تو دوسری نوکری مل جائے گی۔ ارے ضرورت پڑی تو بوجھ اٹھائیں گے یا پتھر توڑیں گے۔ کام ہی تو کرنا ہے نا؟ یہ سکھارام کبھی کام سے نہیں ڈرا، داؤد۔ اپن محنت کر کے بڑے ہوئے ہیں، باپ کو باپ نہیں سمجھا۔ ماں نے تو مہار کا بچہ سمجھا۔ ناگ پھنی کی طرح بڑھ گیا۔ تو کیا اب میں کسی سے ڈرتا ہوں؟ اس کے بعد، اب صرف چمپا، بس!

داؤد :لیکن لوگ کیا بولتے ہیں؟

سکھارام :(غصے سے) سکھارام بائنڈر سے لوگوں کے باپ کا کیا رشتہ ہے؟ جب میں بھوکا تھا تب کیا ان لوگوں نے مجھے کھلایا تھا؟ یا جب میں میرج کے مشن ہاسپٹل میں بیماری سے مر رہا تھا، تب گاؤں کا کوئی میری خبر لینے یا میں زندہ ہوں یا مردہ دیکھنے آیا تھا؟ نہیں داؤد، کوئی نہیں آیا۔ اس لیے لوگوں کا تم مجھے مت بولو۔ لوگ خود جھک ماریں گے اور دوسرے کی ناک چھوٹی ہونے کی بکواس کرتے بیٹھیں گے۔ گاؤں میں اپن سے زیادہ کوئی بھی صاف نہیں ہے۔ سب سالے میلے کچیلے۔ اپنے لوگوں سے کوئی اچھا ہے نا، تو وہ رنڈیاں ہیں۔ کیا وہ میرے کو کبھی شرابی بولتی ہیں؟ عورت کا دیوانہ ہو کر بے کار ہو گیا ہے، ایسا کبھی بولتی ہیں؟ چمپا کی وجہ سے خراب ہوا ہے، ایسا کہتی ہیں؟ نہیں... کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ رنڈی اور انسان میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ فرق صرف ایک ہی ہے۔ انسان جھوٹے ہوتے ہیں اور رنڈیاں سچی، بس۔ سمجھے؟

داؤد :لیکن سکھارام، اپنے کو اپنا خیال رکھنا چاہیے نا؟ پہلے یہ گھر کیسا تھا اور اب کیسا ہے؟ تجھے یاد ہے سکھارام، ابھی تو اس کو بہت دن بھی نہیں ہوئے۔ یہاں وہ ایک پنچھی تھا، لکشمی بھابی... کیسا لگتا تھا تب؟

سکھارام :اے لکشمی مر گئی، ختم ہو گئی۔ لکشمی اب اپنے واسطے مر گئی۔ اب اس سے کیا سمبندھ؟ وہ مالمہ کب کا ختم ہو گیا۔ اپن پرانی یاد نہیں نکالتے۔ اب صرف چمپا! اور چمپا! چمپا کے ناخن کے برابر کوئی نہیں۔ ا[illegible]ے تمھیں کیا مالوم چمپا کیا ہے۔

داؤد :دیکھو، جو دکھائی دیتا ہے اور سنائی دیتا ہے، وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اتنا ہی میں بول سکتا ہوں۔ تو مان یا مت مان۔ اچھا تو اب میں چلا، میرے دھندے کا ٹائم ہے۔

سکھارام :ج... تو جا، میری فکر مت کر...

(داؤد چلا جاتا ہے۔ سکھارام تنہا ہے۔ کچھ دیر یوں ہی رہتا ہے، پھر اٹھ کر کونے میں چلا جاتا ہے۔ اندھیرا۔)

آٹھواں منظر

(روشنی ہوتی ہے۔ دور تاشوں کی آواز۔ رسوئی میں چمپا نشے میں دھت، اپنے آپ کو سنبھالنے میں مصروف۔ باہر سے سکھارام آتا ہے۔)

سکھارام :(دروازے میں چپل اتار کر) چمپا... چمپا... (کسی طرح لڑکھڑاتی ہوئی سامنے آتی ہے۔) تو نے پی ہے، صبح صبح! آج دسہرہ ہے، تہوار کا دن اور... (چمپا نشے میں ہنستی ہے۔) آج تہوار کے دن تو نے یہ صبح صبح کیا لگا رکھا ہے؟ میں نے پوجا کے لیے پریس پر جاتے ہوئے تجھے کیا کہا تھا؟ ابھی تک تو نہائی بھی نہیں ہے۔ اور پینے لگی؟ کوئی آیا تو کیا بولے گا؟ جا، اندر جا... (چمپا کو کسی طرح دھکیل کر اندر کر دیتا ہے۔) نالائق کہیں کی! تیرے کو تہوار نہیں سمجھتا، دن نہیں سمجھتا... کیا یہ کسی عورت ذات کو اچھا لگتا ہے؟ کوئی اور ہوتی تو منھ توڑ دیتا۔

(یہ کہتے ہوئے باہر کا دروازہ لگا دیتا ہے۔ جیکٹ اور شرٹ نکال کر کھونٹی پر ٹانگ دیتا ہے۔ مردنگ نکالتا ہے، اس پر جمی گرد جھاڑتا ہے، اسے ایک کونے میں لے جا کر رکھتا ہے۔ بھگوان کی تصویر نکال کر اسے بھی صاف کرتا ہے اور پھر پوجا کے پھول جمع کرنے کا برتن لے جا کر اس میں کچھ پھول لے آتا ہے۔ رسوئی کی موری میں جا کر ہاتھ پاؤں دھوتا ہے۔ چمپا کچھ کرتے ہوئے لڑکھڑا رہی ہے۔ جب پاؤں دھو کر باہر آتا ہے، چمپا لڑکھڑا کر گرنے کو ہوتی ہے۔ سکھارام اسے سہارا دیتا ہے، چمپا اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہے۔ سکھارام اسے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ الگ ہونے کے بجائے زور زور سے ہنسنے لگتی ہے۔)

Scanned with CamScanner

دور ہو جا مجھ سے۔ دور ہو جا، کہاں نا؟ مجھے پوجا کرنی ہے۔ دور ہو جا مجھ سے... (چمپا نشے میں ہنس رہی ہے۔) سالی کو شرم نہیں ہے۔ پہلے اس گھر سے نکل... چل نکل... دور ہو رہی ہے یا کمر میں لات دوں؟ (چمپا اور بنستی چلی جا رہی ہے۔) دور ہو جا... دور ہو... کتیا سالی... (سکھارام چمپا کو دھکیل دیتا ہے۔ وہ دور جا کر گرتی ہے۔)

چمپا :(تکلیف سے) آہ... آہ...

(سکھارام اسے کہاں چوٹ لگی، یہ دیکھنے کے لیے جھکتا ہے۔)

سکھارام :دیکھوں کہاں لگی ہے؟ دِکھا کہاں لگی ہے؟ ارے بولتی کیوں نہیں؟ بول کہاں لگی ہے؟ نہیں بولتی تو جا مر...

(سکھارام یوں ہی چمپا کے پاس بیٹھا ہے۔ اندھیرا۔).

نواں منظر

(رسوئی میں دھیما اُجالا۔ چمپا اور سکھارام دونوں بستر میں۔ باہر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔)

کوئی :گھر میں کون ہے؟ سکھارام... اے سکھارام...

(کچھ دیر کے لیے خاموشی۔ جواب نہ پا کر کوئی پھر دروازہ پیٹ رہا ہے۔)

کوئی دوسرا: سکھارام... اے سکھارام... اجی سکھارام جی... سکھارام پنت۔ کیا گھر میں نہیں ہیں؟

تیسرا :گھر میں کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔

کوئی :عورت ہوگی۔

کوئی دوسرا: دونوں ہوں گے۔

تیسرا :اے سکھارام... ارے گھر میں ہو بھی یا نہیں؟

(دروازہ پیٹا جا رہا ہے۔ اب بستر میں پڑے دونوں جسموں میں کچھ ہلچل ہے، مگر پھر بھی کوئی توجہ نہیں دیتا۔ خاموشی۔ دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ شراب کے نشے میں

سکھارام کچھ بڑبڑاتا ہے۔دور تاشے بج رہے ہیں۔کوا کائیں کائیں کر رہا ہے۔پھر دروازے پر آواز۔خاموشی۔اندھیرا۔)

دسواں منظر

(روشنی ہوتی ہے۔رات۔رسوئی میں دھیما اجالا۔باہر دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔کیڑے مکوڑوں کا شور۔دروازے پر دستک۔)

آواز :سکھارام،اُٹھ۔اے اُٹھ... چل... (پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز۔)

سکھارام :کون؟ دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟ اٹھ،اے اٹھ... اٹھ،کہاں تا... کیسے پسر کے سوئی ہے... اٹھ... دیکھ دروازہ کون بجا رہا ہے۔(پھر دروازے پر دستک۔) اتنی رات کو کون آیا ہے؟ سالی اٹھتی بھی نہیں ہے،پسر کے سوئی ہے... (کسی طرح کوشش کر کے اٹھتا ہے،پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔) سر بہت دکھ رہا ہے۔(پھر دروازے پر تھاپ۔)

سکھارام :(بھنائی ہوئی آواز) ارے بابا سنا میں نے... اب... چپ رہ...

(سکھارام لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے،باہر کے کمرے میں آتا ہے۔پوجا کی غرض سے نکالے ہوئے مردنگ کو ٹھوکر لگتی ہے۔سارا سامان بکھر جاتا ہے۔دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔)

اتنی رات کو کون ہے؟

(دروازہ کھلتا ہے،مگر دروازے میں کون ہے دکھائی نہیں دیتا۔سکھارام آنکھیں ملتے ہوئے:)

کون ہے؟ کون؟ کون ہے بابا تم؟ ارے تو؟ سپنا ہے یا سچائی؟ (پھر آنکھیں مل کر دیکھتا ہے۔) تو یہاں کیسے؟

(لمحے بھر کے لیے یوں ہی کھڑا رہتا ہے،اچانک ایک جسم گٹھری لیے اندر داخل ہوتا ہے۔منہ پلو سے ڈھکا ہوا ہے۔گٹھری نیچے رکھتی ہے۔یہ لکشمی ہے۔)

لکشمی :(سپاٹ آواز) بھتیجے نے گھر سے نکال دیا۔اس کی بیوی نے مجھ پر چوری کا الزام

Scanned with CamScanner

لگایا، وہ لوگ مجھے پولیس میں دے رہے تھے۔ میں کہاں جاؤں؟ آخر ادھر چلی آئی۔ میرے واسطے یہی ایک ٹھکانا تھا۔

(سکھارام حیرت زدہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پاتا۔)

اب میں اِدھر ہی رہوں گی۔ اِدھر ہی مر جاؤں گی۔ مجھے کدھر بھی نہیں جانا۔ اِدھر ہی جیوں گی، اِدھر ہی مروں گی۔

(سکھارام دروازے کے پاس کھڑا، لکشمی اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اندر چمپا کے کسمسانے کی آوازیں۔ دور کتے بھونک رہے ہیں۔ سکھارام لکشمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے کے باہر کرتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اب دروازے پر کوئی دستک نہیں ہوتی۔ سکھارام اطمینان کا سانس لیتا ہے۔)

چمپا : (نیند میں) کون ہے؟ کون آیا تھا؟

(سکھارام خاموش ہے، جو کچھ ہوا اس پر اسے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیا سچ مچ لکشمی آئی تھی؟ وہ سر تھامے کھڑا ہے۔ پھر ڈگمگاتا ہوا اندر جا کر بستر پر لڑھک جاتا ہے۔ چمپا دوبارہ پوچھتی ہے: ''کون تھا؟'' دور کہیں کتے ٹھہر ٹھہر کر بھونکتے ہیں۔ اندھیرا۔)

گیارھواں منظر

(رات کا منظر۔ موسلا دھار بارش کا شور ہے۔ اندھیرا۔)

❁

تیسرا باب

پہلا منظر

(روشنی ہوتی ہے۔ صبح۔ گھر میں دھوپ نکل آئی ہے۔ چمپا جھاڑو لیے باہر کے کمرے میں آتی ہے، دروازہ کھولتی ہے۔ دروازے کے راستے دھوپ اندر آتی ہے۔ خود میں کھوئی چمپا

گنگناتے ہوئے جھاڑو دیتی ہے۔ وہ اپنی دھن میں ہے کہ دروازے میں ایک شبیہ آ کھڑی ہوتی ہے۔ یہ لکشمی ہے۔ ابھی چمپا کا اس کی طرف دھیان نہیں ہے۔)

چمپا :(متوجہ ہونے پر) تمھیں روز روز تو اِدھر بھیک نہیں ملے گی بائی، جاؤ اگلا گھر دیکھو۔ (مگر لکشمی دروازے ہی میں کھڑی ہے۔) میں نے تجھے کیا کہا؟ بہری ہے کیا؟ سنائی نہیں دیتا؟ اِدھر بھیک نہیں ملے گی۔ جاؤ اس راستے سے۔ نئی لگتی ہو۔ (لکشمی کھڑی ہے۔) تم جا رہی ہو یا اب آؤں؟ بھکاری تو بھکاری ہی ہوتا ہے۔

لکشمی :میں بھکارن نہیں ہوں۔

چمپا :پھر کیا ہو؟ کسی راجا کی رانی ہو؟

لکشمی :میں اسی گھر میں رہتی تھی۔

چمپا :(حیرت سے) کیا؟

لکشمی :ہاں، اسی جھاڑو سے ادھر جھاڑو دیا کرتی تھی۔ جیسے تم ہو ویسے ہی پہلے میں اِدھر رہتی تھی۔

چمپا :مطلب... تم؟

لکشمی :لکشمی... میں ادھر ایک سال اور اکیس دن رہی ہوں۔ پچھلے سال شراون میں مجھے یہاں لایا تھا۔ چترتھی تھی۔ میں چھ دن کی بھوکی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے...

چمپا :پھر اب تم ادھر واپس کیسے؟

لکشمی :املنیر میں بھتیجے کے یہاں تھی۔ وہاں ان میاں بیوی کا راجا رانی کا سنسار، انھیں میری ضرورت نہیں۔ آخر کدھر جاتی؟ ادھر چلی آئی۔ میرا دوسرا کوئی نہیں ہے۔

چمپا :شوہر؟ (لکشمی لمبا سانس چھوڑتی ہے۔ چمپا جھاڑو دینے لگتی ہے۔) جاؤ، وہ گھر میں نہیں ہے۔ پریس گیا ہے۔

لکشمی :میرے کو مالوم ہے، میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

چمپا :دیکھا تو پھر آواز کیوں نہیں دی؟

لکشمی :نہیں دی۔ کام پر جانے کو دیر ہو گئی تھی نا؟ میری وجہ سے اور دیر ہو جاتی۔

چمپا :اس کو گئے دو گھنٹے ہو گئے ہیں، تب سے تو کہاں تھی؟

لکشمی :میں رات سے باہر اُدھر ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ بارش ہوئی نا صبح، ذرا آنکھ لگ گئی۔ مگر اُن کے پریس جانے کے ٹائم پر کیا مالوم میں کیسے جاگ گئی۔

چمپا :رات کو آئی تھی؟

لکشمی :ہاں۔

چمپا :اور پھر؟

لکشمی :باہر ہی تھی۔ بارش نہیں ہوتی تو آنگن میں سونے والی تھی۔

چمپا :ارے پھر دروازہ کھٹکھٹانا تھا۔

لکشمی :(ذرا ٹھہر کر) نہیں کھٹکھٹایا۔ کیونکہ رات بھی بہت ہو گئی تھی، تم لوگوں کی نیند بے کار میں خراب ہوتی۔

چمپا :میں تو مُردے کی طرح سو گئی تھی، دارو کے نشے میں۔

لکشمی :(حیرت سے) کیا؟ تم دارو پیتی ہو؟

چمپا :ہاں، کیوں؟

لکشمی :رات کو بھی پی تھی؟

چمپا :ہاں۔ روز پیتی ہوں۔ وہ بھی پیتا ہے۔

لکشمی :کل دسہرہ ہے... تہوار کا دن۔

چمپا :تو؟

لکشمی :تیج تہوار کے دن یہ اچھا نہیں...

چمپا :تم شاید دیودھرم مانتی ہو!

لکشمی :ہاں، مجھے بچپن سے یہ اچھا لگتا ہے۔ شاید بھگوان کی شردّھا نے میرے نصیب کا امتحان لیا ہے، کوئی اور ہوتی تو جان دے دیتی، میں زندہ رہ گئی۔ (ذرا ٹھہر کر) تم ادھر کب آئیں؟

چمپا :ہوے ہوں گے ایک دو مہینے... دو ہو گئے ہوں گے۔

لکشمی :میرے جاتے ہی تم آئی ہو۔

Scanned with CamScanner

چمپا :تو کب گئی مجھے کیا مالوم؟

لکشمی :اشٹمی کو گئی... دن مجھے یاد ہے۔ یہاں کا ایک ایک دن مجھے برابر یاد ہے، ایک ایک دن گنوا سکتی ہوں۔ میرے کو لگتا ہے دو مہینے... مطلب، میرے جاتے ہی تم آئی ہوگی، پکّا۔

چمپا :پھر آگے تم نے کیا سوچا ہے؟

لکشمی :کیا سوچوں گی؟

چمپا :یہ سچ ہے، تمھارا اب کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں رہا۔ اب اِدھر ہی رہوگی، ہے نا؟

لکشمی :ہاں، یہی سوچتی ہوں۔

چمپا :اندر آؤ، چائے بناتی ہوں۔

لکشمی :نہیں، کائے کے لیے؟

(چمپا اندر جاتی ہے، لکشمی باہر کے کمرے میں ہے۔)

چمپا :(اندر جاتے ہوے) مجھے بھی پینے کا ہے۔ رات کو بہت تکلیف دیتا ہے سکھارام۔ (باہر اس پر لکشمی کا ردِّ عمل۔) صبح پھر خود ہی چائے بھی بنانے کا، سر بھی درد کرتا رہتا ہے۔

لکشمی :بولو تو میں بناتی ہوں چائے۔

چمپا :(جلدی سے) نہیں، تم تو دو دن کے لیے آئی ہو، تمھیں کیوں تکلیف دوں؟

لکشمی :اس میں تکلیف کائے کی؟ (لکشمی کام کرنے لگتی ہے۔) یہ برتن اب تک ادھر ہی رہتا ہے؟

چمپا :ہاں۔

لکشمی :(اِدھر اُدھر دیکھتے ہوے) بھگوان کہاں ہے؟

چمپا :بھگوان کا پوچھ رہی ہو؟ کیا مالوم۔

لکشمی :کیا مالوم بولے تو؟ تمھیں نہیں مالوم؟ میں ادھر دو فوٹو رکھ کے گئی تھی...

چمپا :ہوں گے اِدھر ہی کدھر۔

لکشمی :(فکر مند لہجے میں) کیا مالوم کدھر گئے؟ یہ ابھی تک پوجا کرتے ہیں نا؟

چمپا :کون، سکھارام؟ اُسے تو ایک ہی پوجا مالوم۔

Scanned with CamScanner

لکشمی :میں جب تک تھی، روز بغیر بھولے نہا کر بھگوان کو ہار پھول چڑھایا کرتے تھے... تم دیو پوجا کرتی ہو کہ نہیں؟

چمپا :دیو بھگوان کا میں کچھ بھی نہیں کرتی۔

لکشمی :ایسا کیسے؟ سب تو وہی کرتا ہے...

چمپا :میرا تو اس نے کچھ بھی اچھا نہیں کیا۔ لے چائے پی۔ (اس کے سامنے چائے رکھتی ہے۔) کیا دیکھ رہی ہے؟

لکشمی :(چائے کی پیالی کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہتی ہے) دیکھا؟ کس نے کہا تھا تمھیں غلط جگہ پر گرنے کو؟ کس نے کہا تھا؟ اور اب جب ناک منھ میں پانی گیا تو تڑپ رہی ہو، کیوں؟ بے شرم کہیں کی! (ہنستے ہوئے دھیرے سے انگلی سے چائے میں گری چیونٹی کو باہر نکالتی ہے۔) اتنا سا پیٹ اور ساری چائے پینے نکلی ہے! اب ٹھہرو، بھاگو مت، تمھیں پونچھتی ہوں۔ (پلو سے اسے اٹھاتی ہے۔) اب چائے میں نہیں گرو گی نا؟ جاؤ اب بھاگو۔

(اسے چھوڑ دیتی ہے۔ چمپا چائے پینا بھول کر لکشمی کو حیرت سے دیکھ رہی ہے۔)

میں جب یہاں تھی نا، اس وقت بھی ایسا ہی ایک چیونٹا تھا، بڑا ایٹ باز۔ میں اسے راجا کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ اسے مجھ سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔ اور ایک کوا بھی تھا... (باہر کوے کی کائیں کائیں۔ لکشمی چونکتی ہے۔) وہ دیکھو... وہی ہو گا!

(تیزی سے کھڑکی کے پاس جا کر، باہر دیکھنے لگتی ہے اور چکرا کر گرنے لگتی ہے۔ چمپا اسے سہارا دے کر بٹھاتی ہے۔)

چمپا :پہلے چائے پیو۔ کوا کہیں بھاگنے والا نہیں ہے۔ تمھارے پیٹ میں کب سے کچھ نہیں گیا ہے؟ (لکشمی کو اپنے قریب بٹھاتی ہے۔) یہ بٹر بسکٹ لو... (دیتی ہے۔) چائے کے ساتھ کھانا۔ یہاں کتنے دن رہے گی؟

لکشمی :کون؟ میں؟ میں بھلا اور کدھر جاؤں گی؟ بھتیجے نے اپنے گھر کا دروازہ مجھ پر بند کر دیا ہے۔ شوہر نے تو پہلے سے بند کیا ہوا ہے...

چمپا :شوہر نے کیوں باہر نکالا؟

لکشمی :بچہ نہیں تھا۔

چمپا :پھر تمھارے بعد ہوا؟

لکشمی :کیا مالوم؟ اُدھر کی پھر کوئی خبر نہیں ملی... تم، تمھارے ساتھ کیا ہوا؟

چمپا :میرا مرد پونے آٹھ تھا... اوپر سے ستاتا بھی بہت تھا۔ آخر ایک دن سر گھوم گیا اور میں ہی گھر سے نکل گئی۔ ایسا شوہر کائے کے واسطے چاہیے؟

لکشمی :اب وہ کدھر رہتا ہے؟

چمپا :کیا مالوم زندہ بھی ہے کہ مر گیا...

لکشمی :(منع کرتے ہوے) ایسا نہیں بولتے...

چمپا :پھر اس ہلکٹ کو کیا بولوں؟

لکشمی :کچھ بھی ہو، دیو برہمن کے سامنے اپنی گانٹھ اس مرد کے ساتھ باندھی ہوتی ہے۔

چمپا :مگر یہ نرک کا جیون جینے کو دیو برہمن تو نہیں آتے ہمارے ساتھ۔

لکشمی :وہ تو سب کے نصیب کا لکھا ہوتا ہے۔

چمپا :کیا اسی لیے کسی مُردار کے مافک یہ سب کچھ سہنے کا؟ میں نے بہت سہن کیا... جب پانی سر کے اوپر ہوا تو لات مار کر گھر چھوڑ باہر نکل آئی۔ یہ تیرا سکھارام اِدھر لے آیا۔

لکشمی :میرا کائے کا... اب تو وہ تمھارا ہے۔

چمپا :سنو، میں میری اپنی ہوں۔ ہوں تو سب ہیں، نہیں تو میرا کوئی نہیں ہے...

(خاموشی۔)

لکشمی :تمھارا اِدھر کیسا چل رہا ہے؟

چمپا :چلنے کو کیا ہے؟ دارو پیو تو کسی کا بھی چلتا ہے۔ کھانے کو جتنا دیتا ہے، اتنا سب وصول کرتا ہے تیرا سکھارام۔ میں ہی ہوں جو چلا رہی ہوں... آخر کیا کروں گی؟ واپس باہر جاؤں تو چار جانور اور ملیں گے۔ اس سے یہ اکیلا اچھا۔

لکشمی :پھر میں ہمیشہ کے لیے اِدھر رہ جاؤں تو تمھیں چلے گا؟

چمپا :(لمحہ بھر سوچ کر) مجھے باہر مت نکالنا... مطلب، اگر ایسا کرنے گئی، تو پھر میں

Scanned with CamScanner

بہت بری عورت ہوں، پہلے ہی بول دیتی ہوں۔

لکشمی : ایسا کیسے کروں گی میں؟ میری کوئی مانگ وانگ نہیں ہے۔اب پہلے جیسا وہ کچھ جمے گا بھی نہیں۔بس اب سر پر ایک چھپر چاہیے۔تم جیسے کہوگی ویسے رہوں گی، سارا کام بھی کروں گی۔

چمپا : (کچھ سوچ کر) ٹھیک ہے، تو گھر سنبھال، میں اُسے دیکھوں گی۔دونوں کام یوں بھی مجھے ایک ساتھ نہیں جمتے۔تو بھی جی اور میں بھی جی لوں گی۔

لکشمی : (شکر ادا کرتے ہوئے) ہاں، میں سچ مچ تکلیف نہیں دوں گی، الٹا کام میں مدد کروں گی۔ میں ایسی دِکھتی ہوں، مگر کام اب بھی بہت کر سکتی ہوں۔اور پھر کھانا بھی کم کھاتی ہوں، ایک وقت کا بچا ہوا کھانا اور تھوڑی دال میرے واسطے کافی ہے۔میری کوئی مانگ نہیں ہوگی۔اوپر سے میں اُپواس وغیرہ بھی رکھتی ہوں۔ایک انگ پر اور دوسری گھر کی کھونٹی پر لٹکی ہوئی، ایسی دو ساڑیاں میرے لیے کافی ہیں، اور ضروری نہیں کہ وہ نئی ہوں، تمھاری پرانی بھی چل جائیں گی۔

(باہر سکھارام آتا ہے، چپل اتارتا ہے۔کسی وجہ سے وہ خفا دکھائی دے رہا ہے۔)

سکھارام :میں آگیا ہوں۔

(چمپا اندر لکشمی کو اشارہ کرتی ہے۔سکھارام جیکٹ، ٹوپی اتارتا ہے۔)

سکھارام : (غصے سے) مزدوری تو اتنی ہی دیں گے، مگر کام زیادہ چاہتے ہیں سالے۔کون کرے گا؟ تم کیا ہمارے باپ ہو؟ کہ خرید لیا ہے ہمیں؟ ہم بھی دکھائیں گے تمھیں...

(پاؤں دھونے کے لیے پانی لے کر لکشمی باہر کے دروازے میں کھڑی ہے۔سکھارام اپنے آپ میں کھویا ہوا ہے۔اچانک لکشمی کو دیکھ کر سخت انداز میں کھڑا ہو جاتا ہے۔لکشمی گھبرا کر کانپنے لگتی ہے۔)

تو؟ تو کیسے آئی؟ کس نے لیا تجھے گھر میں؟

لکشمی : (کوشش کر کے) بھتیجے نے مجھے گھر سے ہنکال دیا، ادھر آگئی۔میرا اور کوئی نہیں ہے... ان لوگوں نے مجھ پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔

سکھارام :مگر تو اِدھر کیوں آئی؟

لکشمی :میں اور کدھر جاتی؟ میرا اور کون ہے؟

سکھارام :ارے تیرے واسطے دنیا پڑی تھی... میں نے کہا تھا نا، تیرا میرا سمبندھ اب ختم ہو گیا ہے۔

لکشمی :روز یاد آتی تھی... ایک دن بھی ایسا نہیں تھا کہ مجھے یہاں کی یاد نہ آئی ہو۔

سکھارام :لیکن مجھے تیری یاد ذرا بھی نہیں آئی۔ یہاں سے جو گئی، میرے واسطے ختم ہو گئی، مرگئی۔ بعد میں کوئی سمبندھ نہیں۔ یہاں کا یہ قاعدہ ہے اور آج چودہ سال سے یہ چل رہا ہے، کیا تمھیں یہ مالوم نہیں تھا؟ پہلی بار جب یہاں لایا تھا، میں نے سب کچھ بتا دیا تھا، پھر؟

لکشمی :وہ گھر میرے لیے ختم ہو گیا، پھر کدھر جاتی؟ دوسرا کوئی سہارا نہیں تھا، اس لیے یہاں چلی آئی۔

سکھارام :سہارا نہیں تھا تو جان دے دینے کا تھا۔ میرا تمھارا اب کیا سمبندھ؟ تمھارے مرنے جینے کی ذمے داری میں نے لی ہے کیا؟

لکشمی :(کسی طرح) بھگوان...

سکھارام :(سخت لہجے میں) کیا؟ خبردار جو دوبارہ ایسے بولا تو۔ گلا دبا دوں گا۔ ہمارا سمبندھ ضرورت کا تھا، بس۔ تمھارا اب یہاں کوئی کام نہیں۔ تمھیں گھر میں کس نے لیا؟ ابھی باہر ہو جا۔ چلتی بن یہاں سے...

(لکشمی کانپ رہی ہے۔ چمپا دروازے میں کھڑی بال بناتے ہوئے ان دونوں کو بغیر کسی تاثر کے دیکھ رہی ہے۔ لکشمی اپنے ہاتھ میں دھری پانی کی بالٹی اور لوٹا ایک طرف رکھ کر سکھارام کے پاؤں پکڑ لیتی ہے۔)

لکشمی :مجھے باہر مت نکالو، میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ مجھے کون پوچھے گا؟ میں کہاں جاؤں گی؟ میں سب کام کروں گی، مجھے کچھ نہیں چاہیے، صرف سر پر چھپر چاہیے، اور مرتے وقت میرا سر تمھاری گود میں ہونا...

سکھارام :(اسے پرے جھٹکتے ہوئے) چل ہٹ... فوراً گھر سے نکل جا، نہیں تو تیرا سر توڑ دوں گا۔ ابھی باہر نکل...

(لکشمی سکھارام کے پاؤں مضبوطی سے پکڑتی ہے۔ وہ اسے گالیاں دے رہا ہے۔ چمپا یہ

Scanned with CamScanner

سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔اب سکھارام غصے میں لکشمی کو مارنے لگتا ہے۔)

چمپا :ارے کتنا مارو گے؟ایسے اس کی جان جائے گی...

سکھارام :چلی جائے تو اچھا ہے... مگر سالی کو گھر میں رہنے نہیں دوں گا۔(اور مارنے لگتا ہے۔)

چمپا :اور تمھارے ہاتھ سے خون ہو گیا تو پھر میرا کیا ہوگا؟

سکھارام :تمھارے واسطے تمھارا شوہر ہے نا۔

چمپا :جس کا شوہر ہوگا وہ یہاں کیوں آئے گی؟

سکھارام :(غصے میں غیر انسانی طور پر لکشمی کو مارنے لگتا ہے۔)ہوں، بے حس، کتی، جل سالی...

چمپا :(لکشمی کو بچانے کے لیے درمیان میں کھڑی ہو جاتی ہے۔) مجھے مار، مجھے...

(سکھارام بے قابو سا کھڑا ہے۔چمپا لکشمی کے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹاتی ہے۔)

دیکھوں، آنکھ جاتے جاتے بچ گئی... پیٹ میں تو نہیں لگی نا؟ پیٹ کے نیچے؟ چل اندر چل...

سکھارام :اندر نہیں، باہر!

(چمپا لکشمی کو اندر لے جانے لگتی ہے۔)

میں کہہ رہا ہوں اسے ابھی باہر نکال...

چمپا :تو چل، اُدھر مت دیکھ۔

(چمپا لکشمی کو اندر لے جاتی ہے۔سکھارام بے چین سا کھڑا ہے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیا کرے۔)

سکھارام :چمپے! میں کہہ رہا ہوں، اسے باہر نکال...

(چمپا لکشمی کو اندر لے جا کر بٹھاتی ہے۔)

چمپا :جدھر مار لگی اُدھر جل رہا ہے کیا؟ بہت تکلیف ہو رہی ہے؟ بیٹھ۔یہیں بیٹھ، اٹھ مت۔

(باہر آ کر لکشمی کی رکھی ہوئی بالٹی اور لوٹا اٹھا کر سکھارام سے مخاطب ہوتی ہے۔)

Scanned with CamScanner

چمپا :چل تیرے پاؤں پر پانی ڈالتی ہوں۔

(سکھارام بیزار کھڑا ہے۔)

سکھارام :پہلے وہ ادھر سے باہر جانی چاہیے۔(چمپا خاموش۔) چمپے... سنا تونے؟ اسے ابھی یہاں سے باہر نکال...

چمپا :مگر میں کون ہوتی ہوں اسے باہر نکالنے والی؟ گھر تمھارا ہے، تم چاہو تو نکالو۔ کیا اسے میں یہاں پر لائی تھی؟

سکھارام :پھر تو ہمارے بیچ میں کیوں آئی؟

چمپا :کیوں آئی بولے تو؟ تم خون کر کے پتھر توڑنے کو اندر ہو جاؤ گے، اور مجھے پیٹ کا گڈھا بھرنے کو روز ایک نیا گراہک دھندے پر ڈھونڈنا پڑے گا۔ روز دس جانوروں کے منھ لگنے سے اچھا ہے، تو ہی کر تیرے کو جو کرنا ہے... سمجھ میں آیا؟ چل اب پاؤں دھولے، چائے تیار ہے۔

سکھارام :اس کو بول پہلے گھر کے باہر ہو۔ میرا اس کا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔

چمپا :مگر تجھے اس کی تکلیف کیا ہے؟ مجھے گھر میں کام کے واسطے ایک عورت مل جائے گی، مجھ سے اب تیری تکلیف اور گھر کا کام نہیں ہوتا۔ وہ گھر دیکھے گی، آسی باسی دو نوالے کھالے گی، میرے پرانے کپڑے پہن لے گی، اس میں تجھے کیا تکلیف ہونے والی ہے؟ اور اسے اب اس سے کچھ لینا دینا بھی نہیں ہے۔

سکھارام :مجھے دو لوگوں کو نہیں پوسنا ہے۔

چمپا :اچھا؟ تو پھر میں جاتی ہوں۔

سکھارام :نہیں اسے نکال... وہ جانی چاہیے۔ نالائق، سالی میری گود میں سر رکھ کر مرنا چاہتی ہے... (چلّاتا ہے) لکشمی! ابھی میرے گھر سے نکل، چلتی بن... یہاں تیرا کوئی کام نہیں۔

(لکشمی خوف کے مارے کانپ رہی ہے۔)

چمپا :تو اب پاؤں دھونے کو آرہا ہے کہ میں اندر جاؤں؟

(سکھارام بے دلی سے پاؤں دھونے کے لیے چمپا کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ لکشمی دیوار کا سہارا لیے کانپ رہی ہے۔ باہر کوے کی کائیں کائیں۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں پر کھڑی

Scanned with CamScanner

لکشمی بے چینی سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ سکھارام ہاتھ منھ پونچھتا ہوا آتا ہے۔ چمپا بالٹی اور لوٹا لے کر رسوئی میں آتی ہے۔ کھڑکی سے باہر جھانکتی لکشمی کی جانب ایک نظر ڈال کر بالٹی لوٹا رکھنے کو موری کی طرف جاتی ہے۔)

لکشمی :(باہر ہی دیکھتے ہوے) دوبارہ نہیں چلاّیا...

چمپا :کون؟ وہ کوا؟ تیرا سکھارام؟

لکشمی :(جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں) دوپہر میں وہ ایسا ہی چلاّیا تھا... وہ ضرور وہیں ہوگا...

(چمپا چائے انڈیل کر باہر لے جاتی ہے۔ سکھارام بیٹھا ہے۔)

سکھارام :(چمپا کے ہاتھ سے چائے لے کر) وہ گئی یا نہیں؟

چمپا :(تھوڑا ٹھہر کر) نہیں۔

سکھارام :(ہاتھ سے پیالی نیچے رکھ کر) نہیں؟ کیوں نہیں گئی؟

چمپا :تو چائے پی۔

سکھارام :تو بھی اب چڑھتی جا رہی ہے۔

چمپا :تو کیا تو میرے کو مارنے والا ہے؟

سکھارام :وقت آئے گا تو ماروں گا، چپ تھوڑے ہی رہوں گا۔

چمپا :وقت آئے گا تو دیکھیں گے۔ ابھی چائے پی، ٹھنڈی ہو جائے گی۔

سکھارام :میں اسے اس گھر میں رہنے نہیں دوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، ہاں...

(چمپا چائے کا کپ اٹھا کر اس کے منھ کے پاس لے جاتی ہے۔ وہ کپ ہاتھ میں لے کر چائے پینے لگتا ہے۔)

ایک بار ختم ہو گیا، مطلب ختم... وہ دوبارہ اِدھر آئی ہی کیوں؟ میں کیا اس کا شوہر ہوں؟

(اندر لکشمی گھر کے کام میں لگ گئی ہے، تھوڑا لنگڑا رہی ہے۔)

چمپا :دو دن رہنے دو۔ پھر اسے جانے کے لیے کہوں گی... مگر وہ جائے گی بھی کدھر؟

سکھارام :تو میں نے اس کی زندگی بھر کی جواب داری لی ہے کیا؟ چھپے، تو اسے کل ہی جانے کو

Scanned with CamScanner

بول دے۔ کل صبح وہ جانی چاہیے، کل اس کا تھوبڑا ادھر دکھنا ئیں منگتا۔ بے حس سالی، گود میں سر رکھ کر مرنے کی باتیں کرتی ہے۔

(سکھارام ناراض ہے۔ چائے پینے کے بعد چمپا اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر اندر چلی جاتی ہے۔ کام میں مصروف لکشمی اس کے آنے پر کام سے اچانک الگ ہو جاتی ہے۔)

لکشمی :(کسی طرح) کیا ہوا؟

چمپا :تو کام کر... ویسے بھی تیرا کیا ہونے والا ہے؟ اور کوئی کیا کرنے والا ہے؟ مگر ایک بات دھیان سے سن۔ اِدھر رہنے کا، مگر منہ سے کچھ بولنے کا نئیں۔

(باہر سکھارام اب بھی بے چین ہے، چکر کاٹ رہا ہے۔ کونے میں جا کر وہاں رکھی شراب کی بوتل نکال کر شراب پینے لگتا ہے۔ پھر جانے کس خیال کے آنے پر مردنگ نکال کر اس پر جمی گرد جھاڑنے لگتا ہے۔ بیٹھک پر مردنگ سجاتا ہے اور بجانے لگتا ہے۔ اب لکشمی پر پھر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ مردنگ بجانے میں کھو جاتا ہے۔ رسوئی میں دونوں عورتیں کام کر رہی ہیں۔ داؤد آتا ہے۔ سکھارام مردنگ بجانے میں مگن ہے۔)

سکھارام :(دھیان جانے پر) کون؟ بڑے دنوں کے بعد آئے...

داؤد :بس یوں ہی، مردنگ سنا، لگا وہ پرانے دن واپس آ گئے سکھارام۔

سکھارام :کون سے پرانے دن؟

داؤد :جب وہ پنچھی تھا... وہ... لکشمی۔

(سکھارام کا ہاتھ مردنگ سے ہٹ جاتا ہے۔ لکشمی داؤد کی آواز سن کر دروازے میں آ جاتی ہے۔)

لکشمی :(بے قابو ہو کر) داؤد بھائی...

داؤد :(خوشی سے) ارے... سچ؟ (سکھارام سے مخاطب ہو کر) کیوں سکھارام؟ ایک سے دو پنچھی ہو گئے کیا؟ کہ چمپا گئی؟

سکھارام :(تلخ لہجے میں) چپ رہ، یا پھر یہاں سے چلتا بن۔ بات چیت بالکل بند۔

Scanned with CamScanner

(مردنگ بجانے لگتا ہے۔ داؤد سننے لگتا ہے۔ لکشمی دروازے میں کھڑی ہے۔ چمپا رسوئی میں خاموشی سے کام کر رہی ہے۔)

چمپا :اب کام کرے گی یا وہیں کھڑی رہے گی گوری دیوی کے مافک؟

(ڈر کے مارے لکشمی دوبارہ کام میں جٹ جاتی ہے۔ مردنگ بجاتا سکھارام۔ بازو میں کھڑا داؤد۔ اندھیرا۔)

دوسرا منظر

(رسوئی میں دھیمی روشنی۔ آدھی رات۔ دور کہیں مرغ بانگ دے رہا ہے۔ لکشمی کا سایہ پھیلا ہے۔ دھیمی آواز میں تالیاں بجا کر منھ سے "سیتارام، سیتارام" کا جاپ کیے جا رہی ہے۔ ہوتے ہوتے یہ آواز بڑھتی جاتی ہے۔ باہر کے کمرے سے، اندھیرے میں صرف سکھارام کی آواز۔)

سکھارام :اے، یہ کیا ہو رہا ہے؟ بند کر یہ سب... ابھی رات بہت باقی ہے...

(لکشمی کی آواز پھر دھیمی ہو جاتی ہے، مگر جاپ جاری رہتا ہے۔)

سکھارام :اے، بند کر کہتا ہوں... نہیں تو جان لے لوں گا... کھٹ کھٹ سالی!

(اب آواز تو نہیں مگر اسی سر اور تال میں لکشمی تالیاں ویسے ہی بغیر آواز کے بجانے کی اداکاری کر رہی ہے۔)

اب بتی بجھا کر سو جا، نہیں تو اتنا ماروں گا کہ خون کی الٹی ہوگی، سمجھی؟ زبان کھینچ لوں گا...

(لکشمی کی تالیاں اور جے سیتارام کا جاپ بند ہو جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر بتی بجھاتی ہے۔ خاموشی پھیلی ہے۔ کیڑوں کے کلبلانے کی آواز۔ سکھارام بستر میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔)

اس کی ماں کا... اس کی ماں کا...

(پھر گر کر سو جاتا ہے۔ نشے میں ڈوبی چمپا کی نیند میں کچھ سمجھ میں نہ آنے والی گفتگو۔ رسوئی میں لکشمی بدن سمیٹے سوتی ہے، پھر اٹھ کر بستر میں بیٹھ جاتی ہے۔)

لکشمی :(بے قابو ہو کر، مگر بالکل دھیمی آواز میں) سیتارام... سیتارام...

(اندھیرے میں کھڑکی کے باہر سے آنے والی دھیمی روشنی کے سبب، جہاں وہ بیٹھی ہے وہاں سے اس کا خوفناک دکھائی دینے والا سایہ۔ اندھیرا۔)

تیسرا منظر

(روشنی ہوتی ہے، دوپہر۔ کوے کی کائیں کائیں۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ کچھ دیر یوں ہی خاموشی۔ بعد میں باہر کے دروازے کی کنڈی تیزی سے کھلتی ہے۔ دروازہ کھول کر لکشمی اندر آتی ہے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی ہے، چہرے پر کوئی بھیانک حادثہ ہوگزرنے کے آثار، ڈگمگاتے قدموں سے رسوئی میں جاتی ہے۔ واپس آکر کسی طرح باہر کے دروازے کی کنڈی اندر سے بند کر دیتی ہے۔ رسوئی میں لوٹ کر بھگوان کی سجائی ہوئی مورتی کے پاس آکھڑی ہوتی ہے، پھر بیٹھ جاتی ہے، سانسیں تیز چل رہی ہیں، گویا جان نکلنے کو ہے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہے۔)

لکشمی : (تیز سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے، بھگوان سے مخاطب ہوکر) تجھے... تجھے مالوم ہے؟ بھیانک... بڑا بھیانک! ماں، یہ کیا ہے؟ اسے کیا کہوں؟ میں کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بھیانک... سیتارام، سیتارام... (سانس لینے کے لیے رکتی ہے۔) مجھے پیچھے سے جانا ہی نہیں چاہیے تھا، مگر نہیں رہا گیا مجھ سے، کیا کروں؟ (اپنے منھ پر طمانچے مارتی ہے۔) کیوں گئی میں؟ کیوں گئی، بتاؤں؟ مجھے ہفتے بھر سے شک ہورہا تھا کہ یہ روز دوپہر میں آخر کہاں جاتی ہے؟ اُن کے واسطے گئی تھی میں۔ ملا ہوا سہاگ تو راس نہیں آیا، دل سے اسی کو سوبھاگیہ مان لیا ہے، پتی سمجھ کر پوجا ہے، یہاں سے جانے پر بھی، اُن کی پوجا دل سے کرتی تھی... (چولی میں چھپا منگل سوتر بھگوان کو دکھاتے ہوئے) یہ دیکھو، یہ میں نے اُن کے نام کا باندھا ہے، میں ان کی ہوں، لات ماریں تو بھی کھالوں گی، مگر مروں گی تو انھیں کی گود میں سر رکھ کر۔ اُن کے ساتھ بھلا اِس کا یہ برتاؤ؟ اُن کے پیٹھ پیچھے ایسے؟ چھی چھی چھی... سہا نہیں جاتا۔ یہ دیکھنے سے پہلے موت آجاتی تو اچھا تھا۔ کیسا پاپ ہے! کہاں جائے گی یہ؟ ضرور نرک میں جائے گی۔ اِس کا تو ٹھیک ہے، مگر اُن کا کیا؟ اِس کے ساتھ وہ بھی؟ گھر میں دونوں شراب پیتے ہیں... ماں، سہا نہیں جاتا۔ نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات... میں

جب تھی تب ایسا نہیں تھا۔ میں تو اتنا سب کچھ ہونے بھی نہیں دیتی تھی... اور اب کیا کروں؟ اس مالملے کے بارے میں انھیں کچھ مالوم بھی نہیں۔ چھی چھی... سوچ کر الٹی آتی ہے...

(منھ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ باہر دروازے پر دستک۔)

لکشمی :(خوفزدہ ہوکر) آگئی شاید۔ اب کیا کروں؟ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے...

(جلدی سے بھگوان کی تصویر کے سامنے ماتھا رگڑتی ہے۔ باہر کے کمرے میں جاکر دروازہ کھول کر اندر آنے لگتی ہے۔ چمپا کا شوہر فوجدار شندے اندر آتا ہے، تھکا ماندہ، ننگے پاؤں۔)

شخص :چمپا... اے چمپا... (آواز سن کر لکشمی وہیں ٹھہر جاتی ہے۔) چمپا، میں آیا ہوں۔ مجھے مارو چمپا... آج میں مرنے کے لیے آیا ہوں، یہاں سے زندہ جانا نہیں چاہتا۔ چمپا، آج میں تمھارے ہاتھوں سے مروں گا... بس آج میں مر جاؤں گا۔ (لکشمی کو دیکھ کر) آں... تم چمپا نہیں ہو؟ تم کوئی اور ہو۔ پھر چمپا کدھر گئی؟ کدھر گئی چمپا؟... چمپا...

(آنکھیں بند کر کے لڑھکتا ہوا نیچے بیٹھ جاتا ہے۔)

لکشمی :(اسے دیکھ کر خوفزدہ سی) تم کون؟ کون ہو تم؟ (تیزی سے اندر جا کر اس کے لیے پانی لے آتی ہے۔) لو، پہلے پانی پیو۔ (چمپا کا شوہر بھی تیزی سے پانی پیتا ہے۔) تم چمپا کے کون ہو؟

شخص :چمپی کا شوہر... ہاں اصلی، شادی والا... (لکشمی تھرا جاتی ہے۔) چمپا کہاں ہے؟ مجھے وہ چاہیے... مجھے اس کی مار کھانا ہے... اس کے ہاتھوں سے مرنے کے لیے آیا ہوں... چمپا، مجھے مار... مجھے مارنا، چمپا!

لکشمی :وہ گھر میں نہیں ہے۔ تم کدھر سے آئے ہو؟ (چمپا کا شوہر ہاتھ کے اشارے سے ''کسے پتا!'' کا اظہار کرتا ہے۔) کہاں رہتے ہو؟

شخص :راستے پر... گٹر میں... شمشان میں... (ڈھونگی آواز) کہیں بھی!

لکشمی :(اس کے قریب جا کر) ایسے مت رو۔ مرد آدمی کا ایسا رونا اچھا نہیں۔ کیا ہوا؟ بخار ہے کیا؟ (اس کے جسم کو ہاتھ لگا کر ہٹا لیتی ہے۔) نہیں... پھر تمھیں بھوک لگی ہے؟ ٹھہرو، میں کچھ لے آتی ہوں۔

Scanned with CamScanner

(رسوئی میں جا کر جلدی سے ایک پیالی میں کچھ لے آتی ہے۔اس درمیان چمپا کے شوہر نے اپنی جیب سے بوتل نکال کر دو گھونٹ چڑھا کر بوتل دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لی ہے۔)

لکشمی :لو، یہ کھاؤ... (چمپا کا شوہر یوں ہی خاموش ہے۔) تمھارا منھ خراب ہو گیا ہے، دیکھو... (اپنا پلو ہاتھ میں لے کر اس کا منھ صاف کرنے کا ارادہ کرتی ہے، پھر ارادہ ترک کر کے اندر جا کر ایک گیلا کپڑا لے آتی ہے۔) اس سے منھ پونچھو، کلّی بھی کرو... (وہ یوں ہی بیٹھا ہے۔) ہائے، تمھارے پیٹ میں کچھ بھی نہیں ہے... (اس کا چہرہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے صاف کرتی ہے۔) تم آدمی ہو یا کچھ اور؟ اب کھاؤ سیدھے بیٹھ کر۔ (چمپا کا شوہر جوں کا توں بیٹھا ہے۔) کھانے کی طاقت بھی نہیں ہے؟ لو... (خود کھلانے لگتی ہے۔) ہاں ہاں، لو، پیٹ میں دو دانے جائیں گے تو اچھا لگے گا۔ دارو پینا اچھا نہیں۔ ہوتا کیا ہے اس میں؟ وہ گندا سڑا ہوا، چھی...

شخص :پانی...

لکشمی :پانی؟ لے آتی ہوں۔

(اندر جاتی ہے۔ چمپا کا شوہر پھر جیب سے بوتل نکال کر دو گھونٹ چڑھاتا ہے اور بوتل جیب میں رکھ لیتا ہے۔ لکشمی پانی لے کر باہر آتی ہے۔)

لکشمی :لو، پیو۔ (اسے پانی پلاتی ہے۔) اب بھی تم میں طاقت نہیں آ رہی ہے۔ یہ تم نے اپنی جان کا کیا کر لیا ہے؟ اسے تو کچھ نہیں، مگر تمھیں؟ (اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) اتنی یہ مار کہاں لگ گئی؟

شخص :اس نے مارا ہے۔

لکشمی :کس نے، چمپا نے؟ (چمپا کا شوہر "ہاں" میں گردن ہلاتا ہے۔) پہلے اِدھر آئے تھے تم؟ (چمپا کا شوہر "ہاں" میں گردن ہلاتا ہے۔) تمھیں اس نے مار کر باہر نکالا تھا؟ یہ عورت ہے کہ مذاق؟ اور تم نے مار کھائی؟ مرد ہو نا تم؟

شخص :مجھے اور مار چاہیے... مجھے اس کے ہاتھوں سے مرنا ہے، زندہ نہیں رہنا... اب کیا بچا ہے جینے کے لیے؟ نوکری گئی، بیوی گئی، گھر گیا، اب کیا بچا ہے؟ (رونے لگتا ہے۔)

لکشمی :چپ رہو، کوئی سنے گا... (ان کے منھ پر ہاتھ دھر دیتی ہے۔) وہ آ جائے گی۔ کدھر

گئی کیا مالوم؟ (کچھ سوچ کر) مگر نہیں، جانے دو... تم کو اور تکلیف پہنچے گی۔ اب تم ادھر سے جاؤ، اس کے آنے سے پہلے چلے جاؤ۔ وہ آئے گی تو پھر تمھیں مارے گی۔ نہ اسے کسی سے ہمدردی ہے اور نہ ہی لاج شرم۔ (چمپا کے شوہر کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، وہ بیٹھا ہے۔) اب جاؤ تو... (وہ یوں ہی بیٹھا ہے۔) وہ آئی تو ہنگامہ کرے گی، اب تم اٹھو... (اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرتی ہے، وہ جان بوجھ کر اس پر اپنا سارا وزن ڈال کر کسی طرح کھڑا ہوتا ہے۔) جاؤ، پھر چاہو تو بعد میں آنا، مگر جب وہ نہ رہے تب آنا۔ میں تمھیں کھانا دوں گی، مگر وہ جب نہ ہو، تبھی آنا، ابھی جاؤ... (اسے دھکا دے کر گھر سے باہر نکالتی ہے، اور اس کے جانے کے بعد تنہائی میں) پاپن کہیں کی، کبھی بھلا نہیں ہوگا اس کا۔ شوہر کو چھوڑا، پھر دوسرا پکڑا، اب اسے بھی دھوکا دے کر تیسرے کے ساتھ برا کام... چھی چھی چھی... اور پھر شوہر پہ ہاتھ اٹھانے کا؟ (اندر کے کمرے میں تیزی سے بھگوان کی تصویروں کے سامنے جا کر) دیکھ رہے ہو نا تم؟ (آنکھیں بند کر کے) سیتارام... سیتارام... سیتارام...

(اندھیرا۔)

چوتھا منظر

(روشنی ہوتی ہے۔ شام۔ لکشمی پانی کا ایک گھڑا سر پر اور ایک کمر پر رکھے داخل ہوتی ہے، کسی طرح کمر کا گھڑا نیچے رکھتی ہے، سر پر رکھا گھڑا ابھی اتارتی ہے۔ جسمانی حرکات سے اس بات کا اظہار کہ اب اس سے یہ کام نہیں ہو پاتا۔ ڈھلی ہوئی صحت۔ چمپا اسے ایک نظر دیکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ پانی کے گھڑے رکھ کر لکشمی دوسرے کسی کام میں لگ جاتی ہے۔)

چمپا :(لکشمی کی جانب نہ دیکھتے ہوئے) دوپہر کے بعد ادھر کون آیا تھا؟

لکشمی :(یہ سوال سن کر سہم جاتی ہے۔) کک... کون؟

چمپا :میرے کو کیا مالوم؟ گھر میں کون تھا... تُو کہ میں؟

لکشمی :(جواب ٹالتے ہوئے) کون آیا تھا؟

چمپا :میرا شوہر۔ کتنی بار آیا تھا ادھر؟

Scanned with CamScanner

لکشمی :(گھبرائی ہوئی) شوہر؟

چمپا :دیکھ تیرے کو جھوٹ بولنے کو جے گا ئیں، جو سچ ہے وہ میرے کو بول دے، جلدی بول۔

لکشمی :تین بار۔

چمپا :گھر میں کیوں لیا اسے؟

لکشمی :(کسی طرح) وہ، اسے ٹھیک نہیں تھا، بیمار تھا۔ پھر مجھے کیا مالوم وہ کون ہے؟ وہ خود آتا تھا، اسے باہر کیسے کر سکتی تھی؟

چمپا :مگر وہ میرے آنے سے پہلے کیسے جاتا تھا؟

لکشمی :وہ خود چلے جاتے تھے... ہاں وہ خود چلے جاتے تھے...

چمپا :وہ آتا ہے، یہ بات تو نے میرے کو بتائی کیوں نہیں؟

لکشمی :میں نے؟ (بہت گھبرائی ہوئی) میں نے سوچا، کہوں یا نہ کہوں؟ مطلب...

چمپا :(اس کے روبرو کھڑے ہو کر، کمر پر ہاتھ رکھے) ادھر دیکھ، میرے ساتھ چار سو بیسی مت کر، کہہ دیتی ہوں... (لکشمی کو کچھ کہنا ہے، مگر کہہ نہیں پاتی۔) سیدھے سے رہتا ہے تو ادھر رہ سکے گی۔ تجھ کو میں نے رکھا ہے اس لیے اِدھر رہنے کو ملا ہے، یہ بات یاد ہے نا؟ واپس اس مُردار کو اس گھر میں پاؤں رکھنے مت دینا، کہتی ہوں۔ نہیں تو میں ہوں اور تو...

(یہ کہہ کر چمپا باہر چلی جاتی ہے۔ لکشمی اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتی ہے اور پھر بھگوان کی تصویر کے قریب جا کر اس سے مخاطب ہوتی ہے۔)

لکشمی :سیتارام... سیتارام... دیکھا؟ دیکھا نا؟ اس نے شوہر کا آنا بند کر دیا، کیونکہ اُسے سہارا مل رہا تھا نا۔ میں اسے سُدھار سکتی تھی۔ غریب ہے بیچارہ۔ یہ، اِس نے اُسے چھوڑا ہے، بھگوان برہمن کے سامنے جو ملا تھا اسے چھوڑ دیا۔ اُسے تو چمپا چاہیے، اسی واسطے تو وہ ادھر آتا ہے، مگر اِسے وہ نہیں چاہیے... یہ چاہتی ہے کہ وہ مر جائے۔ ایسی ویسی نہیں، بڑی پاپن ہے۔ اوپر سے مجھے دھمکا رہی ہے! میرا کیا بگاڑے گی... میں تو پنیہ وان ہوں، میرا سکہ کھوٹا نہیں ہے، میں ہمیشہ دھرم پر رہی ہوں، وہ میرا کیا بگاڑے گی؟ (تھوک نگلتے ہوئے) تم اسے بالکل معاف مت کرنا، میں کہتی ہوں وہ

Scanned with CamScanner

بہت بری ہے...
(اس کے بعد اندھیرا۔)

پانچواں منظر

(روشنی۔ رات۔ رسوئی میں لکشمی اور چمپا۔ لکشمی بھگوان کی تصویر کے سامنے پھٹی کتاب سے کچھ اشلوک پڑھ رہی ہے۔ چمپا چولھے کے پاس سبزی کاٹنے بیٹھی ہے۔ باہر کے کمرے میں سکھارام چلم کے دم مار رہا ہے۔ پاس ہی مردنگ پڑا ہے اور بستر بچھا ہوا ہے۔)

سکھارام : چمپے!

چمپا : (ناپسندیدگی واضح ہے۔) آئی۔

(مگر اپنے کام میں اسی طرح مصروف رہتی ہے۔ لکشمی ایک بار مڑ کر اُدھر دیکھتی ہے، پھر اپنا جاپ جاری رکھتی ہے۔)

سکھارام : چمپے... کیا کر رہی ہے؟

چمپا : کل کے لیے سبزی کاٹ رہی ہوں۔

سکھارام : وہ کام کل کرنا، ابھی سونے چلو۔

(چمپا سبزی کاٹنا جاری رکھتی ہے۔ لکشمی اب آنکھیں بند کر لیتی ہے۔)

سکھارام : (آواز میں درندگی) چمپے!

(اب چمپا سبزی کاٹنا بند کر کے، اٹھ کر پیر پٹختی ہوئی جا کر ہاتھ دھوتی ہے اور پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آتی ہے۔)

سکھارام : وہ بیچ کا دروازہ بند کر، اور بتی بجھا۔

(جان بوجھ کر چمپا تھوڑی دیر کے بعد بستر کی جانب بڑھتی ہے۔ رسوئی میں بیٹھی لکشمی کا دھیان اب باہر لگ گیا ہے۔ سکھارام بستر کی طرف بڑھتا ہے۔ چمپا بیٹھی ہے۔)

سکھارام : چل لیٹ جا۔ (چمپا خاموش بیٹھی ہے۔) میں نے کیا کہا، سنا؟ (چمپا خاموش۔)

بہری ہے کیا؟ (اب وہ چمپا پر زور زبردستی کرتا ہے۔ رسوئی میں لکشمی پر خوف طاری ہے۔)

سکھارام :(تلخ لہجے میں) اے، اندر کی بتی بجھا دے!

(لکشمی جلدی سے بتی بجھا دیتی ہے۔ مکمل اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کچھ آوازیں باہر کے کمرے سے آتی ہیں۔)

چمپا :نہیں نہیں، مجھے نہیں چاہیے... آج مجھے نہیں چاہیے...

سکھارام :چپ چاپ لے لے۔

چمپا :نہیں، دور ہو جا... دور ہٹ ابھی، جا اُدھر، نہیں تو...

سکھارام :تیری ماں کا... دکھاتا ہوں اب تجھے...

چمپا :میرے انگ کو ہاتھ مت لگا! دور ہوتا ہے یا نہیں... دور ہو!

(اب چمپا زور سے چلّانے لگتی ہے۔ ہلکی روشنی میں چمپا کا سایہ بستر سے باہر آیا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ رسوئی میں لکشمی کا سایہ ہے۔ اب سکھارام کا سایہ بھی بستر سے اٹھتا ہے۔)

سکھارام :(چمپا کے سائے کی طرف درندگی سے بڑھتے ہوئے) چل، یہ نخرے کسے دکھاتی ہے سالی؟ راستے پر پڑی تھی، یاد ہے نا؟ میں نے تجھے کھانا دیا، یاد ہے نا؟ چل، ابھی چل...

چمپا :میں چلّا کر پورے گاؤں کو اکٹھا کروں گی، تیرے کو بولتی ہوں... مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے...

سکھارام :ہونے دے... اس گھر میں میری مرضی چلتی ہے، میں یہاں کا راجا ہوں...

چمپا :مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔

سکھارام :وہ سب مجھے نہیں سننے کا! تو گئی جھک مارنے، میں تیرے کو ادھر تیرے چونچلے پورے کرنے نہیں لایا ہوں... چل ابھی، چل...

چمپا :(جھٹک کر) نہیں آؤں گی، جب تک مرد تھا، انگ پر لیا تیرے کو... اب نہیں لوں گی۔

سکھارام :چمپے!

چمپا :ہاں، ہاں، اب برداشت نہیں ہوتا میرے سے... دارو پی کر بھی اب میرے سے

سہن نہیں ہوتا... تیرے کو اب جمتا نہیں ہے... تو چپ چاپ پڑا رہا کر۔ پچھلے کئی دنوں سے تیرے کو اب نہیں جمتا... ادھر رسوئی گھر میں کھٹ سے کچھ بجا تو تو ٹھنڈا پڑ جاتا ہے... بول، کیا یہ جھوٹ ہے؟

سکھارام :چمپے!

چمپا :(زور سے) ارے کیا چمپے چمپے کرتا ہے؟ وہ جب سے آئی ہے، تو مرد نہیں رہا۔ اس نے تیرے کو پونے آٹھ بنا دیا ہے۔ ہاں، ہاں اس سے ڈرتا ہے تو! اس کے سامنے مجھے لینے کی تجھ میں ہمت نہیں ہے... مردہ ہو جاتا ہے تو مردہ، کیڑا بن جاتا ہے تو...

سکھارام :منھ سنبھال کر بات کر چمپے... میں بہت برا آدمی ہوں...

چمپا :جا جا، کس کو دھمکی دے رہا ہے تو؟ اب تو تیرے سے کتا بھی نہیں ڈرے گا۔

سکھارام :تیری ماں کا...

(اسے مارنے کے لیے دوڑتا ہے۔ اندھیرے میں ہاتھا پائی۔ رسوئی میں لکشمی کھڑی ہے۔ باہر کے کمرے میں چمپا ہنگامہ کرنا چاہتی ہے۔ سکھارام اس کا منھ بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سکھارام کی غراہٹ۔ چمپا جانوروں جیسی آوازیں نکال رہی ہے، درد سے بلبلا رہی ہے۔)

سکھارام :پی... پی... اور پی... منھ کھول! تھوک رہی ہے؟ تیری ماں کا... پی... لے چل، پیتی ہے کہ نہیں؟ پی... چل پی...

(پھر خاموشی۔ چمپا کی ایک لمبی سانس۔ سکھارام کی غیر واضح غراہٹ۔ رسوئی کے بند دروازے میں تلملاتی کھڑی لکشمی کا سایہ۔ پھر مکمل اندھیرا۔)

چھٹا منظر

(ہلکی روشنی۔ بستر میں پڑی چمپا۔ باہر کے کمرے میں سکھارام بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، رسوئی کے دروازے کو لگی کنڈی کھولتا ہے۔ اس آواز کو سن کر وہاں سوئی ہوئی لکشمی جھٹ اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور کسی طرح تیزی کے ساتھ بتی جلاتی ہے۔ دروازے میں سکھارام۔

کچھ لمحوں کے لیے دونوں یوں ہی کھڑے رہتے ہیں۔)

سکھارام :(دبی آواز میں) باہر ہو جا... تو ابھی باہر ہو... (لکشمی پر ڈر کے مارے کپکپی طاری ہوتی ہے۔) تیری وجہ سے آج میں پونے آٹھ ٹھہرایا گیا ہوں... بھکارن، تیرے کو دنیا میں کوئی نہیں پوچھتا، اس لیے تو آ کر میرے سر پر بیٹھ گئی ہے... مر کیوں نہیں گئی؟ میں تیرا کیا لگتا ہوں؟ تو اور تیرے بھگوان کا دھرم گڈھے میں بھی چلے جاتے تو مجھے کچھ برا نہ لگتا۔ میں بھگوان کے باپ کا کوئی رشتے دار نہیں ہوں۔ میں برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا مہار کا بچہ ہوں۔ تو ادھر واپس کیوں آئی؟ ابھی کے ابھی تو باہر نکل! اٹھا وہ تصویر، اٹھا وہ سب، وہ تیری گٹھری اٹھا... نہیں تو میں لا کر پہنچاؤں گا تو جہاں پہ بھی ہوگی۔ مگر تو ابھی ادھر سے چلتی بن... میں کیا کہہ رہا ہوں، سن رہی ہے نا تو؟

لکشمی :(کسی طرح ہمت جٹا کر) صبح کو...

سکھارام :نہیں، نہیں، ابھی کے ابھی، اِسی وقت... مجھے میرے حساب سے ہی جینا ہے۔ تو اور تیرا بھگوان... اسے کیا کہوں؟ کیا کہوں بول اسے؟ اٹھاتی ہے وہ تصویر کہ لات ماروں؟

لکشمی :بھگوان کو؟

سکھارام :پھر وہ اب میرے گھر میں کیوں ہے؟ تیرے کو بھکارن بنا کر تیرے پلّو کے نیچے سے میرے گھر میں گھس آیا ہے وہ!

لکشمی :ایسا نہیں بولتے...

سکھارام :جا، میں نہیں ڈرتا اس سے! اپنا من صاف ہے، اپنی سمجھ بوجھ اور مرضی سے، کسی کے ساتھ دھوکا کیے بغیر میں جی رہا ہوں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا، بھگوان سے بھی نہیں۔ تو ابھی اِدھر سے چلتی بن... چل باہر نکل...

لکشمی :(مجبوراً کانپتے ہاتھوں سے اپنا سامان سمیٹنے لگتی ہے۔) صبح کو چلی جاتی (سکھارام کا غصہ دیکھ کر ڈر جاتی ہے۔) اچھا... نہیں نہیں، ابھی چلی جاتی ہوں۔

(سب کچھ سمیٹتی ہے، اس کے قریب آ کر اچانک اس کے قدموں میں جھک جاتی ہے۔)

سکھارام :(پیر جھٹک کر) باہر، باہر ہو...

(لکشمی ملول سی لرز رہی ہے۔ اپنا جسم اور سامان سمیٹے باہر آتی ہے، دروازے کی جانب

Scanned with CamScanner

بڑھتی ہے۔ پیچھے سکھارام ہے۔)

سکھارام :(پھر قدموں میں جھکتی لکشمی کو دیکھ کر پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں، میرا تجھ سے کوئی ناتا نہیں ہے... پیٹ میں ایسی لات ماروں گا کہ خون کی الٹی کرے گی۔

(لکشمی کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولنے لگتی ہے، ٹھہر جاتی ہے، جیسے اس میں ایک طاقت عود کر آتی ہے۔)

لکشمی :میں جا رہی ہوں، مگر ایک بات کہنی ہے...

سکھارام :میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔

لکشمی :میرے نہیں، تمھارے فائدے کی بات ہے...

سکھارام :مجھے نہیں سنی ہے۔

لکشمی :میں رکوں گی نہیں، اپنی بات کہہ کر جلدی سے چلی جاؤں گی، تمھارے فائدے کی بات...

سکھارام :(تھوڑا وقت لے کر) بول، کیا ہے؟

لکشمی :(مدہوش پڑی چمپا کی جانب اشارہ کر کے) وہ... اچھی نہیں ہے، اچھی نہیں ہے وہ...

سکھارام :میں دیکھ لوں گا۔

لکشمی :وہ تمھیں دھوکا دے رہی ہے... دھوکا دے رہی ہے وہ تمھیں...

سکھارام :مجھے تجھ سے کچھ بھی سننا نہیں ہے، نکل!

لکشمی :وہ... وہ... روزانہ اُس مسلمان کے پاس جاتی ہے۔

(لمحہ بھر کے لیے ایک خاموشی۔)

سکھارام :کیا؟ مسلمان کے پاس؟ کون مسلمان؟ کہاں کا مسلمان؟

لکشمی :داؤد... داؤد کے پاس۔

سکھارام :(آگے بڑھ کر لکشمی کو ایک تھپڑ مارتا ہے) منھ توڑ دوں گا۔

لکشمی :میں نے دیکھا ہے ان... ان... آنکھوں سے... بھگوان کی قسم کھانے کو تیار

ہوں۔

(سکھارام شیر کی طرح لکشمی پر جھپٹ پڑتا ہے، اسے بہت مارتا ہے۔ لکشمی بدحال ہو جاتی ہے۔ چمپا کی نیند میں نہ سمجھ میں آنے والی باتیں، غیر واضح۔)

چمپا : دور ہو جا... مردے... تو دور ہو جا... پونے آٹھ ہو گیا ہے تو... مجھے تکلیف ہوتی ہے... (کراہتی ہے۔)

سکھارام : (لکشمی کو دو ہاتھ جما کر) ہوں... (پھر اسے اٹھا کر بٹھاتا ہے۔) بول، اب پھر ایک بار وہی بات بول...

لکشمی : (اس حال میں بھی) سچ ہے، سچ سچ... یہ زبان کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ تمھارے ساتھ وہ دھوکا کر رہی ہے، ہاں... داؤد... داؤد کے ساتھ وہ... دوپہر میں، تم جب پریس میں ہوتے ہو تب... میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے، ان آنکھوں سے...

(سکھارام اسے غصے سے دھکیل کر تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ لکشمی کی درد بھری آوازیں، چمپا کی نیند اور نشے میں ڈوبی نہ سمجھ میں آنے والی باتیں۔ دور کتے کی بھونک۔ اندھیرا۔)

ساتواں منظر

(اندھیرا دھیرے دھیرے اجالے میں بدلتا ہے۔ لکشمی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے، آگے تصویر دھری ہے، کچھ درد بھری آوازیں نکال رہی ہے۔ سکھارام گھر میں داخل ہوتا ہے، دروازہ بند کرتا ہے، لکشمی کی طرف دیکھتا ہے، اسے ایک تھپڑ رسید کرتا ہے، وہ بلبلا اٹھتی ہے۔ سکھارام چمپا کے بستر کے پاس جا کر کھڑا ہوتا ہے، ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے بیٹھتا ہے، اور اچانک چمپا کا گلا دبانے لگتا ہے۔ چمپا کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ بے دردی کے ساتھ اس کا گلا دبائے جا رہا ہے۔ اس کے مردہ پڑے جسم کی جانب دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔)

سکھا : (سراسیمگی کے عالم میں) خون... خ... خ... خون...

(لکشمی جہاں بیٹھی ہے وہاں سے سکھارام کو حیرت بھری نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔)

خون... خون...

(لکشمی ایک جوش کے ساتھ چمپا اور سکھارام کی جانب آتی ہے۔ وہ سکھارام کی طرف اور چمپا کی لاش کی طرف دیکھے جارہی ہے۔)

سکھارام :(خوفزدہ) خون... میں نے خون کر دیا... میں نے خون کر دیا...

لکشمی :(اچانک) شش... چپ رہو... بالکل خاموش... (چمپا کی جانب دیکھتے ہوے) یوں بھی وہ پاپن ہی تھی، نرک میں جائے گی۔ تم نہیں جاؤ گے نرک میں۔ میرے پنیہ بہت ہیں، میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ تمھارا سب کروں گی... تم جو کہو گے وہ کروں گی۔ میں تمھاری گود میں دم توڑنے والی ہوں۔ ہاں... تم ڈرو مت... ہم اسے گاڑ دیں گے... مگر کہاں؟ باہر نہیں، یہیں... اس گھر میں... ہاں ہاں، کہہ دیں گے کہ وہ چلی گئی... کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں بولوں گی وہ خود چلی گئی... میں بھگوان کی گواہی دے کر بولوں گی... وہ سب کچھ جانتا ہے، وہ جانتا ہے میں اچھی ہوں، وہ میرے پیچھے کھڑا ہے، وہ تمھیں پاپ نہیں لگائے گا۔ میں اسے میرے پنیہ تمھیں دینے کے لیے کہوں گی۔ میں تمھارا سب کچھ کروں گی، ہاں...

(تیزی سے پاس پڑی بھگوان کی تصویر اٹھا کر اپنے ماتھے سے لگاتی ہے، پھر سکھارام کے ماتھے پر رکھتی ہے۔ بعد میں تصویر پر اپنی ناک رگڑتی ہے، آنکھ بند کر کے پرارتھنا کرتی ہے، پھر آنکھیں کھول کر۔)

چلو... چلو اب کام میں جٹ جاتے ہیں۔ جاؤ، تم باغ سے کدال لے آؤ، میں رسوئی میں جگہ خالی کرتی ہوں۔ دیر نہ کرو، اجالا ہوا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ رات میں ہر طرف بھگوان کا راج ہوتا ہے، دن میں انسان کا۔ اور انسان پاپی ہوتا ہے... انسان بری نظر والا اور نیچ ہوتا ہے، اس کی طرح... (چمپا کی لاش کی طرف اشارہ۔) اجالا ہونے تک ہم سب پورا کر ڈالیں گے۔ اس نے مجھے آشیرواد دیا ہے۔ (بھگوان کی تصویر کی جانب اشارہ۔) چلو اٹھو، اب دیر نہ کرو... ڈرو مت، میں پنیہ وان ہوں، وہ پاپی تھی، میں نے کسی کا برا نہیں کیا، کیڑے مکوڑوں کا بھی نہیں... (اپنے گلے میں بندھا منگل سوتر دکھاتی ہے۔) یہ دیکھو... دیکھو، آج تک تمھارے نام سے باندھے ہوے ہوں۔ پہلے والا

میں نے نہیں، باندھنے والے نے خود توڑا تھا... میں نے نہیں توڑا تھا۔ اِس نے تو (چمپا کی طرف اشارہ کر کے) بیاہے شوہر کو لاتوں سے مارا، تمھارے ساتھ دھوکا کیا... اس کا کبھی بھلا ہونے والا نہیں تھا... تم اچھے ہو، بھگوان تمھیں معاف کرے گا، میں کہوں گی اسے، وہ میری سنتا ہے... رکو، میں کدال لے آتی ہوں، تم بیٹھو...

(لنگڑاتی ہوئی باہر اندھیرے میں جاتی ہے اور طاقت جٹا کر کدال لا کر سکھارام کے ہاتھوں میں دیتی ہے۔)

لو، اسے پکڑو... چلو، رسوئی گھر میں چلو...

(سکھارام لکشمی کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھے جا رہا ہے۔ لکشمی وہاں رکھی ایک چادر اٹھا کر چمپا کی لاش پر تان دیتی ہے۔)

ہو گیا نا! اب کھلا نہیں لگے گی... اب تک تو اس کی آتما نرک میں پہنچ چکی ہوگی، بھگوان کے یہاں فیصلہ کرنے میں دیر کہاں ہوتی ہے؟ (چمپا کی لاش کو حقارت سے دیکھتے ہوئے) پاپن کہیں کی! (سکھارام سے) پہلے اٹھو، ابھی چلو... صبح ہونے تک سب کچھ جیسا تھا ویسا ہو جانا چاہیے، پھر کسی کو کوئی شک نہیں ہوگا۔ میں سب کو بولوں گی کہ وہ چلی گئی، ہاں...

(سکھارام کسی کٹھ پتلی کی مانند کھڑا رہتا ہے۔ لکشمی اسے رسوئی گھر میں لے جا کر کدال اس کے ہاتھ میں تھماتی ہے۔)

ہاں... لو اسے، اور کھودو... (سکھارام بے جان آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔) کھودو... کھودو نا..!

(سکھارام جوں کا توں کھڑا ہے۔ لکشمی کدال اٹھا کر اپنی طاقت یکجا کر کے خود گڑھا کھودنے لگتی ہے۔ کدال مارتے ہوئے لکشمی کے منھ سے "ہوں! ہوں!" کی آواز ابھرتی ہے۔ اچانک دروازے پر تھپتھپاہٹ ہوتی ہے۔ سکھارام خوفزدہ اور سہما ہوا ہے۔ لکشمی دروازے کی طرف نظر جمائے کھڑی ہو جاتی ہے۔)

چمپا کا شوہر: (دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے) چمپے... ارے او چمپا... تم کہاں ہو؟ مجھے مارو چمپا... چمپا، دروازہ کھولو نا... چمپا... چمپا... میں آ گیا ہوں... مجھے مارو... چمپا... اے

چمپا... مجھے مارونا...

لکشمی :(گھبرائے ہوئے سکھارام سے) وہی ہے، اس کا شوہر... دروازہ پیٹے گا اور تھوڑی دیر کے بعد تھک کر خود ہی چلا جائے گا... تم فکر مت کرو...

(دوبارہ طاقت یکجا کر کے کدال چلانے لگتی ہے۔ پھر وہی ''ہوں! ہوں!'' کی آوازیں ابھرتی ہیں۔ باہر کے دروازے پر بڑھتی دستک۔ چمپا کے شوہر کی مدھم پڑتی آوازیں۔)

چمپا کا شوہر: چمپا... اے چمپا... کہاں ہو تم؟ چمپا! کہاں ہو تم چمپا؟ دروازہ کھول دو... مجھے مارو... چمپا، دروازہ کھول دو...

(لکشمی کے پاس بے جان سا کھڑا سکھارام یوں دکھائی دے رہا ہے جیسے کسی نے اس کا رس چوس کر پھوک پھینک دیا ہو۔ باہر کے کمرے میں چمپا کی لاش پر چادر تنی ہوئی ہے۔ باہر دروازہ تھپتھپاتے ہوئے چمپا کے شوہر کی آوازیں جاری ہیں۔ رات کا اندھیرا۔ پردہ گرتا ہے۔)

❄❄

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے "آج" کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 63 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ "آج" کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، "سرائیوو سرائیوو" (بوسنیا)، نرمل ورما، اور "کراچی کی کہانی" کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

"آج" کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں
اور "آج کی کتابیں" اور "سٹی پریس" کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 500 روپے
بیرونِ ملک: 60 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں اب بھی دستیاب ہیں۔

اس کے علاوہ ماہنامہ "شب خون" الہٰ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور

(کہانیاں)

قیمت: 80 روپے

انیس

(سوانح)

قیمت: 375 روپے

منتخب مضامین

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 280 روپے

معرکۂ انیس و دبیر

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

ایرانی کہانیاں

(ترجمے)

قیمت: 90 روپے

مرثیہ خوانی کا فن

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

کافکا کے افسانے

(افسانے)

قیمت: 70 روپے

گنجفہ

(کہانیاں)

قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمٰن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

Scanned with CamScanner

٦٤

قیمت
۲۰۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰ .

Scanned with CamScanner